رنجیت سنگھ

مصنف

نریندر کرشن سنہا

مترجم

کیلاش چند چودھری

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
ویسٹ بلاک۔ا، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066

Ranjit Singh
By: Narendra Krishna Sinha

سنہ اشاعت :

پہلا اڈیشن : 1977

دوسرا اڈیشن : جولائی 2002 تعداد 1100

قیمت : =/26

سلسلہ مطبوعات : 1011

ناشر : ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، ویسٹ بلاک-1، آر-کے- پورم، نئی دہلی-110066

طابع : جے-ے آفسیٹ پرنٹرز، جامع مسجد، دہلی- 110006

پیش لفظ

انسان اور حیوان میں بنیادی فرق نطق اور شعور کا ہے۔ ان دو خداداد صلاحیتوں نے انسان کو نہ صرف اشرف المخلوقات کا درجہ دیا بلکہ اسے کائنات کے اُن اسرار و رموز سے بھی آشنا کیا جو اسے ذہنی اور روحانی ترقی کی معراج تک لے جاسکتے تھے۔ حیات و کائنات کے مخفی عوامل سے آگہی کا نام ہی علم ہے۔ علم کی دو اساسی شاخیں ہیں باطنی علوم اور ظاہری علوم۔ باطنی علوم کا تعلق انسان کی داخلی دنیا اور اس دنیا کی تہذیب و تطہیر سے رہا ہے۔ مقدس پیغمبروں کے علاوہ، خدارسیدہ بزرگوں، سچے صوفیوں اور سنتوں اور فکر رسا رکھنے والے شاعروں نے انسان کے باطن کو سنوارنے اور نکھارنے کے لیے جو کوششیں کی ہیں وہ سب اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ظاہری علوم کا تعلق انسان کی خارجی دنیا اور اس کی تشکیل و تعمیر سے ہے۔ تاریخ اور فلسفہ، سیاست اور اقتصاد، سماج اور سائنس وغیرہ علم کے ایسے ہی شعبے ہیں۔ علوم داخلی ہوں یا خارجی ان کے تحفظ و ترویج میں بنیادی کردار لفظ نے ادا کیا ہے۔ بولا ہوا لفظ ہو یا لکھا ہوا لفظ، ایک نسل سے دوسری نسل تک علم کی منتقلی کا سب سے موثر وسیلہ رہا ہے۔ لکھے ہوئے لفظ کی عمر بولے ہوئے لفظ سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لیے انسان نے تحریر کا فن ایجاد کیا اور جب آگے چل کر چھپائی کا فن ایجاد ہوا تو لفظ کی زندگی اور اس کے حلقۂ اثر میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔

کتابیں لفظوں کا ذخیرہ ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم و فنون کا سرچشمہ۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اردو میں اچھی کتابیں طبع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ اردو پورے ملک میں سمجھی جانے والی بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی زبان ہے بلکہ اس کے سمجھنے، بولنے اور پڑھنے والے اب

ساری دنیا میں پھیل گئے ہیں۔ کونسل کی کوشش ہے کہ عوام اور خواص میں یکساں مقبول اس ہر دلعزیز زبان میں اچھی نصابی اور غیر نصابی کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں بہتر سے بہتر انداز میں شائع کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کونسل نے مختلف النوع موضوعات پر طبع زاد کتابوں کے ساتھ ساتھ دوسری زبانوں کی معیاری کتابوں کے تراجم کی اشاعت پر بھی پوری توجہ صرف کی ہے۔

یہ امر ہمارے لیے موجب اطمینان ہے کہ ترقی اردو بیورو نے اور اپنی تشکیل کے بعد قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے مختلف علوم و فنون کی جو کتابیں شائع کیں ہیں، اردو قارئین نے ان کی بھرپور پذیرائی کی ہے۔ کونسل نے اب ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا پروگرام شروع کیا ہے، یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جو امید ہے کہ ایک اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔

اہلِ علم سے میں یہ گزارش بھی کروں گا کہ اگر کتاب میں انھیں کوئی بات نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ جو خامی رہ گئی ہو وہ اگلی اشاعت میں دور کردی جائے۔

ڈاکٹر محمد حمیداللہ بھٹ
ڈائرکٹر
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند، نئی دہلی

فہرست

دیباچہ

میں کافی عرصہ سے رنجیت سنگھ پر اپنی کتاب پوری طرح نظر ثانی کر کے اور دوبارہ شائع کرنے کے لیے موقع کی تلاش میں تھا، جوں جوں تحقیق کے بارے میں میرے خیالات پختہ ہوتے گئے، مجھے اپنی کتاب کی جلدی میں شائع کردہ پہلی اشاعت سے شرمندگی محسوس ہونے لگی مجھے توقع ہے کہ اس نئے ایڈیشن میں واقعات زیادہ معقولیت سے پیش کیے گئے ہیں، کیوں کہ اس مرتبہ مجھے حقائق جمع کرنے، ان کو ترتیب دینے اور کھرے کھوٹے میں تمیز کرنے کے لیے کافی وقت مل گیا۔ آپ کو تفصیلات میں کئی نئی باتیں ملیں گی۔ خاص کر شروع کے ابواب میں تاہم نتائج جو پہلے ایڈیشن میں اخذ کیے گئے تھے، لگ بھگ جوں کے توں رہے ہیں۔ مجھے اس بات کا ہرگز دعوا نہیں کہ میں نے کوئی معیاری کتاب پیش کی ہے۔ اس کے باوجود میں اُمید کرتا ہوں کہ ہماری موجودہ محدود معلومات کے پیش نظر یہ ایڈیشن دل چسپ ہونے کے ساتھ ساتھ مفید بھی ثابت ہوگا۔

میں جناب کے زکریا کی مہربانی اور امداد کے لیے، ڈاکٹر این، سی رائے کی بے لاگ اور مفید تنقید کے لیے جناب این، سی سنہا مشکور سفارت سے متعلقہ دستاویزوں کی فراہمی اور محنت کے لیے، جناب اے، سی بنرجی کے اس کتاب کے پروف پڑھنے میں تعاون کے لیے اور جناب ایم این داس کا کتاب کا انڈکس تیار کرنے کے لیے ممنونِ احسان ہوں۔

این ۔ کے ۔ سنہا

مہاراجہ رنجیت سنگھ

دہلی کے مصور جیون رام کی بنائی ہوئی تصویر کا عکس۔ جو 1831ء
میں گورنر جنرل کے ہمراہ مہاراجہ کی ملاقات کے لیے روپڑ گیا تھا

تمہید

رنجیت سنگھ 1780ء میں پیدا ہوئے، شری گرو گوبند سنگھ 1708ء میں وفات پا چکے تھے۔ ان 72 برسوں کی درمیانی تاریخ سے ہمیں اس نامور سکھ حکمران کی کئی خوبیاں اور اس کی قائم کردہ سکھ سلطنت کا علم، جو دیرپا ثابت نہ ہوئی، حاصل ہوتا ہے۔ شری گرو گوبند سنگھ پہلے شخص تھے جنہوں نے سکھوں کو ایک فوجی قوم بنا دیا۔ انہیں اس کا بخوبی احساس تھا کہ سکھوں کے دل میں دو زبردست جذبے کارفرما تھے: ایک باہمی بھائی چارے کا جذبہ، جو سب پر غالب تھا، اور دوسرا اپنے گرو کے لیے بے پناہ عقیدت کا جذبہ۔ اس کے باوجود انہوں نے شخصی گرو بنانے کا سلسلہ ختم کر دیا اور اعلان کیا کہ خالصہ پنتھ کو آیندہ گرو کا درجہ حاصل ہوگا۔ اس طرح سکھ معاشرے میں خالصہ یا پنتھ سب سے اہم اور موثر ادارہ بن گیا۔ بہت حد تک دلّی کی روبہ تنزل حکومت کے سخت گیر رویے نے سکھوں کو ایک قوم کی شکل میں منظم کر دیا۔ ایک طرف سے تشدّد اور اس کے جواب میں انتقامی کارروائی کا جو دور شروع ہوا تھا وہ بندہ بہادر کے زمانۂ اقتدار (1708ء - 1716ء) کے دوران، بلکہ اس کے بعد تک بھی جاری رہا۔ دلّی حکومت کے روزافزوں نمایاں انحطاط نے سکھ سورماؤں کو اس حد تک جرأت دلائی کہ وہ چھوٹے چھوٹے جتھوں میں منظّم ہونے لگے۔ اسی اثنا میں لڑکھڑاتی ہوئی مغل حکومت پر یکے بعد دیگرے دو زبردست وار نادر شاہ کی تاخت اور احمد شاہ ابدالی کے متواتر حملوں کی صورت میں ہوئے۔ احمد شاہ ابدالی نے مغل حکمرانوں کو مجبور کر دیا کہ وہ پنجاب اور سندھ کے علاقے اس کے حوالے کر دیں۔ اس نے کشمیر پر بھی قبضہ کر لیا۔ اس طرح سکھ بھی احمد شاہ ابدالی کی عملداری میں آ گئے۔ لیکن وہ اعلیٰ پائے کا افغان جرنل فتح تو کرنا جانتا تھا مگر نئی سلطنت قائم کرنے کا اہل نہیں تھا۔ وہ افغانستان کے معاملہ میں اس حد تک الجھا رہا کہ فتح اور استحکام کی کسی مسلسل حکمتِ عملی کو نافذ نہ کر سکا۔ اس طرح سکھ مسلوں یعنی فوجی جتھوں کو جو پہلے ہی سے وجود میں آ چکے تھے

اپنی طاقت بڑھانے کا موقع مل گیا۔ احمد شاہ نے کئی حملے کیے۔ اس نے سکھوں کو شکست ضرور دی لیکن انہیں کچل نہ سکا۔ آخر کار 1767ء کے بعد اس نے سکھوں کو اپنے حال پر چھوڑ دیا۔

ان حالات میں سکھوں نے آزادی حاصل کی اور ان کی بارہ مسلیں[1] قایم ہوئیں انہوں نے پنجاب کے ایک بڑے حصّے کو آپس میں تقسیم کرلیا۔ اس طرح ایک ایسا نظام قایم ہوگیا جسے ہم ایک مذہبی جاگیردارانہ وفاق کا نام دے سکتے ہیں۔ لیکن جب کبھی مشترکہ دشمن کا خطرہ ٹل جاتا تو پھر ان کے درمیان باہمی جھگڑوں، نااتفاقی اور لوٹ مار کا دور شروع ہو جاتا۔ یہ حالات تھے جب اس جاگیردارانہ نظام کے کھنڈروں پر قسمت کے دھنی رنجیت سنگھ نے ایک فوجی حکومت قایم کی۔ ایسے ماحول کا تقاضا تھا کہ اس کے کام کی عملی شکل کیا ہوگی :

"ملک ہمیشہ حملے کی زد میں تھا اور قوم جو طوفانوں میں پروان چڑھی تھی"

---

[1] مسلیں اور ان کی خصوصیات : (1) بھنگی مسل۔ لاہور اور امرتسر پر ان کا قبضہ تھا۔ انہوں نے ملتان بھی فتح کیا لیکن بعد کو احمد شاہ ابدالی کے بیٹے اور جانشین تیمور شاہ نے ملتان ان سے چھین لیا۔ گجرات پر بھی ایک بھنگی سرکار کا قبضہ تھا۔ بھنگی مسل کے مقبوضات لاہور اور امرتسر کے شمال کی طرف دریائے جہلم اور اس کے زیریں کے علاقے تک پھیلے ہوئے تھے۔
(2) کنہیا مسل : ان کے مقبوضات امرتسر سے آگے شمال کی طرف پہاڑی علاقوں تک چلے گئے تھے۔ (3) شکر چکیہ مسل : یہ مسل رنجیت سنگھ کے دادا چڑھت سنگھ اور اس کے والد مہاسنگھ کے زمانے میں برسر اقتدار آئی۔ اس مسل کا آبائی علاقہ بھنگی مسل کے علاقے کے متصل رچنا دوآب میں تھا۔ گوجرانوالہ اس کے اہم ترین شہروں میں سے تھا۔ (4) نکئی مسل : اس کا علاقہ لاہور کے جنوب مغرب میں تھا۔ اور جنوب کی طرف چلا گیا تھا۔ (5) فیضل پوریہ مسل : ان کے سرخیل کپور سنگھ نے اپنا تسلط جالندھر دوآب میں قائم کیا اس کے مقبوضات میں جالندھر دوآب اور موجیہ دیہات کشرہ کپور سنگھ، فتح پور اور پٹی شامل تھے۔
(6) آہلو والیہ مسل : اس کی راجدھانی کپور تھلہ تھی۔ یہ جالندھر دوآب کی سب سے بڑی مسل تھی۔ (7) ڈلے والا مسل : یہ جالندھر دوآب کے انتہائی جنوب مشرق میں ستلج اور بیاس

1792ء میں اپنے باپ کی اچانک وفات پر رنجیت سنگھ پنجاب کی سکھ مسلوں میں سے ایک کا سردار بن گیا۔ اس کے ہمعصر یہ امید رکھتے تھے کہ ایسی جنگ و جدل میں تجربہ حاصل کرنے کے بعد جوان مسلوں کا آئے دن کا وطیرہ تھا، رنجیت سنگھ اپنی اہمیت منوائے گا۔ قسمت نے بھی اس کا ساتھ دیا اور بعض بڑے بڑے سردار جو اس کے راستے میں رکاوٹ بن سکتے تھے، اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ لڑائی میں 1783ء میں جسا سنگھ آہلوالیہ سکھ سردار درانیوں کے خلاف کام آ گیا۔ اس کا سب کو رنج ہوا۔ بھنگی مسل کے سردار بھی جنھوں نے جموں سے ملتان تک فتح کا جھنڈا لہرایا تھا یکے بعد دیگر مر کھپ گئے۔ اور اس مسل کی وہ طاقت نہ رہی جو اسے 1760ء یا 1770ء میں حاصل تھی۔ جسا سنگھ رام گڑھیا جو پنجاب میں ستلج کے دونوں طرف کے علاقے میں نیز گنگا جمنا دوآب میں اپنے بہادرانہ دھاووں کے لیے مشہور تھا اب اتنا بوڑھا ہو گیا تھا کہ وہ اس نوجوان سردار کی ابتدائی ترقی کے راستے میں حائل ہونے کے قابل نہیں تھا۔ کنہیا مسل کا سردار جے سنگھ جس نے کبھی درانیوں کے خلاف بہادری اور جرأت کے جوہر دکھائے تھے اور جو کبھی عرصہ تک سکھ سرداروں میں سب سے طاقتور مانا جاتا تھا اب بہت نحیف ہو گیا تھا۔ اس نے اس نوجوان شکرچکیہ سردار سے اپنی پوتی منسوب کر کے اپنی قسمت اس سے وابستہ کر دی تھی۔ یہ بوڑھا کنہیا سردار بھی 1793ء میں چل بسا۔ اس طرح پنجاب کے سکھ سرداروں کے درمیان حصول اقتدار کی دوڑ میں رنجیت سنگھ کی خوش قسمتی سے اس کے راستے میں پچھلی پشت کے ان دلاوروں

کے دریاؤں کے سنگم کے قریب تھی۔ (8) رام گڑھیا مسل: اس کے مقبوضات دریائے بیاس کے دونوں طرف تھے۔ اس جاگیر کا صدر مقام سری ہرگوبند پور میں تھا۔ (9) نشان والا مسل: ان کی راجدھانی انبالہ میں تھی۔ (10) کروڑ سنگھی مسل: اس کا صدر مقام کرنال سے بیس میل کے فاصلہ پر چلونڈھی میں تھا۔ ان کے مقبوضات دریائے ستلج کے کنارے کنارے اور جالندھر دوآب تک پھیلے ہوئے تھے۔

(11) سہید و نہنگ مسل: یہ ستلج کے پار جنوبی علاقہ پر قابض تھی۔

(12) پھلکیاں مسل: یہ بھی ستلج کے جنوب کی طرف آباد تھے۔ پٹیالہ، نابھہ اور جیند ان کی اہم ریاستیں تھیں

کی ٹکر کا کوئی ایسا شخص نہ رہا جنھوں نے احمد شاہ ابدالی کو پنجاب سے مار بھگایا تھا اور پھر مسلوں کی داغ بیل ڈالی تھی۔

اگرچہ پنجاب کے میدان اس غیر معمولی قابلیت اور جرأت رکھنے والے انسان کے لیے سہل اور بتدریج ذرایع پیش کرتے تھے جن کی بنا پر سارا پنجاب اس کی تحویل میں آسکتا تھا۔ لیکن اس کے برعکس کوہستان یا پنجاب کے پہاڑی علاقوں کی جداگانہ حیثیت تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس علاقہ کے چھوٹے چھوٹے سردار بہت کمزور تھے اور آپس میں بٹے ہوئے تھے۔ کٹوچ سردار سنسار چند ان میں سے چند کو اپنے قبضہ میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی یہ کوشش پورے طور پر کامیاب نہ بھی ہوتی تو بھی رنجیت سنگھ کا کام آسان ہو جاتا۔ لیکن گورکھا فوج کی پیش قدمی نے اسے پیچیدہ بنا دیا۔

اپنے ملک میں امن اور اتحاد قایم کر کے نیپال کا گورکھا حکمران پرتھی نارائن ۱۷۶۹ء میں مر گیا۔ گورکھوں نے کماؤں فتح کر لیا تھا۔ سکم پر بھی دھاوا بول دیا تھا اور تبت کو بھی آنکھیں دکھائی تھیں۔ ۱۷۹۲ء میں چین سے مڈبھیڑ ہوئی لیکن پسپا ہوئے۔ اس طرح مشرق میں رکاوٹ پا کر انہوں نے مغرب کی طرف بڑھنا شروع کیا اور ۱۷۹۴ء میں گڑھوال اور کماؤں کو ملحق کر لیا۔ گورکھا حکومت سکم سے کشمیر کی سرحد تک پھیلی ہوئی تھی۔ کماؤں اور شملہ کی پہاڑی ریاستیں ان کی عمل داری میں تھیں۔ انیسویں صدی کے شروع میں بھیم سین تھاپا نیپال کا وزیر اعظم بنا۔ وہ تیئس سال تک اس عہدہ پر فائز رہا۔ اپنے باپ امر سنگھ تھاپا کی اعانت سے اس نے گورکھا اقتدار کو مغرب کی طرف اور بھی آگے بڑھانے کی کوشش کی۔ اس طرح گورکھوں اور سکھوں کی بڑھتی ہوئی طاقتوں میں ٹکر ہوئی۔

شمال مغربی ہندوستان کے اس اہم علاقہ میں انگریز، سکھ اور گورکھے یہ تینوں قومیں اپنی حکومت قایم کرنے کی کوشش میں تھیں۔ وہ ہمالیہ کی تلہٹی اور میدانی علاقہ میں طوفان کی سی تیزی کے ساتھ بڑھتے چلے آرہے تھے۔ اس طرح ان کے ہراول دستوں کا آپس میں ٹکرانا لازمی تھا۔ اس ٹکر میں ستلج اور جمنا کے درمیانی علاقوں میں رہنے والے سکھوں کے الجھ جانے کے امکان سے رنجیت سنگھ کی مشکلات میں اضافہ

ہوگیا۔ پٹیالہ کی سکھ حکومت جس کی عملداری ستلج کے اس پار علاقہ پر تھی۔ روایتاً سکھوں کی اس کامن ویلتھ (دولت مشترکہ) کے موافق نہ تھی۔ رنجیت سنگھ کو اپنے ہمعصر پٹیالہ کے حکمران صاحب سنگھ سے کسی سخت مقابلہ کا اندیشہ نہ تھا لیکن مشرق کی طرف توسیع کی اس پالیسی کے پیش نظر بڑھتی ہوئی انگریزی طاقت کا لحاظ لازمی تھا۔ جب رنجیت سنگھ کے عروج کا آغاز ہوا دولت راؤ سندھیا اور اس کا فرانسیسی نائب پیرن دہلی کے علاقہ پر چھائے ہوئے تھے۔ جس وقت سکھ سردار رنجیت سنگھ نے ستلج کے اس پار کے سکھ علاقوں میں دلچسپی لینا شروع کی اس وقت دولت راؤ سندھیا شکست کھا چکا تھا اور پیرن نے دہلی میں جو فرانسیسی اقتدار قایم کیا تھا وہ مٹ چکا تھا۔ دہلی میں اب انگریز برسر اقتدار تھے اور وہ ستلج کے اس پار کی سرحدی ریاستوں کو غیر جانبدار (بفر سٹیٹ) رکھنا چاہتے تھے۔ اکثر انگریز گورنر جنرل توسیع سلطنت کے حامی تھے۔ اگرچہ انگلستان میں کورٹ آف ڈائریکٹرز اور کنٹرول بورڈ کے ممبران بظاہر امن و آشتی کی پالیسی کے حق میں تھے۔ لیکن منٹو اپنے جانشین مائرہ (Moira) آک لینڈ اور ریلین براکے برعکس توسیع سلطنت کا حامی نہ تھا۔ برٹش گورنروں میں وہ پہلا شخص تھا جس کے ساتھ رنجیت سنگھ کی جھڑپ ہوئی۔ جب ہم اس سیاسی کشمکش کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں اس وسیع اصول کی صداقت کا احساس ہوتا ہے کہ ایک حکومت اس وقت تک علاقہ پر علاقہ فتح کرتی چلی آتی ہے جب تک اس کا سامنا اپنے سے زیادہ طاقتور یا ہم پلّہ فریق سے نہیں ہوتا۔

اگرچہ نو اقتدار پذیر انگریز حکومت مشرق میں کسی حد تک اس کے لیے سدّراہ تھی تاہم مغرب میں دُرّانی حکومت کے زوال سے اس کی ترقی کی راہ کھل گئی۔ مورخ ابن خلدون (1332ء سے 1406ء) کا اندازہ ہے کہ کسی بڑی سلطنت کے قیام کی مدّت اوسطاً تین نسلوں سے زیادہ نہیں ہوئی۔ دُرّانی سلطنت نے اس عام اصول کی صداقت کو ثابت کر دیا۔ ان کی سلطنت اب بھی مغرب میں ہرات سے لے کر مشرق میں کشمیر تک اور شمال میں بلخ سے لے کر جنوب میں شکارپور تک پھیلی ہوئی تھی۔ دُرّانی حکومت کو یہ فخر حاصل تھا کہ ماضی میں اس نے ہندوستانیوں کو کئی بار ہرایا تھا اور اس سلطنت میں ایسی دلیر اور جنگجو قومیں آباد تھیں جو کسی بھی حکومت

کی ریڑھ کی ہڈی کا کام دے سکتی تھیں۔ احمد شاہ ابدالی کے زیر تحت بعض دُرّانیوں نے
لوٹ مار کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ اور دہلی ہی تک نہیں اس سے آگے تک بڑھ گئے تھے لیکن
اس کے بیٹے تیمور کے ماتحت ان کی سرگرمیاں کشمیر، پشاور اور ملتان تک محدود ہو کر رہ
گئیں۔ تیمور شاہ کے بیٹوں کے زمانے میں وہی دُرّانی خانہ جنگی کے شکار ہو گئے۔ رنجیت
سنگھ دُرّانیوں کی اس کمزوری کا پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ لیکن اس امر کا بھی
امکان تھا کہ افغانوں کو شاید کوئی نیا رہبر مل جائے۔ افغانوں کے بارے میں یہ قول،
"کہ وہ ایک ایسی جنگ جُو قوم تھی جس نے کئی بار ہندوستان پر حملہ کیا تھا اور جو بیس
ہزار سواروں کی جمعیت میدان میں جھونک سکتی تھی" یہ غالباً افغان شہنشاہیت کے
مقابلے میں رنجیت سنگھ کی حیثیت کا لُب لباب ہے۔

پہلا باب

ابتدائی زمانہ (1780ء سے 1797ء تک)

رنجیت سنگھ 13 نومبر 1780ء کو پیدا ہوئے[1] وہ شکر چکیہ مسل کے سردار مہاسنگھ کے اکلوتے بیٹے تھے۔ ان کی والدہ راج کور جیند کے سردار گجپت سنگھ کی بیٹی تھیں۔ 1785ء میں رنجیت سنگھ کی سگائی سردار گور بخش سنگھ کی بیٹی مہتاب کور سے ہوئی اور 1796ء میں ان کی شادی ہوگئی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے خسر سردار گوربخش سنگھ کنہیا مسل کے سردار جے سنگھ کے بیٹے تھے۔ رنجیت سنگھ کے والد سردار مہاسنگھ، 1790ء میں وفات پاگئے۔ ان کی والدہ راج کور ان کی سرپرست مقرر ہوئیں۔ دیوان لکھپت رائے مسل کے معاملات سلجھانے کے لیے ان کے معاون اور مشیر بنے۔ بی بی سدا کور جن کی بیٹی کی سگائی رنجیت سنگھ سے ہوئی تھی ریاست کے معاملات میں ان کا بھی کافی دخل تھا۔ سردار جے سنگھ کی وفات پر کنہیا مسل کے انتظامات کی باگ ڈور بھی ان کی بہو سردارنی سدا کور کے ہاتھ میں آگئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے خاوند سردار گوربخش کا انتقال اپنے والد سردار جے سنگھ کی زندگی میں ہوگیا تھا۔

رنجیت سنگھ اپنی والدہ راج کور اور ان کے مشیر کار لکھپت رائے کی سرپرستی میں ان پڑھ پروان چڑھے۔ اس زمانے میں بہت کم امرا اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت میں دلچسپی لیتے تھے۔ جنگ جو سپاہیوں کے لیے لکھنا پڑھنا مناسب مشغلہ نہیں سمجھا جاتا تھا اس لیے ان کی تعلیم سے محرومی ان کے سرپرستوں کی سازش یا کسی سوچے سمجھے پلان کا نتیجہ نہ تھی۔ فطری طور پر وہ سرکش رہے ہوں گے اور دباؤ ڈال کر ان کو لکھنے پڑھنے کی طرف مائل کرنا مشکل ہوگیا ہوگا۔ انہوں نے ایک بار خود کیپٹن ویڈ (Wade) برٹش ایجنٹ مقیم لدھیانہ کو بتایا تھا کہ ان کے والد بیس ہزار کارتوس چھوڑ کر مرے تھے جو انہوں نے نشانہ بازی میں صرف کر دیے[2] ان کی ابتدائی زندگی لاڈ پیار اور عیش و عشرت میں

گھوڑی۔ یہ وثوق سے نہیں کہا جاسکتا (جیسا کہ بعض یورپین مورخین کا دعویٰ ہے) کہ دیدہ ودانستہ ان کی تربیت اس ڈھنگ سے کی گئی کہ وہ لکھنا پڑھنا نہ سیکھ سکیں۔ ہوسکتا ہے اس زمانے کی اخلاقی گراوٹ اس کا باعث ہو۔ سنِ بلوغ تک پہنچنے سے قبل ہی رنجیت سنگھ نے نکئی مسل کی ایک راج کماری راج کنور سے شادی کرلی تھی۔ وہی ان کی پٹ رانی تھی اور مہارانی مہتاب کور کا رتبہ یقیناً نکئی راج کماری سے کمتر تھا۔

اس طرح سترہ برس کی عمر میں رنجیت سنگھ نے حکومت کے سارے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ وہ شعور کی اس منزل تک پہنچ گئے تھے جہاں وہ اپنی عقلِ سلیم سے حکومت کا سارا کاروبار خوش اسلوبی سے سرانجام دے سکتے تھے۔ ان کی حکومت کی راہ میں جو بھی آیا اسے ہر جائز وناجائز طریقہ سے کچل دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اپنے مخالفوں کو اپنے راستے سے ہٹانے کے لیے کئی سنگدلانہ خفیہ طریقے اختیار کیے۔ اگر ان کو سچ مان لیا جائے تو وہ مہاراجہ کی شان اور اخلاق پر بدنما داغ ہیں۔ مہاراجہ نے دیوان کو کسی خفیہ کام کے سرانجام دینے کے لیے کوٹاس اور روہتاس بھیجا جہاں زمینداروں نے انہیں قتل کردیا۔ اس کے بعد ان کی ماں بھی ان کے ظلم کا شکار ہوئی اور بن آئی موت مری۔ (3) کپتان مرے (Murray) کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے دیوان کو برخواست کردیا اور اپنی ماں کو مروا ڈالا۔ اس موضوع پر سوہن لال اور رام ناتھ جیسے مورخین نے کوئی روشنی نہیں ڈالی، البتہ بہت سے یورپین سیاحوں نے یہی کہانی بیان کی ہے۔ میجر کارمائی کل سمتھ (Major Carmichael Smyth) جنھیں دعویٰ ہے کہ انہوں نے راز کی باتیں بھی لکھ دی ہیں یا یوں کہیے کہ افواہوں پر مبنی شرمناک واقعات بھی بیان کردیے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ رنجیت سنگھ نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنی ماں کو موت کے گھاٹ اتارا لیکن ایک اور مصنف پرنسپ (Princep) کا کہنا ہے کہ وہ سردار دل سنگھ کی تدبیر سے قید کرلی گئیں۔ میجر کارمائی کل سمتھ نے اپنی یادداشت میں یہ بھی لکھا ہے کہ اس نے کھلے بازار میں بکتی ہوئی ایسی تصویریں اپنی آنکھوں سے دیکھیں جن میں رنجیت سنگھ کو اپنی ماں کو قتل کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اس کہانی پر یقین کرنا مشکل ہے، یہ محض افواہوں پر مبنی معلوم ہوتی ہے اس کے برعکس رنجیت سنگھ کے حق میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے زندگی بھر بلاوجہ کسی پر ظلم نہیں ڈھایا اور پورے

یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ظالم یا سنگدل نہیں تھے۔ ایک اور یورپین مورخ ہیگل (Hugel) رقم طراز ہے کہ انہوں نے کبھی اپنے ہاتھ کسی کے خون سے نہیں رنگے۔ (۱۸) برنز (Burnes) لکھتا ہے کہ وہ ایک ایسے مطلق العنان حکمران تھے جن کی فطرت ہی میں ظلم کرنا نہیں تھا۔ اسی مورخ کا بیان ہے کہ "رنجیت سنگھ کی سیرت کی سب سے بڑی خوبی ان کی رحم دلی اور خداترسی تھی۔ انہوں نے حکومت حاصل کرنے کے بعد کسی کو سزائے موت نہیں دی۔ اس لیے یہ بات تصور میں بھی نہیں آسکتی کہ انہوں نے اپنی ماں کو اپنے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتارا ہوگا۔ بعض یورپین مورخین اس الزام کی تشریح اس طرح کرتے ہیں کہ رنجیت سنگھ نے اپنی عیش پرست ماں سے اس بے اعتنائی اور بے پرواہی کا بدلہ لیا جو اس نے رنجیت سنگھ کے ساتھ روا رکھی تھی۔ لیکن تاریخ یا وہ دستاویزات جو ہمارے پیش نظر ہیں اس کی تصدیق نہیں کرتیں۔ افواہوں اور الزام تراشیوں کو تاریخی واقعات کے ساتھ خلط ملط نہیں کرنا چاہیے۔ یہ الزام رنجیت سنگھ جیسے بلند کردار حکمران پر عائد نہیں ہوتے۔ اس بات کا بھی کوئی واقعی ثبوت نہیں کہ دیوان لکھپت رائے کی موت یا قتل میں ان کا کوئی ہاتھ تھا۔ کوئی نوجوان سردار جب عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لیتا ہے تو وہ سرپرست کو اپنی راہ میں روڑا سمجھتا ہے۔ اس لیے اتفاقاً جب ایسے سرپرست کی موت ٹھیک ایسے ہی موقع پر ہو جاتی ہے تو نوجوان حکمران پر ہی شک کیا جاتا ہے۔ لیکن ایسا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ملتا جس کی بنا پر دیوان کی موت کے لیے رنجیت سنگھ کو ذمہ دار ٹھہرایا جا سکے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ بغیر روک ٹوک کے حکومت کرنے کا موقع حاصل کرنے کے لیے انہوں نے دیوان کو کسی بہانہ سے دور بھیج دیا ہو۔ دیوان لکھپت رائے کی موت بھی شاید شہنشاہ اکبر کے سرپرست بیرم خان کی طرح محض اتفاقیہ تھی۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی اپنی ابتدائی زندگی اور اس ماحول سے جس میں ان کی پرورش ہوئی تھی بہت سی باتوں کا پتہ چلتا ہے۔ اس نوجوان اثر پذیر لڑکے کے دل پر ان مردوں اور عورتوں کا اثر پڑا جو پست کردار تھے۔ اور جن سے رنجیت سنگھ مذہبی یا اخلاقی طور پر بلند خیالات حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی پرورش بچپن میں اتنے لاڈ پیار سے ہوئی کہ وہ بگڑ گیا۔ رنجیت سنگھ کی ابتدائی زندگی شیواجی کے بالکل برعکس

تھی۔شواجی اپنے باپ کی بے اعتنائی کے باوجود بھی اپنے سچّے اور قابل گرو داداجی کونڈیو اور اپنی گہری مذہبی زاہدانہ زندگی گذارنے والی، ماں جیجا بائی کی نگرانی میں پروان چڑھے۔

ابتدائی فتوحات

(1797ء سے 1805ء تک)

سترہ سال کی عمر میں رنجیت سنگھ نے چھوٹی چھوٹی لڑائیاں لڑنا شروع کیں۔ان کے دادا سردار چڑھت سنگھ نے جو شکر چکیہ مسل کے سردار تھے گوجرانوالہ کو اپنا ہیڈ کوارٹر بنالیا۔اور وہاں سے وزیرآباد، سیالکوٹ، روہتاس اور پنڈ دادن خان وغیرہ پنجاب کے علاقوں پر حکومت کرنا شروع کیا۔جس بہادری کے ساتھ انہوں نے لاہور کے درّانی گورنر خواجہ عابد خان کے حملہ سے گوجرانوالہ کی حفاظت کی اس سے سکھ قوم کے حوصلے بڑھ گئے۔انہوں نے احمد شاہ ابدالی کا بھی ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ احمد شاہ کے مرنے کے بعد رنجیت سنگھ کے والد سردار مہا سنگھ نے اپنی شکر چکیہ مسل کا اقتدار جنوبی علاقوں کی طرف بڑھانا شروع کیا۔ اکال گڑھ سر کرلیا اور جموں کے علاقہ سے خراج وصول کرنا شروع کیا لیکن 1790ء میں سردار مہا سنگھ کی اچانک موت ہوگئی۔

نوجوان سردار رنجیت سنگھ سکھ راج قایم کرنے کا خواب دیکھ رہا تھا۔اپنی حکومت کے ابتدائی دور میں اسے ایک اور نوجوان شہزادے کا مقابلہ کرنا پڑا جس کے دل میں اس کی طرح ایک پٹھان سلطنت قایم کرنے کی امنگیں اٹھ رہی تھیں۔ کابل کا یہ شہزادہ اپنے بزرگ احمد شاہ ابدالی کی مانند ہندوستان کو تسخیر کرنے کے منصوبے باندھ رہا تھا۔ رنجیت سنگھ کو شروع شروع میں اس سے واسطہ پڑا۔احمد شاہ جیسے جنگجو کی ناکامی کی مثال کو سامنے رکھتے ہوئے زمان شاہ کو اپنے ارادہ کو عملی جامہ پہنانے سے پہلے تحمل سے کام لینا چاہیے تھا۔اس نے 1793ء میں تخت نشین ہوتے ہی پنجاب پر چڑھائی شروع کردی۔ 1795ء میں وہ حسن ابدال سے آگے نہ بڑھ سکا۔ 97-1796ء کے اپنے تیسرے زبردست حملہ میں 3 جنوری 1797ء کو اس نے لاہور پر قبضہ کرلیا۔اس کی اس کامیابی نے دوسرے کئی حکمرانوں کی طرح نابینا شاہ عالم ثانی کے دل میں امنگیں

پیدا کر دیں۔ اسے یہ خیال پیدا ہوا کہ "مقدر میں یہ لکھا ہے کہ کامیابی اور مسرت لانے والا یہ درخشندہ مگر خوفناک ستارہ میری امداد سے بہت سی فتوحات حاصل کرے گا(۱۳) لیکن اس کی یہ امیدیں خاک میں مل گئیں۔ لاہور جاتے وقت راستہ میں اس نے گجرات اور رام نگر میں تھانے قایم کیے۔ لیکن سکھ سرداروں نے وہاں سے شاہ کے سپاہیوں کو مار بھگایا۔ اسی دوران شاہ زمان کی حکومت کی بنیاد کابل میں اتنی کمزور ہوگئی کہ وہ ہندوستان کے فاتح کا رول ادا نہیں کر سکتا تھا۔ احمد خان شاہانچی کو یہاں چھوڑ کر اسے کابل لوٹنا پڑا۔ احمد خان شاہانچی کو سکھوں نے رام نگر میں شکست دے کر مار ڈالا۔ زمان شاہ اور اس کے نائبوں کے خلاف سکھ سرداروں کی لڑائیوں میں شکر چکیہ مسل کے اس نوجوان سردار رنجیت سنگھ کا کوئی ذکر نہیں آتا حالانکہ یہ ساری لڑائیاں اس کے علاقہ کے نزدیک ہی لڑی گئی تھیں۔

ان واقعات سے پردہ تب اٹھا جب شاہ زمان نے 1798ء میں چوتھی بار حملہ کیا۔ دسمبر 1798ء میں برٹش نامہ نگار مقیم دلی نے کلکتہ میں یہ اطلاع بھیجی کہ گوجرانوالہ کے سردار رنجیت سنگھ نے دس بارہ ہزار سوار جمع کر لیے ہیں، وہ اور دیگر بہت سے سردار حملہ آور شاہ زمان کے گرد گھیرا ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں اور زمان شاہ کے کیمپ میں غلہ تین روپے سیر بک رہا ہے "(۱۴) مورخ موہن لال رقمطراز ہے کہ "رنجیت سنگھ اتنا دلیر تھا کہ قلعہ لاہور کے سُمن برج پر چڑھ کر اس نے دشمن کی فوج پر گولے برسائے۔ اس طرح بہت سے افغان سپاہی مارے گئے۔ سردار چڑھت سنگھ کے جواں سال بہادر پوتے سے یہی امید کی جا سکتی تھی۔ 1827ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے کیپٹن ویڈ (Wade ۱۵) کو بتایا کہ لاہور پر شاہ زمان کے آخری حملہ کے دوران ہر رات کچھ سواروں کو اپنے ساتھ لے کر میں شاہ کو پریشان کرنے کے لیے اس کی فوج پر حملے کیا کرتا تھا(۱۶) بہر حال رنجیت سنگھ اس وقت پنجاب کی ایک ایسی طاقتور اور اہم شخصیت بن چکے تھے کہ شاہ زمان نے ان سے صلح کرنا ضروری سمجھا۔ کابل کے وزیر وفادار خان نے اپنے دیوان آتما رام کی معرفت سکھ سرداروں کو خلعت پیش کرنے کی کوشش کی۔ ان سرداروں میں سے ایک رنجیت سنگھ بھی تھے جن کو راضی کرنے میں وہ کامیاب ہوگیا۔

پیشتر اس کے کہ زمان شاہ اپنے کام کی تکمیل کر پاتا اسے فوراً کابل واپس جانا پڑا

کیونکہ وہاں اس کے ایک غیر ذمہ دار سوتیلے بھائی نے بغاوت کردی تھی۔ دریائے جہلم میں اچانک طغیانی آجانے کے باعث کابل کی طرف واپس کوچ کرتے ہوئے اس کی بہت سی توپیں جہلم میں دھنس گئی تھیں۔ بعد میں رنجیت سنگھ نے پندرہ توپیں دریا سے برآمد کرکے زمان شاہ کے وکیل کے سپرد کیں۔ اس کے لیے بھی شاہ زمان نے رنجیت سنگھ کے پاس ایک بیش قیمت خلعت بھیجا۔ شاہ نے ہندوستان فتح کرنے کا ارادہ ترک نہیں کیا تھا، اس لیے وہ رنجیت سنگھ سے صلح کرنے کا متمنی تھا۔ دولت راؤ سندھیا کے پاس مقیم انگریز ریزیڈنٹ نے مندرجہ ذیل الفاظ میں پنجاب میں رنجیت سنگھ کی حالت کو بخوبی واضح کیا ہے۔

"زماں شاہ والیٔ کابل رنجیت سنگھ کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کر رہا ہے حالانکہ رنجیت سنگھ نے لاہور پر ناجائز قبضہ کر رکھا ہے اس کے علاوہ اس نے رنجیت سنگھ کو ایک خلعت فاخرہ بھی عطا کیا ہے۔ اگر زمان شاہ رنجیت سنگھ کو اپنے ساتھ ملانے اور ہم خیال بنانے میں کامیاب ہوگیا تو ہو سکتا ہے کہ اس بار شاہ کا ہندوستان پر حملہ پچھلی دفعہ کی طرح ناکام نہ ہو۔ کیوں کہ سکھ سردار رنجیت سنگھ کی دھاک سارے پنجاب میں بیٹھی ہوئی ہے اور اسے کافی رسوخ حاصل ہے وہ بھی اپنی طاقت میں اضافہ کرنے کا خواہاں ہے اور زمان شاہ کے ساتھ دوستانہ تعلقات بڑھا کر اپنا مقصد حاصل کرنے کی امید رکھتا ہے (۹)۔ دونوں میں سے ہر ایک اپنی مطلب برآری کے لیے دوسرے کو استعمال کرنا چاہتا تھا۔ ایک کی جانب سے انکسار اور دوسرے کی طرف سے دوستانہ برتاؤ فقط ایک سیاسی چال تھی ایسا کرکے ہر دو حکمران اپنے اصلی مقاصد پر پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے۔"

رنجیت سنگھ نے ۷ جولائی 1799ء کو لاہور پر قبضہ کرلیا۔ کیونکہ زمان شاہ اسی سال ۱۷ جنوری کو واپس کابل جا چکا تھا۔ (۱۰)، عام طور پر یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ نوجوان سردار رنجیت سنگھ پر اقتدار حاصل کرنے کی دھن سوار تھی اس نے اسی وعدہ پر شاہ زمان کو توپیں واپس کیں کہ پنجاب کی راجدھانی لاہور شاہی عطیہ کے طور پر اس کے حوالہ کردی جائے۔ غرض کہ لاہور اس کی خدمات کے صلے میں اسے مل بھی گیا۔ بقول کیپٹن ویڈ Wade (۱۱)، شاہی فرمان ہی کی بنا پر رنجیت سنگھ نے اس شہر پر قبضہ

کیا تھا۔ اپریل 1800ء کے برٹش ریکارڈ میں یہ درج ہے کہ رنجیت سنگھ نے وہ پندرہ توپیں جو دُرّانی شہزادہ ایک سال قبل اپنی ہندوستان سے واپسی کے وقت دریائے جہلم میں چھوڑ گیا تھا، زمان شاہ کے وکیل کے حوالہ کر دیں۔ (11) لیکن دُرّانی حکمران کی اس شاہی عنایت کا یہ منشا ہرگز نہ تھا کہ اس کے پیٹھ موڑتے ہی رنجیت سنگھ پنجاب کے اس اہم شہر پر حملہ کر کے اس پر غاصبانہ قبضہ کرے۔ اگرچہ بعد میں 7 جولائی 1799ء کو یہ شاہی عطیہ کے طور پر اسے دے دیا گیا۔ خلعتِ فاخرہ اس سے اگلے سال مارچ میں زمان شاہ والیٔ کابل کی طرف سے عطا کیا گیا۔ جب پندرہ توپیں شاہ کے وکیل کے حوالے کی گئی تھیں اس وقت رنجیت سنگھ اتنا طاقتور نہیں تھا کہ وہ دُرّانی حکمران کی دوستی کی پیش کش یا امداد کو ٹھکرا دیتا چاہے وہ امداد کتنی ہی مشکوک کیوں نہ ہوتی۔ بہرحال تاریخی واقعات اس امر کی تصدیق نہیں کرتے کہ رنجیت سنگھ نے شاہی فرمان ہی کی بنا پر لاہور پر قبضہ کیا۔

شاہِ کابل زمان شاہ نے جہاں اپنے وکیل کو خلعت دے کر رنجیت سنگھ کے پاس بھیجا وہاں اس کے ساتھ ہی اس نے جے پور اور دہلی کے حکمرانوں کو بھی دوستانہ مراسلے بھیجے۔ (12) ہندوستان کو سَر کرنے کی امید ابھی تک اس نے ترک نہیں کی تھی۔ رنجیت سنگھ کی افغان دوستی کی پالیسی پر انگریزوں کو بہت فکر لاحق ہوئی۔ اسی لیے 1800ء میں انہوں نے یوسف علی کو دُرّانی حکمران کی شاطرانہ چالوں کی تدارک کے لیے تعینات کیا۔ انگریز پنجاب میں ابھرتے ہوئے سیاسی انقلاب سے بھی باخبر تھے۔ انہیں علم تھا کہ لاہور پر رنجیت سنگھ نے قبضہ کر لیا ہے۔ یوسف علی کو یہ ہدایت کی گئی کہ وہ رنجیت سنگھ پر واضح کر دے کہ اگر وہ شاہِ کابل کے جال میں پھنس گیا تو سکھ قوم تباہ ہو جائے گی۔ اس کی خود پسندی کو بڑھاوا دینے کے لیے یوسف علی نے یہ بھی کہا کہ ہندوستان میں رنجیت سنگھ سکھ قوم کا محافظ سمجھا جاتا ہے۔ اور اس سے ہندوستان کے حکمرانوں کو کتنی حیرانی اور نفرت ہوگی جب انہیں معلوم ہوگا کہ ہندوستان کو فتح کرنے میں رنجیت سنگھ بھی دُرّانی حکمران کا ساتھ دے رہا تھا۔ یوسف علی کو یہ بھی سمجھایا گیا کہ رنجیت سنگھ سے بات چیت کے دوران انگریزوں کی فوجی طاقت و ٹیپو سلطان کی تباہی کا بھی ذکر کر دے جس کو فرانسیسیوں یعنی یورپ کے دُرّانیوں کی حمایت حاصل تھی۔ (13) لیکن جب یوسف علی لاہور پہنچا تو

کابل پر زمان شاہ کا دورِ حکومت ختم ہوچکا تھا۔

رنجیت سنگھ کا پہلا اہم کارنامہ لاہور پر قبضہ کرنا تھا۔ قبل ازیں لاہور پر بھنگی مسل کی حکومت تھی۔ اس کارروائی میں اس کی ساس سدا کور نے بھی اسے امداد دی۔ اس وقت بھنگی مسل کے سردار چیت سنگھ، صاحب سنگھ اور مُہر سنگھ لاہور کے حکمران تھے۔ وہ ظالم و جابر تھے۔ زمان شاہ کی واپسی کے چھبیس دن بعد ہی وہ واپس لوٹ آئے اس کے پانچ ماہ بعد لاہور کے سرکردہ شہریوں نے جن میں زیادہ تر مسلمان تھے شکر چکیہ مسل کے نوجوان سردار رنجیت سنگھ کے پاس ایک عریضہ بھیجا جس میں لاہور پر قبضہ کرنے کی اس سے استدعا اور اس کام میں تعاون کی پیش کش کی گئی تھی۔ اس کارروائی میں رنجیت سنگھ کو کسی کڑی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ تینوں سرداروں میں سے اکیلا چیت سنگھ کچھ دیر تک مقابلہ کرتا رہا۔ اس طرح اس اہم شہر کو بڑی آسانی سے جیت لیا۔

نظام الدّین والیِ قصور جسے امرتسر کے بھنگی سرداروں کی حمایت حاصل تھی ملک گیری کی اس جدّوجہد میں وہ رنجیت سنگھ کا حریف تھا اس نے زمان شاہ کو اس شرط پر پانچ لاکھ روپیہ سالانہ خراج دینے کی پیش کش کی تھی کہ اس کی طرف سے وہ پنجاب پر حکومت کرے گا۔ مگر کابل کے حکمران زمان شاہ نے یہ پیش کش نامنظور کر دی۔ شاید اسی افواہ کے پیشِ نظر کہ نظام الدین لاہور پر قبضہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے، لاہور کے سرکردہ شہریوں نے رنجیت سنگھ کو لاہور آنے کی دعوت دی۔ جب نظام الدّین کو یہ خبر ملی کہ لاہور پر رنجیت سنگھ قابض ہوگیا تو وہ آگ بگولا ہوگیا۔ دوسرے پڑوسی سردار بھی اس عالیشان شہر پر رنجیت سنگھ کے قبضہ کی خبر سُن کر گھبرا گئے۔ رنجیت سنگھ کے خلاف ایک زبردست محاذ قایم کیا گیا جس میں قصور کا نظام الدین، امرتسر کی بھنگی مسل کا سردار گلاب سنگھ، گجرات کا سردار صاحب سنگھ اور جسّا سنگھ رام گڑھیا شامل تھے۔ انہوں نے لاہور کی مشرقی سرحد پر واقع ایک گاؤں بھسین میں اپنی فوجیں جمع کیں۔ دو مہینے تک وہ وہاں پر ڈیرے ڈالے رہے بعد میں ان کا یہ گٹھ جوڑ آپس کی رقابت، حسد اور رنجیت سنگھ کی فوجی تیاریوں کے ڈر سے ٹوٹ گیا۔ بھنگی مسل کا سردار گلاب سنگھ کثرتِ شراب نوشی کا شکار ہوا۔ اس طرح رنجیت سنگھ نے ایک زبردست خطرہ سے نجات پائی۔ اس کے بعد سکھ سرداروں کو کبھی متحد ہونے کا موقع نہیں ملا۔ اور نہ وہ رنجیت سنگھ کا زور

توڑ سکے (15) -

رنجیت سنگھ نے اس موقع پر ان سکھ سرداروں سے چھیڑ چھاڑ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ بلکہ اس نے ان علاقوں کی طرف توجہ کی جو آسانی سے اس کے ہاتھ لگ سکتے تھے۔ سب سے پہلے جموّں کی خوش حالی اور دولت مندی نے اسے متاثر کیا۔ جموں پہنچنے سے پہلے میروال اور نارو وال کو زیر نگیں کیا۔ جموں کا سردار بھی باج گذار بننے کے لیے راضی ہوگیا۔ اس نے بیس ہزار روپے نقد دیے۔ گجرات کے سردار صاحب سنگھ نے اکال گڑھ کے سردار دُول سنگھ کے ساتھ مل کر رنجیت سنگھ کے خلاف سازش کی۔ دُول سنگھ کسی زمانہ میں رنجیت سنگھ کے باپ سردار مہا سنگھ کا نائب رہ چکا تھا۔ جب رنجیت سنگھ سیالکوٹ کے راستے جموں سے واپس لاہور آرہے تھے تو دُول سنگھ اور صاحب سنگھ نے ان پر حملہ کر دیا۔ مگر انہیں شکست ہوئی۔ رنجیت سنگھ نے دُول سنگھ کو قید کر لیا۔ صاحب سنگھ، امرتسر کے بھنگی سرداروں اور وزیر آباد کے جودھ سنگھ نے اسے رہا کرانے کے لیے لڑائی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اسی بیچ ایک سنت بابا کیسر سنگھ نے مداخلت کی اور دُول سنگھ کو رہا کرا دیا گیا۔ رہائی کے فوراً بعد دُول سنگھ فوت ہوگیا اور رنجیت سنگھ نے اکال گڑھ کو اپنے راج میں شامل کر لیا۔ صرف دو گاؤں دُول سنگھ کی بیوی کے گزارے کے لیے چھوڑ دیے۔ ملحقہ علاقہ میں ایک سرحدی چوکی بنائی۔ گجرات کے صاحب سنگھ کی بھی خبر لی گئی۔ ایک اور مذہبی رہنما صاحب سنگھ بیدی کی مداخلت سے اس کا چھٹکارا ہوا۔ ورنہ اس کا تباہ ہونا یقینی تھا لیکن گجرات کے اس سرکش سردار نے بھسین گٹھ جوڑ کے پرانے ساتھی قصور کے نظام الدین سے مل کر ساز باز شروع کر دی۔ مہاراجہ نے نظام الدین کی سرکوبی کے لیے فتح سنگھ کالیاں والے کو بھیجا۔ نظام الدین نے اطاعت قبول کرنے ہی میں اپنی عافیت سمجھی اور بھائی قطب الدین کو بطور یرغمال رنجیت سنگھ کے حوالے کیا۔ (16)

پہاڑی علاقوں میں سنسار چند والیٔ کانگڑہ اسی پالیسی پر عمل پیرا تھا جو رنجیت سنگھ نے میدانی علاقوں میں اختیار کر رکھی تھی۔ اس لیے دونوں کے درمیان ٹکر لازمی تھی۔ سنسار چند نے رانی سدا کور کے کچھ پہاڑی علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ رنجیت سنگھ سدا کور کی امداد کو آیا۔ یہ دیکھ کر کہ رنجیت سنگھ کا مقابلہ دشوار ہے سنسار چند پیچھے ہٹ

گیا۔ مہاراجہ نے نذرانے کے طور پر لوز پورے لیا۔ یہ معمولی لڑائیاں والیٔ لاہور کو مطمئن نہ کر سکیں۔ مہاراجہ نے فتح سنگھ آہلوالیہ کے ساتھ پگڑی بدل کر ایک ایسا قدم اٹھایا جو نہ صرف ان کی مستقل دوستی کا ضامن تھا بلکہ اس سے رنجیت سنگھ کے ملک گیری کے ارادوں کی تکمیل اور کامیابی میں کوئی شبہ نہ رہا۔ شکر چکیہ، کنہیا اور آہلوالیہ تینوں مسلوں کے ذرائع رنجیت سنگھ کی پالیسی کو کامیاب بنانے کے لیے اب متحد ہو چکے تھے۔ اس وقت تینوں کے مفاد بھی کسی حد تک مشترک تھے۔ فتح سنگھ آہلوالیہ، سنسار چند کو اپنا دشمن سمجھتا تھا اور رنجیت سنگھ اسے اپنا حریف۔ فتح سنگھ رام گڑھیوں کے بھی خلاف تھا جو کہ بھسین کے محاذ میں شامل ہوئے تھے۔ آہلوالیہ سردار کے لیے اپنے کئی باغی جاگیرداروں کی سرکوبی کے لیے رنجیت سنگھ کی امداد بڑی مفید تھی۔ کنہیا مسل کی رام گڑھیا مسل سے آبائی رقابت تھی اور سدا کور کو بھی سنسار چند سے اندیشہ تھا کیونکہ اس سے پہلے بھی اس نے سدا کور کے کچھ علاقوں کو دبا لیا تھا۔ یہ تینوں اتحادی طاقتیں یعنی شکر چکیہ، کنہیا اور آہلوالیہ، گجرات اور امرتسر کے بھنگی مسل کے سرداروں کی مخالف تھیں۔ فتح سنگھ اور سدا کور کو جلد ہی معلوم ہو گیا کہ یہ اتحاد ان کی مخالف مسلوں کو کچلنے کے لیے تو فائدہ مند ثابت ہوا مگر اپنے ساتھی شکر چکیہ کے سردار رنجیت سنگھ کی بڑھتی ہوئی طاقت کو روکنا ان کے بس کی بات نہ رہی۔ یہ باہمی اتحاد جو رشتہ داری اور سیاسی تعلقات کی بنا پر قایم ہوا تھا، رنجیت سنگھ کی سیاسی کامیابی اور حصول اقتدار کا زینہ تھا۔ ہر معاملہ میں پیش قدمی والیٔ لاہور رنجیت سنگھ کی طرف سے ہوتی تھی۔

1802ء میں رنجیت سنگھ نے جسا سنگھ ولد سردار کرم سنگھ کو ہرا کر چنیوٹ پر قبضہ کر لیا۔ جسا سنگھ نے دو ماہ ڈٹ کر مقابلہ کرنے کے بعد فتح سنگھ کالیاں والے کی وساطت سے رنجیت سنگھ کی اطاعت قبول کر لی۔ سردار فتح سنگھ آہلوالیہ کو اس جنگ میں شریک ہونے کے صلے میں جہلم پار کے دو علاقے پنڈی بھٹیاں اور دھانا ملے۔ جب رنجیت سنگھ اور اس کے ساتھی چنیوٹ کی جنگ میں مصروف تھے تو نظام الدین والیٔ قصور نے جو گجرات کے صاحب سنگھ کی طرح سرکش تھا، رنجیت سنگھ کی رعایا کے اونٹوں کے ریوڑ پر چھاپہ مارا۔ رنجیت سنگھ اور اس کے ساتھی سرداروں نے اس پر دھاوا بول دیا۔ نظام الدین قلعہ بند ہو گیا۔ اس نے ایک سکھ سردار نہنگ سنگھ کی مدد سے قلعہ میں کچھ بارود بھی جمع کر لی تھی

پھر بھی وہ مقابلہ کی تاب نہ لاسکا اور بھاری نذرانہ ادا کرنا منظور کیا (17)۔ 1803ء میں رنجیت سنگھ نے پہلی بار ملتان کی طرف کوچ کیا لیکن ابھی رنجیت سنگھ تیس میل کی دوری پر تھا کہ مظفر خان ایک بیش بہا تحفہ لے کر رنجیت سنگھ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ رنجیت سنگھ نے جھنگ، ساہیوال اور شاہ کابل کے کچھ مقبوضات پر فوج کشی کی۔ ان علاقوں میں زیادہ تر آبادی مسلمانوں کی تھی۔ احمد خان والیٔ جھنگ نے زبردست مقابلہ کے بعد اطاعت قبول کی اور سالانہ خراج دینا منظور کیا۔ ویڈ (Wade) لکھتا ہے کہ شمال مغرب میں رنجیت سنگھ نے راولپنڈی تک چڑھائی کی۔ راوی اور چناب کے درمیان واقع کارلان بار اور کتھیا بار اور چناب و جہلم کے درمیان ساہیوال بار کے علاقوں کو باج گزار بنایا۔ احمد آباد اور خوشاب بھی بدستور خراج دیتے رہے۔ (18) کابل کے اندرونی جھگڑوں سے فائدہ اٹھا کر کابل سے دور دراز ہندوستانی علاقوں کے صوبے دار باغی ہو گئے۔ رنجیت سنگھ جیسا موقع شناس حکمران کب چوکنے والا تھا۔ مہاراجہ نے ان علاقوں پر اپنا اقتدار قایم کرنے کی پوری کوشش کی اور کامیاب ہوا۔ اس نے جالندھر جیسے سرسبز دوآب کے کچھ علاقوں پر پہاڑی سردار سنسار چند کے قبضہ کرنے کی کوششوں کو ناکام بنا دیا اور اسے ہوشیار پور اور بجواڑہ سے بھی نکال دیا۔ ادھر گورکھوں نے اس پر حملہ کر دیا۔ انجام کار اس نے رنجیت سنگھ سے امداد مانگی۔

بھنگی مسل کے گڑھ امرتسر کی فتح کی تاریخ کے متعلق مورخین میں اختلاف ہے۔ سوہن لال نے اس کی تاریخ فروری 1805ء قرار دی ہے۔ جن حالات میں بھنگی مسل کا یہ قلعہ سر ہوا بالکل واضح ہیں۔ اور ان میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں۔ بھنگی مسل کے سردار گلاب سنگھ کا بیٹا گوردت سنگھ نابالغ تھا اور گلاب سنگھ کی بیوہ مائی سکھاں اپنے بیٹے کی سرپرست کی حیثیت سے جاگیر کا انتظام کر رہی تھی۔ رنجیت سنگھ قدرتی طور پر خواہاں تھا کہ امرتسر جو اس کے صدر مقام لاہور کے بالکل قریب ہے، اس کے ہاتھ آ جائے اس سازش میں شیخ کمال الدین منتظم ڈیوڑھی اور امرتسر کا ایک بڑا ساہوکار روہڑ مل رنجیت سنگھ کے شریک کار تھے۔ ان حالات میں کوئی بہانہ ڈھونڈنا مشکل نہ تھا۔ رنجیت سنگھ نے گوردت سنگھ سے مطالبہ کیا کہ بھنگیوں کی مشہور توپ زمزماس کے حوالے کر دی جائے چونکہ درانیوں کے خلاف 1764ء کی جنگ میں جو مالِ غنیمت ہاتھ لگا تھا اس میں شکر چکیہ

مسل کا بھی حصّہ تھا۔ اس لیے رنجیت سنگھ نے توپ زمزمہ پر اپنا حق جتایا۔ مائی سکھاں نے توپ حوالے کرنے سے انکار کر دیا۔ جودھ سنگھ ولد جسا سنگھ رام گڑھیا نے امرتسر کے لوگوں کو مشورہ دیا کہ رنجیت سنگھ کو توپ دے کر اُس کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کر لیے جائیں یا اس توپ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے جائیں۔ لیکن گوردت سنگھ کے سپاہی اس پر راضی نہ ہوئے۔ دو گھنٹہ مقابلہ کرنے کے بعد گوردت سنگھ اور اس کی ماں مائی سکھاں میدان سے بھاگ نکلے۔ اس طرح رنجیت سنگھ کا قبضہ حسب خواہش اس اہم شہر اور قلعہ پر ہو گیا۔

1805ء تک لاہور اور امرتسر رنجیت سنگھ کے قبضے میں آ چکے تھے۔ فتح سنگھ آہلو والیہ اور رانی سدا کور اس کے ساتھی تھے اور وہ جموں اور قصور سے خراج وصول کرتا تھا۔ شمال کے کوہستانی علاقے میں مغرب میں جھنگ، ساہیوال، خوشاب اور راولپنڈی اور جنوب میں ملتان اور اس کے نواح کی طرف اس کا دھیان لگا ہوا تھا۔ مشرق میں کچھ ایسے واقعات رونما ہو رہے تھے جن کی طرف رنجیت سنگھ کو توجہ دینی پڑی۔

اشارات

1- عمدۃ التواریخ 11، 17، 19

2- ویڈ (Wade) کا خط مورخہ 13 مئی 1831ء

3- غیر ملکی محکمہ متفرق نمبر 128

4- برنز کا سفر نامہ جلد اوّل

5- فرینکلن (Franeklin) کا شاہ عالم

6- ایضاً

7- پی۔ آر۔ سی (P.R.C.) جلد 8، خط نمبر 7

8- ویڈ (Wade) کا خط مورخہ یکم اگست 1827ء

9- پی۔ آر۔ سی (P.R.C.) جلد 9، خط نمبر 7

10- تاریخ سکھاں 139 . F

11- پی-آر-سی (P.R.C.) جلد نمبر 9، خط نمبر 7

12- ایضاً تعارف

13- ایضاً نمبر B-17

14- تاریخ سکھاں F-138

15- عمدۃ التواریخ جلد دوم و ظفر نامہ، پی-آر-سی جلد نہم نمبر 118 ضمیمہ،

16- پی-آر-سی (P.R.C.) جلد نہم نمبر 47

17- پنجاب اور متصلہ صوبے- ویڈ (Wade) کتاب کا اصلی نام On the Punjab and Adjacent Provinces

18- عمدۃ التواریخ- جلد دوئم، ظفر نامہ، تاریخ سکھاں-

دوسرا باب

مشرق میں ناکامی۔ شمال میں کامیابی

(1805ء سے 1809ء تک)

1805ء میں رنجیت سنگھ ملتان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کو خبر ملی کہ جسونت راؤ ہلکر پنڈاری سردار امیر خان کے ہمراہ پنجاب میں داخل ہو چکا ہے اور لارڈ لیک Lord Lake ان کا سخت تعاقب کر رہا ہے۔ ہولکر کے پاس تقریباً 2000 سوار، [illegible] پیادہ فوج اور تیس توپیں تھیں (1)۔ اس مسئلہ پر خاص طور سے غور کرنے کے لیے سکھوں کی اسمبلی "سربت خالصہ" کا اجلاس بلایا گیا۔ اور نوجوان سردار رنجیت سنگھ اس اجلاس میں شامل ہونے کے لیے فی الفور امرتسر لوٹا جب ہولکر نے رنجیت سنگھ سے امداد مانگی تو اس شکر چکیہ سردار نے بڑی نرمی سے پنجاب میں اپنے دشمنوں کے خلاف ہولکر کی حمایت طلب کی۔ اسی اثنا میں لارڈ لیک (Lord Lake) نے بھی مہاراجہ سے زوردار حمایت کا مطالبہ کیا۔ مگر اس شیریں زبان نوجوان سیاستدان نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ وہ جسونت راؤ ہلکر کو معہ فوج امرتسر سے تیس کوس دور ہٹ جانے پر مجبور کر دے گا۔(2) ہولکر نے رنجیت سنگھ کی دل شکن خاموشی سے تنگ آ کر امداد حاصل کرنے کے لیے چاروں طرف ہاتھ پاؤں مارے یہاں تک کہ کابل کے بادشاہ (3) شاہ شجاع کے پاس جو اسی وقت شکارپور میں تھا اپنے ایک وکیل کو تحائف دیکر بھیجا لیکن بالآخر انگریزی حکومت کی جو شرائط اندروئے معاہدہ رائے پور گھاٹ طے ہوئیں (رائے پور گھاٹ دریائے بیاس پر واقع ہے)، کو زیادہ فائدہ مند دیکھ کر ہولکر نے 1805ء میں انگریزوں سے صلح کر لی۔ رنجیت سنگھ نے بعد میں ہولکر کو "پکا دھوکا باز" کہا۔(4) جب تک لارڈ لیک (Lord Lake) کی فوجیں اس کے گرد و نواح میں تھیں ہولکر نے اپنی فوج کو لوٹ مار سے باز رکھا لیکن

جیسے ہی اس نے پیٹھ موڑی ہولکر نے اپنی فوج کو سارے علاقہ میں لوٹ مار کی کھلی چھوٹ دے دی۔ سر جان میلکم (Sir John Malcolm) نے جو انگریزی فوج کا پولیٹیکل ایجنٹ (سیاسی نمایندہ) تھا رنجیت سنگھ کے نمایندہ سردار مٹھ سنگھ سے کہا "میرے دوست واپس جاؤ اور اپنے آقا کو بتاؤ کہ وہ ان دو شوریدہ سر مہمانوں سے چھٹکارا پانے پر خود کو مبارک دے۔(5)

1805-6ء میں رنجیت سنگھ کی شیریں بیانی 1808-9ء کی اسکی جلد بازی کے بالکل متضاد ہے۔ دہلی میں یکے بعد دیگرے جو طاقتیں برسر اقتدار آئیں ان کے اور رنجیت سنگھ کے تعلقات پر اگر نظر ثانی کی جائے تو ہمیں اس تضاد کی وجہ جواز مل جائے گی۔ 1796ء سے 1830ء تک جنرل پیرن شمالی ہندوستان میں دولت راؤ سیندھیا کے معاملات کا نگران تھا۔ جنرل پیرن (Perron) کو ڈی۔ بوئن (De-Boigne) کی جگہ دولت راؤ کی باقاعدہ فوجوں اور ان کے گذارے کے لیے مقرر جاگیروں کا کمانڈر بنایا گیا تھا۔ ستلج کے اس پار کے سکھ سردار آئرش حملہ آور جارج تھامس (George Thomas) سے تنگ آکر پیرن سے امداد مانگنے آئے۔ اس نے اپنے نائب لوئس بارکوئن (Louis Bourquin) کو ان کی امداد کے لیے بھیجا۔ چار مہینے تک مقابلہ کرنے کے بعد یکم جنوری 1802ء کو جارج تھامس نے ہتھیار ڈال دیے۔ تھامس کی شکست کے بعد ستلج کے اس پار کے سکھ سرداروں نے پیرن سے ستمبر 1800ء میں معاہدہ کیا جو کئی اہم واقعات کا پیش رو ثابت ہوا۔ پٹیالہ کے سردار صاحب سنگھ اور جنرل پیرن نے پگڑیاں بدلیں اور پٹیالہ کے ایک وکیل نے دولت راؤ کی خدمت میں نذرانہ پیش کیا۔(6) دوستی کی آڑ میں جنرل پیرن سکھ سرداروں کی طاقت گھٹا کر انھیں باج گذار بنانا چاہتا تھا ۔ 1800ء کے معاہدہ کی رُو سے پیرن کے نائب بورکوئن (Bourquin) نے سکھوں سے رقم بٹورنا شروع کی۔ کیونکہ معاہدہ کی رو سے سکھ سرداروں نے جنرل پیرن کو چھ مہینے تک پچاس ہزار روپے دینے منظور کیے تھے۔(7) تھامس کی اس شکست نے ستلج کے اس پار علاقوں میں مرہٹوں کی طاقت بڑھا دی۔ پیرن نے شاید یہ خیال کیا تھا کہ ستلج کے اس پار سردار اپنی کمزوری کے باعث اس کے پورے قابو میں آجائیں گے اس لیے اس نے ستلج پار کے سب سے طاقتور سکھ سردار رنجیت سنگھ سے نامہ و پیام شروع کیا۔ اس نے اپنے ایک سفیر سدا سکھ کو تھامس کی ہار کے بعد لاہور بھیجا۔ اس کے

بعد جلد ہی اس نے معاملات کو تیزی سے سلجھانے کے لیے رنجیت سنگھ کے ماموں بھاگ سنگھ والیٔ جیند سے رابطہ قایم کیا۔ بھاگ سنگھ نے مندرجہ ذیل شرائط پر رنجیت سنگھ سے بات چیت کرنا منظور کی کہ لاہور اور ماجھا کے علاقوں پر صرف رنجیت سنگھ کی حکومت ہوگی۔ اور دوستانہ تعلقات بھی صرف رنجیت سنگھ کے ساتھ رہیں گے۔ جس کی حدود سلطنت دریائے اٹک کے کنارے تک ہوں گی (8)۔

لیکن رنجیت سنگھ جیسا محتاط حکمراں ان کے جال میں کہاں پھنسنے والا تھا۔ وہ کسی قیمت پر بھی اپنے سے زیادہ طاقتور حکمراں سے کسی قسم کا معاہدہ کرنے پر راضی نہ تھا۔ چھوٹے پیمانہ پر وہ یہی چال خود اپنے علاقہ میں چل رہا تھا اس لیے وہ دولت راؤ سندھیا یا اس کے ایجنٹ پیرن (9) سے کسی سیاسی معاہدہ یا الجھن میں نہیں پھنسنا چاہتا تھا اس نے ظاہر میں ان کے ساتھ تعلقات تو بنائے رکھے لیکن انگریزی حکومت کو بھی پیرن کی کوششوں اور اقدامات کی اطلاع دیتا رہا۔ 1802ء میں بسین کے عہد نامہ اور بعد میں انگریزوں اور مرہٹوں کے درمیان دوسری جنگ چھڑ جانے کے باعث حالات کا رخ بالکل بدل گیا۔ پیرن اور بورکوئن کا خاتمہ ہوا۔ انجام کار دولت راؤ سندھیا کی طاقت شمالی ہندوستان میں ختم ہوگئی۔ اور دہلی میں بھی مرہٹوں کی جگہ انگریزوں کا دور دورہ ہوگیا ستلج کے اس پار کے سکھ علاقہ میں مرہٹوں کے رسوخ کا صحیح اندازہ لگانا مشکل ہے۔ سندھیا کے برٹش ریزیڈنٹ کولنز (Collnins) نے جون 1802ء میں لکھا کہ پٹیالہ کا سردار زور دے رہا ہے کہ دوستانہ خط وکتابت جو قبل ازیں میرے اور اس کے درمیان تھی اسے پھر سے جاری کیا جائے (10)، پٹیالہ کا حکمراں پیرن کی دوستی سے اُکتا چکا تھا۔ لارڈ ولزلی کی سرکاری خط وکتابت میں ستلج کے اس پار کے سکھ علاقہ پر مرہٹوں کے حقوق کا جو بعد میں مرہٹوں کے زوال پر انگریزوں نے حاصل کر لیے۔ کئی جگہ اس طرح ذکر کیا گیا ہے۔ ولزلی کے خطوط میں ستلج کے اس پار کے سکھ علاقہ میں مرہٹوں کے حاصل کردہ حقوق جو بعد میں انگریزوں کو ورثہ میں ملے۔ دراصل یا تو پیرن کے اثر ورسوخ کا نتیجہ تھے یا اس نے ذاتی تعلقات کی بنا پر یہ حقوق حاصل کیے یا اقتدار کے ساتھ ساتھ کچھ حقوق اُسے مل گئے (11)۔ برٹش حکومت نے جو پوزیشن حاصل کی وہ غیر متعین اور مبہم تھی۔ ولزلی کے زیر اثر انگریزی حکومت کی پوزیشن واضح

اور مستحکم ہوجاتی اگر لارڈ کارنوالس اور بارلو (Barlow) غیر مداخلت کی پالیسی پر عمل پیرا نہ ہوتے۔ اس سے برٹش حکومت جمنا تک محدود ہوگئی اور جے پور، بوندی، مچھری، بھرتپور اور گوہد جیسی ریاستیں بھی جن کے ساتھ لارڈ لیک نے دوستانہ معاہدے کیے تھے، انگریزوں کے دائرہ اثر سے نکل گئیں۔ ستلج کے اس پار کی سکھ ریاستوں سے بھی برٹش حکومت کے تعلقات مبہم صورت اختیار کر گئے۔ جب لیک (Lake) ستلج کے اس پار کے علاقہ میں داخل ہوا تو، رنجیت سنگھ اپنے معاملات میں اتنا الجھا ہوا تھا کہ وہ اپنی حدود سلطنت کو مشرق کی طرف بڑھانے کا خیال تک نہیں کر سکتا تھا۔ پٹیالہ کا راجہ صاحب سنگھ لڑاکا جھگڑالو تھا اور اپنی رانی سے جھگڑا کر رہا تھا۔ ہولکر اس وقت اس پوزیشن میں نہ تھا کہ ان کے باہمی جھگڑوں سے فائدہ اٹھاتا۔ لیکن سنا جاتا ہے کہ اس نے امیر خان سے کہا "خدا نے ہمیں دو کبوتر کھال اتارنے کے لیے بھیجے ہیں تم ایک کا ساتھ دینا، میں دوسرے کی حمایت کروں گا (2)۔ کمزور صاحب سنگھ کو تحفظ کی ضرورت تھی۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس نے انگریزی حکومت سے بھی اسی مقصد کے لیے رابطہ قایم کیا۔ کیتھل کا سردار لال سنگھ اور جیند کا سردار بھاگ سنگھ، دونوں لارڈ لیک کے ساتھ مل گئے۔ کننگھم (Cunningham) لکھتا ہے کہ سرہند کے بہت سے سکھ سرداروں کے ساتھ لارڈ لیک کے بڑے گہرے تعلقات تھے ان میں سے بعض نے انگریزوں کی ضرورت کے وقت قیمتی خدمات انجام دیں (3)۔ لیکن جب دریائے جمنا برٹش راج کی سرحد مان لی گئی تو مرہٹوں کے حقوق اور لارڈ لیک کے معاہدوں کی کوئی اہمیت نہ رہی اور ستلج کے اس پار کے سکھ سرداروں کو یہ بات واضح ہوگئی۔ برٹش حکومت کے سیاسی رشتہ میں انہیں شامل نہیں کیا گیا۔ اس تاریخی بیان کی صحت ثابت ہو چکی ہے "کہ کوئی بھی سیاسی میدان جو چھوڑا جائے دشمن اس سے فوراً فائدہ اٹھاتا ہے"۔ رنجیت سنگھ نے جنرل مٹکاف (Metcalfe) کو بتایا کہ وہ یہ سمجھنے میں حق بجانب تھا کہ برٹش گورنمنٹ اس علاقہ پر اپنے تمام سیاسی حقوق سے دست بردار ہو چکی ہے۔ لارڈ لیک نواحی علاقوں میں موجود تھا جب پٹیالہ کا راجہ اور رانی باہمی جھگڑوں میں مصروف تھے۔ اگر برٹش کمانڈر انچیف ذرا بھی مداخلت کرتا تو یہ جھگڑا ختم ہو جاتا۔ لارڈ لیک ستلج کے اس پار کے علاقہ کو خیرباد کہتے وقت فوج کا ایک دستہ بھی اس علاقہ میں چھوڑ جاتا، تو برٹش حکومت کی سربراہی سے کوئی بھی

منکر نہیں ہو سکتا تھا۔ رنجیت سنگھ کھلے بندوں ستلج کے جنوبی علاقوں پر چھاپے مارتا رہا اور سکھ سرداروں سے نذرانے وصول کرتا رہا۔ جب ستلج کے اس پار کے کئی سکھ سردار رنجیت سنگھ کی دستبرد سے نجات حاصل کرنے کے لیے دہلی آئے تو ان کی کچھ شنوائی نہیں ہوئی، قدرتی طور پر رنجیت سنگھ اس نتیجہ پر پہنچا کہ وہ سارے علاقہ پر جہاں چاہے حملہ کر سکتا ہے۔ اس نے جو حملے کیے اور اقتدار حاصل کرنے کی کوششوں میں جو محنت کی، روپے صرف کیے اور اپنی فوجوں کا جو بے بہا خون بہایا اس دلیل کی بنا پر رنجیت سنگھ نے ان متعلقہ علاقوں پر اپنا حق جتایا (۱۸)۔ بہرحال قصور اور ملتان کے افغانوں اور شمال میں گورکھوں سے الجھے رہنے کے باعث ستلج اور جمنا کے درمیانی علاقوں پر رنجیت سنگھ مکمل طور پر قابض نہ ہو سکا۔ اس وقت اسے یہ خیال بھی نہیں آ سکتا تھا کہ انگریزی حکومت نے ستلج کے اس پار کے علاقہ میں از سر نو دلچسپی لینا شروع کر دی تھی۔ 1806ء میں پٹیالہ اور نابھہ کے راجاؤں میں جھگڑا شروع ہو گیا۔ جنید کے سردار بھاگ سنگھ نے جو نابھہ کے راجہ جسونت سنگھ کا حامی تھا، رنجیت سنگھ سے امداد مانگی۔ رنجیت سنگھ نے بڑی مستعدی سے اس دعوت کو قبول کیا اور ستلج پار کر کے راجہ پٹیالہ کے علاقہ میں داخل ہو گیا۔ پٹیالہ کی فوجوں نے مقابلہ کیا مگر شکست کھائی۔ نابھہ اور جنید کے راجاؤں نے رنجیت کو نذرانے پیش کئے۔ کہا جاتا ہے کہ پٹیالہ کے راجہ صاحب سنگھ نے رانی آس کور کو بتایا کہ وہ اس کے دل میں اب بھی ارادے ہیں خدا اس سے محفوظ رکھے اور وہ فوراً یہاں سے چلا جائے میں اس کے طور طریقوں سے خائف ہوں (۱۹)۔ ستلج کے اس پار کی اسی مہم میں اس نے لدھیانہ کا قلعہ بھی سر کر لیا اور رائے کوٹ کے خاندان کے دوسرے مقبوضات پر قبضہ کر لیا۔ بہرحال لدھیانہ جنید کے راجہ بھاگ سنگھ کے حوالہ کر دیا گیا اور دوسرے علاقے فتح سنگھ آہلووالیہ اور محکم چند جیسے وفادار ماتحت سرداروں میں تقسیم کر دیے۔ ستلج کے اس پار کے علاقہ پر رنجیت سنگھ کے دوسرے حملہ کے بارے میں مورخین کے بیان مختلف ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ بھاگ سنگھ کے مشورے پر راجہ صاحب سنگھ نے رانی اور کمار ولی عہد کے خلاف رنجیت سنگھ سے مدد مانگی۔ ایک اور بیان کے مطابق پٹیالہ کی رانی آس کور نے 1807ء کے موسم برسات میں رنجیت سنگھ سے راجہ پٹیالہ یعنی اپنے شوہر کے خلاف امداد چاہی اور اس کے صلے میں کڑے خان نام کی پیتل کی توپ اور ایک بہت قیمتی ہار

رنجیت سنگھ کو دینے کا وعدہ کیا لیکن رنجیت سنگھ کے پٹیالہ پہنچنے سے پہلے ہی راجہ اور رانی میں صلح ہو گئی۔ پھر بھی وعدہ کے مطابق راجہ کو ہیرے دو اشیاء دینے پر مجبور کیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ ان دونوں چیزوں کے بدلے میں رنجیت سنگھ نے رائے پور، گجروال، فتح گڑھ کے قلعے اور متصل کے اضلاع راجہ پٹیالہ کو دینے کا وعدہ کیا۔ یہ وعدہ اس نے کبھی پورا نہیں کیا۔ ان دونوں سرداروں (راجاؤں) کی باہمی خط و کتابت سے سیاسیات کے پردے میں ڈھکا ہوا پٹیالہ کے راجہ صاحب سنگھ کا دلی خوف صاف دکھائی دیتا ہے۔ ان خطوط میں رنجیت سنگھ نے اسے "بھائی صاحب" سے مخاطب کیا ہے۔ جب کہ جواب میں صاحب سنگھ نے اسے کرم فرما اور "مہربان دوست" سے مخاطب کیا ہے (۱۵)۔ ایک اور بیان یہ ہے کہ راجہ بھاگ سنگھ نے دونوں میں مصالحت کرائی تھی کیونکہ کیتھل اور تھانیسر کے سرداروں کے ساتھ مل کر رانی آس کور نے اسے دھمکی دی تھی۔ رنجیت سنگھ انبالہ اور تھانیسر تک بڑھا اور پھر شمال کا رخ کیا۔ پٹیالہ کے راجہ اور رانی نے اسے زر کثیر سے مالا مال کر دیا۔ اس کے بعد اس نے نرائن گڑھ پر دھاوا بولا۔ بڑی مشکل سے اسے فتح کر کے فتح سنگھ آہلووالیہ کی تحویل میں دے دیا۔ محکم چند کو زیرہ کا ضلع دے دیا گیا۔ واڈنی کے علاقہ کو سر کر کے اپنی ساس سدا کور کے حوالہ کر دیا۔

ستلج کے اس پار کی دونوں مہموں میں رنجیت سنگھ نے پٹیالہ کے راجہ صاحب سنگھ سے، نابھہ کے راجہ جسونت سنگھ سے، مالیر کوٹلہ کے افغانوں سے، کیتھل کے بھائی لال سنگھ سے، شاہ آباد کے گوردت سنگھ سے، انبالہ کی رانی دیا کور سے، بوڑیا کے راجہ بھگونت سنگھ سے اور کلسیہ کے راجہ جودھ سنگھ سے نذرانے وصول کئے۔ ستلج کے اس پار کے زمینداروں سے بھی مال گزاری وصول کی۔ ان زمینداروں کی ایک لمبی فہرست دیوان امرناتھ نے بنائی ہے۔ اس سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ رنجیت سنگھ ستلج کے اس پار کی ریاستوں کو سر کرنے ہی کے لیے نکلا تھا (۱۶)۔

اس سے ستلج کے اس پار کے سکھ سرداروں کے دلوں پر خوف پیدا ہو گیا۔ یہ بات اب پوشیدہ نہ رہی کہ رنجیت سنگھ ان چھوٹی ریاستوں کو اپنے تحت لانا چاہتا تھا۔ اسی خوف سے کئی سکھ سرداروں مثلاً جیند کے راجہ بھاگ سنگھ، کیتھل کے سردار بھائی لال سنگھ، پٹیالہ کے دیوان، اور نابھہ کے وکیل نے مل کر دہلی میں برٹش ریزیڈنٹ سیٹن

(Seton) سے مارچ 1808ء میں ملاقات کی اور اپنے ہم مذہب حملہ آور رنجیت سنگھ سے مدد مانگی۔ کننگھم (Cunningham) کے کبھی نہ بھولنے والے الفاظ ہیں "رنجیت سنگھ نے بڑی محنت اور دانشمندی سے ایک ایسی تدبیر اختیار کی تھی جس سے چھوٹی چھوٹی منتشر سکھ قوتوں کو ایک لڑی میں پرو کر سکھ قوم کو ایک ہی جھنڈے تلے منظم کر کے سکھ ریاست یا دولتِ مشترکہ قائم کر دی۔ ٹھیک اسی طرح جیسے گرو گوبند سنگھ نے ایک معمولی فرقہ کو ایک جاندار قوم بنا دیا تھا(17)۔" لیکن سب سکھ سردار یا راجے اس سے حسد کرنے لگے اور شاید وہ اکیلا ہی ایسا حکمران تھا جو انگریزوں کو پنجاب کے حدود سے باہر رکھنا چاہتا تھا۔ اس کے باوجود اس موقع پر برٹش سرکار کی طرف سے ستلج کے اس پار کے ان سکھ سرداروں کی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی۔

1806ء سے مارچ 1808ء کے درمیان جو واقعات ستلج کے اس پار کے علاقہ میں رونما ہوئے ان کی ذمہ داری سے بچنے کے لیے دسمبر 1808ء میں جو دلائل سر چارلس مٹکاف نے پیش کیے اصل واقعات سے میل نہیں کھاتے۔ اس کے مطابق "رنجیت سنگھ نے پہلے دو بار جو اُن سکھ ریاستوں کا دورہ کیا تھا وہ سکھ سرداروں کی دعوت پر ہی کیا تھا وہ وہاں تھوڑے ہی عرصہ رہا۔ ان علاقوں پر اپنا تسلط جمانے کا اس کا کوئی ارادہ نہیں معلوم ہوتا تھا۔ بعد میں یہ بات صاف ہو گئی کہ اس نے اپنی حدودِ سلطنت سے تجاوز کر لیا تھا مگر اس کے خلاف کوئی کارروائی کرنا ضروری نہیں خیال کیا گیا۔ جو سردار دہلی مدد لینے کے لیے آئے تھے ان سے یہ کبھی نہیں کہا گیا کہ ان کی حفاظت نہیں کی جائے گی۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انگریزی حکومت کو یہ یقین تھا کہ ان کے اندیشے بے بنیاد تھے(18)۔" تاہم یہ زبان سیاسی رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ "سیٹن کے پاس امداد کے لیے جو وفد گیا تھا اس کی ناکامی کے بعد سکھ سردار اپنی قسمت پر شاکر ہو گئے۔ مٹکاف نے خود لکھا ہے "کہ ستلج کے اس پار کے راجے جو مہاراجہ کے کیمپ میں تھے وہ اتنے اطاعت گزار معلوم ہوتے تھے گویا وہ مدتوں سے اس کے تابع فرمان رہے ہوں۔" مٹکاف اس بات کو تسلیم کرنے کی جرأت نہیں کر سکا کہ برٹش پالیسی، حالات کے زیرِ اثر بدل چکی تھی۔

مٹکاف مشن کے ساتھ ساتھ ہم رنجیت سنگھ کی خارجہ پالیسی میں بھی نیا رنگ دیکھتے ہیں اور توازن میں نمایاں تبدیلی پاتے ہیں۔ لیکن اس مشن کی اصل نوعیت اور

اس کے طرزِ عمل میں تبدیلیاں اسی وقت سمجھ میں آسکتی ہیں جب ہم یورپ کی مشرق قریب اور مشرقِ وسطیٰ کی سیاست پر غور کریں (۱۸)۔ جو کچھ نپولین نے ۱798ء سے 1801ء کے دوران کہا تھا برطانوی دفترِ خارجہ اسے فراموش نہ کر سکا۔ برطانوی ناظمِ جنگ ہنری ڈنڈاس نے نپولین کے مقصد کو سکندر کے مقصد سے تشبیہ دی تھی۔ بلاشبہ برطانیہ نے مصر اور شام پر نپولین کے حملوں کو ناکام بنا دیا تھا مگر تأثر پھر بھی قائم رہا۔ روس کے پال اوّل نے بھی فرانس کے ساتھ مل کر ہندوستان پر حملہ کا منصوبہ بنایا تھا۔ ایک روسی فوج نے بخارا اور خیوا کے راستے پیش قدمی کر لی تھی۔ اور فرانسیسی فوج کو میسّنا Massena کے زیرِ کمان دریائے ڈینیوب کو پار کر کے ٹاگن راگ، پھر وہاں سے ڈان اور والگا سے ہوتے ہوئے استراخان میں روسی فوج کے ساتھ مل کر ہرات اور قندھار کی طرف بڑھنا تھا(۱۹)۔ اس کا ڈان کاسک (Doncossack) لشکر واقعی آگے بڑھ رہا تھا کہ کسی نے زار کو قتل کر دیا۔ ان حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے نپولین کے 7-1806ء کے سیاسی جارحانہ حملہ کو کچھ زیادہ ہی اہمیت دی گئی۔

1805ء میں شاہِ ایران کو روسیوں کے ہاتھوں کئی بار شکست ہوئی۔ روس کے خلاف انگلینڈ نے اس کی مطلق امداد نہیں کی۔ اس لیے شاہِ ایران نے بوناپارٹ کی طرف رجوع کیا۔ ایک ایرانی سفیر فرانس کے ساتھ صلح کی بات چیت کے لیے یورپ بھیجا گیا۔ مئی 1806ء میں نپولین نے جنرل ہورس سیبسٹیانی (Horace Sebastiani) کو قسطنطنیہ میں سفیر مقرر کیا۔ مئی 1807ء میں فینکنسٹن (Finkenstein) کے صلح نامہ پر فرانس اور ایران کے نمائندوں کے دستخط ہوئے۔ اس صلح نامہ کی تین شرائط کے مطابق ایران نے فرانس کو ہندوستان پر حملہ کرنے کے لیے سہولتیں مہیا کرنا تسلیم کیا تھا۔ ایک فرانسیسی فوجی مشن ایران بھیجا گیا۔ ترکی برطانیہ کے خلاف محاذ میں شامل نہ ہوا لیکن اس میں شبہ نہیں کہ 1807ء کے وسط تک انگلینڈ کے بجائے فرانس مشرقِ قریب اور مشرقِ وسطیٰ میں زیادہ عزیز خیال کیا گیا (۲۰)۔

ان حالات میں سلطنتِ برطانیہ نے ایران اور فرانس کے خلاف کابل کے حکمرانوں سے دوستانہ تعلقات قائم کیے۔ 1808ء میں میلکم مشن کو ایران میں ناکامی ہوئی۔ لیکن سر ہارفورڈ جونز (Sir Harford Jones) کو جو انگلینڈ سے سفیر بن کر گئے تھے

کامیابی نصیب ہوئی۔ انہوں نے بگڑتے ہوئے حالات کو سنبھال لیا۔ جولائی 1807ء میں نیپولین اور زار الیگزینڈر اوّل میں ٹلسیٹ (Tilsit) کا عہد نامہ طے پایا۔ جس کی وجہ سے رنجیت سنگھ اور انگریزوں نے بھی آپس میں تیزی سے دوستانہ تعلقات بڑھانا شروع کر دیے۔ اگرچہ اس عہد نامہ کی رو سے مٹکاف مشن کو لاہور جانا پڑا لیکن اسی کے باعث رنجیت سنگھ کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ معاہدہ ٹلسیٹ (Tilsit) کے باعث ایران اور ترکی دونوں کی نظروں میں نیپولین کا وقار بحیثیت ایک سچے ساتھی کے ختم ہو گیا۔ ان کا سب سے بڑا دشمن روس تھا۔ حالات نے اب ایسا موڑ لیا کہ انگریزوں اور ایرانیوں کے درمیان اور انگریزوں اور ترکوں کے درمیان سمجھوتہ کا امکان پیدا ہو گیا۔ جنوری 1809ء میں انگریزوں اور ترکوں میں ڈارڈنلز (Dardanelles) کا عہد نامہ ہوا۔ اور اسی سال مارچ میں ایرانیوں کے ساتھ بھی انگریزوں کا معاہدہ ہو گیا۔ 1808ء کے وسط میں اسپین میں بغاوت شروع ہو گئی۔ 1808ء کے آخری مہینوں میں مشرقِ قریب اور مشرقِ وسطیٰ میں حالات اس حد تک سدھر گئے کہ گورنر جنرل نے محسوس کیا۔ اب لاہور کے حکمران کو منانے کی ضرورت نہیں۔

25 جون 1808ء کو مٹکاف کو بطور سفیر لاہور بھیج گیا۔ چیف سکریٹری نے اس کو لکھا کہ "فرانسیسی سرکار اپنے مخالفانہ تدبیروں کو پورا کرنے کے لیے قدم اٹھائے گی۔ اس کے متعلق کچھ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا۔ اگر لاہور میں کوئی فرانسیسی ایجنٹ موجود نہ ہو تو مٹکاف کو یہ اعلان کرنا ہو گا کہ جو دوستانہ تعلقات 1805ء میں لارڈ لیک نے قایم کیے تھے وہ ان کو مزید بہتر بنانا چاہتا ہے۔ اس اعلان میں فرانس کے شہنشاہ کی غاصبانہ پالیسی کا ذکر کرتے ہوئے ایران اور فرانس کے مابین امکانی معاہدہ کا تذکرہ بھی کیا جانا چاہیے۔ اسے رنجیت سنگھ کو یہ مشورہ دینے کو کہا گیا کہ انگریزی فوج اس کی امداد کرے گی اور بوقتِ ضرورت اس کی رضامندی سے دریائے سندھ کے پار بھی جائے گی۔ اگر رنجیت سنگھ اس کا معاوضہ مانگے تو اس پر غور کرنے سے پہلے اس بات کو سمجھنا ہو گا کہ فرانسیسی حملہ کا اندیشہ کہاں تک درست ہے۔ رنجیت سنگھ نے یہ ضرور سوچا ہو گا کہ "انگریز اس کی دوستی کو لازمی سمجھتے ہیں تو وہ کیوں نہ اس کی قیمت وصول کرے۔"(21) اس بات چیت کے چلنے سے پہلے ہی رنجیت سنگھ نے فتوحات کا سلسلہ شروع کر دیا

اس نے ستلج پار کیا اور کھائی تک پہنچ گیا وہاں فرید کوٹ کے وکیل اس کے پاس آئے
اور اسے بتایا کہ کچھ عرصہ پہلے ہی دیوان محکم چند ان سے نذرانہ وصول کر چکا ہے لیکن
رنجیت سنگھ نے پوشیدہ طور پر سردار کرم سنگھ کو قلعہ پر قبضہ کرنے کا حکم دیا تھا چنانچہ
یکم اکتوبر 1808ء کو قبضہ کر لیا گیا اس کے بعد ریاست مالیر کوٹلہ کو باج گزار بنایا گیا۔
اور انبالہ کا الحاق بھی کر لیا گیا۔ تھانیسر کے سردار مہتاب سنگھ نے اطاعت قبول کر لی
نومبر 1808ء میں راجہ پٹیالہ نے اس کے ساتھ پگڑی بدلی تھی اور دونوں میں دوستی
کا معاہدہ تحریری طور پر طے پا چکا تھا۔ بیدی صاحب سنگھ نے جو گرو نانک کے خاندان
سے، اس زمانے میں وہاں موجود تھے اس عہدنامہ کو مقدس قرار دیا۔

اگست 1808ء میں لاہور جاتے ہوئے مٹکاف پٹیالہ میں رکا۔ پٹیالہ کے راجہ
صاحب سنگھ نے برٹش سفیر کو رنجیت سنگھ کے ڈر سے قلعہ کی چابیاں اس درخواست
کے ساتھ دینے کی پیش کش کی کہ بعد میں وہ چابیاں اسے بطور عطیہ انگریزی
سرکار کی طرف سے واپس کر دی جائیں۔ مٹکاف نے ایسا کرنے میں آنا کانی کی کیونکہ
انگریزی سرکار ستلج کے اس پار کی ریاستوں کے بارے میں اس وقت اپنی پالیسی کو
ملتوی کرنا ہی مناسب سمجھتی تھی۔ اگر فرانسیسی حملہ کی دھمکی صحیح ثابت ہوتی اور رنجیت
سنگھ انگریزوں سے اس شرط پر دوستی کرنے کی پیش کش کرتا کہ ستلج کے اس پار علاقے
اس کے حوالے کر دئے جائیں تو شاید انگریز جھک جاتے۔ یہ ہی باعث تھا کہ لاہور
جاتے ہوئے مٹکاف نے ستلج کے اس پار کی ریاستوں کو کسی قسم کا یقین نہیں دلایا۔
ستلج کے اس پار کے علاقوں پر تیسری مہم کے وقت رنجیت سنگھ نے مٹکاف کو ترغیب
دی کہ وہ لدھیانہ سے 25 میل دور جنوب مشرقی حد تک اس کے ساتھ رہے۔ لیکن
مٹکاف نے اس کے ساتھ آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ دسمبر 1808ء کے شروع میں
رنجیت سنگھ ستلج کے اس پار کی تیسری مہم سے واپس آیا۔ راجہ جسونت سنگھ اور
بھائی لال سنگھ بھی اس کے پیچھے پیچھے آئے۔ مٹکاف نے لکھا "انبالہ کی بدنصیب
رانی کے مقبوضات کا حصہ رنجیت سنگھ کے ہاتھوں سے لینے میں کسی کو شرم نہیں آئی"
راجہ صاحب سنگھ کے تحت ایک سردار سے علاقہ توہلان کا قبضہ حاصل کرنے کے لیے
بھائی لال سنگھ نے رنجیت سنگھ کی سپاہ کی بھی امداد کی۔ اس لیے اس میں کوئی

حیرانی کی بات نہ تھی کہ ان سرداروں کی خودغرضی اور باہمی جھگڑوں کے باعث رنجیت سنگھ اقتدار حاصل کرتا گیا۔(22)

10 دسمبر 1808ء کو مٹکاف نے رنجیت سنگھ کو ایک خط دیا جو گورنر جنرل کی طرف سے بھیجا گیا تھا اور دو دن کے بعد ایک اور نوٹ بھیجا ان خطوط میں اس بات پر بحث کی گئی تھی کہ " گورنر جنرل کو اس بات پر تعجب اور تشویش ہے کہ رنجیت سنگھ ان سرداروں کو اپنا مطیع بنانا چاہتا ہے جو ایک مدت سے شمالی ہندوستان کے حکمرانوں کے زیر سرپرستی تھے۔ مرہٹوں کی شکست کے بعد وہ تمام اختیارات انگریزوں کے ہاتھ میں آگئے تھے جو پہلے مرہٹہ قوم کو حاصل تھے۔ اس جنگ سے پیشتر لارڈ لیک کو ایک مراسلہ موصول ہوا تھا۔ اس میں انگریزی سلطنت اور اس کے مقبوضات کے بیچ دریائے ستلج کو سرحد مقرر کرنے کی تجویز تھی۔ اندریں حالات یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ یہ سردار حسب دستور انگریزی سرکار کے زیر سایہ ہیں اور رہیں گے۔ برٹش گورنمنٹ نے مہاراجہ کو ایک عظیم خطرے کی خبر دینے کے لیے ایک سفیر بھیجا۔ مگر مہاراجہ نے ان تجاویز کو اس اعتماد اور خوش دلی سے نہیں قبول کیا جس امید میں یہ تجاویز اس کے روبرو پیش کی گئی تھیں مہاراجہ نے اس کے جواب میں انگریزی حکومت سے یہ مانگ کی کہ اسے اپنے ملحقہ علاقوں کے سرداروں کو مطیع بنانے کی اجازت دی جائے۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ جواب کا انتظار کیے بغیر ہی رنجیت سنگھ اپنے ارادہ کو عملی جامہ پہنانے لگا۔ اس ضمن میں مہاراجہ نے اپنے خط میں یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ برٹش سرکار کی منظوری کے بغیر ستلج اور جمنا کے درمیان واقع علاقوں پر اسے حملہ کرنے کا کوئی حق نہیں۔ برٹش گورنمنٹ کی اجازت کے بغیر ان علاقوں پر (جو ستلج اور جمنا کے درمیان واقع تھے) مہاراجہ نے قبضہ کر لیا ہے۔ برٹش گورنمنٹ ان پر اس کا کوئی حق تسلیم نہیں کرتی تھی۔ گورنر جنرل نے یہ امید بھی ظاہر کی کہ اس دوران میں جن علاقوں پر مہاراجہ نے قبضہ کر لیا ہے وہ علاقے ان کے مالکوں کو سپرد کر دیے جائیں گے۔ اور مہاراجہ اپنی سلطنت کو ستلج کے دائیں کنارے تک ہی محدود رکھے گا۔ ان خدشات کے اظہار کے ساتھ ساتھ برٹش سرکار اس کی حکومت سے مخلصانہ اور خوش گوار تعلقات قائم رکھنے کی خواہش مند ہے۔" (23)

اس طرح مٹکاف مشن نے مہاراجہ کے ساتھ بات چیت کا دوسرا دور شروع کیا۔ رنجیت سنگھ برٹش حکومت کی تجویز سے فایدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ اس نے یہ سوچا کہ انگریز سرکار اس کی دوستی کی خواہاں ہے اس لیے زیادہ سے زیادہ مراعات حاصل کرنے کی کوشش کی جیسا کہ لیپل گرفن (Lepel griffin) کہتا ہے "مہاراجہ کی پالیسی کسی حد تک دانش مندی پر مبنی تھی۔ اور اس کی کامیابی کا کافی امکان تھا۔ لیکن اسی اثنا میں خفیہ اطلاعات کی بنا پر حکومت ہند کو معلوم ہوگیا کہ فرانسیسی حملہ کا خطرہ ٹل گیا ہے اسپین میں بغاوت ہوگئی ہے۔ سر آرتھر ولزلی نے فرانس کو رولیکا اور ومیرو کے مقامات پر شکست دے دی۔ انگلینڈ اور ترکی کے درمیان تعلقات بہتر ہوگئے ہیں۔ اور بالآخر دونوں نے جنوری 1809ء میں دوستانہ معاہدہ ڈارڈنیلز (Darda - nelles) پر دستخط کر دیے۔ اس سے حکومت ہند کی پالیسی میں تبدیلی آئی۔ روس اور فرانس کے خلاف (Anti. Gallican alliance) اتحاد کی چنداں ضرورت نہ رہی۔ برٹش سرکار اس بڑھتی ہوئی فوجی سکھ طاقت کو روکنا چاہتی تھی، جو اپنی سلطنت کو ستلج کے اس پار ہندوستانی سرحد تک کے علاقوں تک وسیع کرنا چاہتی تھی۔ اور جو دوستی کا دم بھرنے والے ان سرداروں کی جگہ لے گی جو اپنی حفاظت کے بدلے ممنون تھے"(24)

رنجیت سنگھ سیاسی حالات میں اس اچانک تبدیلی کے لیے تیار نہ تھا۔ سردار متھ سنگھ مشیر، بھودیال، فقیر عزیز الدین اور اس کا بھائی امام الدین مہاراجہ کی طرف بات چیت چلا رہے تھے۔ انہوں نے مشن کے اصلی مقصد کا موازنہ اب کئے گئے مطالبات سے کیا اس مشکل کو حل کرنے کا ایک درمیانی راستہ نکالا گیا کہ ستلج کے اس پار کی ریاستیں رنجیت سنگھ کو خراج دیں گی۔ مگر ان کی حفاظت کی ذمہ داری ایسٹ انڈیا کمپنی یعنی حکومت ہند پر ہوگی۔ البتہ خراج کی وصولی کے لیے مہاراجہ اپنی فوجیں ستلج کے اس پار نہیں لائے گا"(25) دہلی میں مقیم ریزیڈنٹ سیٹن نے ٹھیک یہ ہی حل نکالا تھا۔ حکومت ہند سیٹن کی اس تجویز کو پہلے ہی رد کر چکی تھی اور مٹکاف نے رنجیت سنگھ کو آگاہ کر دیا تھا کہ وہ کسی قسم کے سمجھوتے کے لیے تیار نہیں۔ مٹکاف سے بات چیت کے دوران رنجیت سنگھ نے کہا کہ یہ ایک غیر معمولی قسم کی دوستی ہے جو

مٹکاف قایم کرنے آیا ہے۔ اور مزید کہا "کہ دوستی میں الیسا زخم نہ لگاؤ جو دشمنی کا نتیجہ کہلائے"
(26) مٹکاف نے برٹش سرکار کو مطلع کیا کہ رنجیت سنگھ نے اپنی فوجوں کو جمع کرنے کا حکم دیا ہے
اور واقعات سے یہ ثبوت نہیں ملتا کہ رنجیت سنگھ حکومت ہند کے اس انتظام کو بغیر مخالفت
قبول کرے گا جو حکومت ہند پختہ عزم کے ساتھ قایم کرنا چاہتی ہے لہٰذا انگریزی سرکار اپنی
رائے پر ڈٹی رہی۔ اسے اپنی مضبوطی اور رنجیت سنگھ کی کمزوری کا علم تھا۔ مٹکاف جس
نے ہند کے راستہ میں 1831ء میں جاسوسی کرنے کے لیے برنز کی کڑی نکتہ چینی کی تھی
اس نے رنجیت سنگھ کے ماتحت کئی سرداروں سے ساز باز کرلی۔ فتح سنگھ آہلوالیہ
سدا کور اور کئی مرہٹے سردار رنجیت سنگھ کے خلاف سازش میں شامل ہو گئے۔ اس طرح
مٹکاف نے اپنی حکومت کے ہاتھ ان تاروں پر رکھ دیے جن کو بوقت ضرورت کھینچنے
سے رنجیت سنگھ کو سازش کے جال میں مضبوطی سے جکڑا جا سکتا تھا (27)۔ برٹش
حکومت نے اپنے ایلچی کے ذریعہ اعلان کیا کہ انگریزی فوج کا ایک دستہ ستلج کی طرف بڑھ
کر ایک فوجی چوکی قایم کرے گا۔ کیونکہ ستلج کے بائیں کنارے پر کچھ عرصہ سے رنجیت سنگھ
غالب ہوتا جا رہا تھا جیسا کہ مٹکاف نے دلیل دی تھی۔ انگریزی فوجی دستوں کی پیش قدمی
ہی اس کی ہوس ملک گیری کو روک سکتی تھی (28) انگریز حکومت کے مطالبات کو تقویت
دینے کے لیے سر ڈیوڈ آکٹر لونی (Sir David Ochterlony) کی تحویل میں،
انگریزی فوج 9 فروری کو لدھیانہ پہنچی۔ رنجیت سنگھ نے وہ تمام علاقے خالی کر دئے
جن پر اس نے کچھ عرصہ پہلے قبضہ کر لیا تھا۔ انبالہ سے فوجیں ہٹالیں، سانیوال سے بھی
دستبردار ہو گیا۔ البتہ فرید کوٹ پر اس بنا پر قابض رہنے کی کوشش کی کہ وہ علاقہ پہلے
کا مفتوحہ تھا۔ لیکن اس کا یہ دعویٰ بھی تسلیم نہیں کیا گیا اور کچھ عرصہ بعد اسے فرید کوٹ
بھی چھوڑنا پڑا۔ 2 راپریل 1809ء کو اس نے فرید کوٹ خالی کر دیا۔ انگریزی فوج جو
سینٹ لیجر (St. Leger) کے زیر کمان بھیجی گئی تھی۔ جنرل آکٹر لونی کو لدھیانہ
میں چھوڑ کر پیچھے ہٹ آئی اور جنگ کے اس دیو آکٹر لونی کا رتھ ستلج کے اس پار
کی ریاستوں میں دوڑتا رہا۔

بات چیت کے تیسرے یعنی آخری دور میں رنجیت سنگھ برٹش سرکار کے ساتھ صلح
کرنے کے لیے تیار ہو گیا تاکہ ستلج کے علاقہ میں انگریزی حکومت قایم ہونے کے نتائج سے

محفوظ رہنے۔(29) یہ بات قابلِ غور ہے کہ رنجیت سنگھ شروع ہی سے ایک قطعی صلح نامہ کے حق میں تھا جس میں تمام شرائط واضح ہوں اور کوئی بات عارضی یا مبہم نہ ہو۔ فرید کوٹ چھوڑنے سے پہلے بھی اس نے اسی بات پر زور دیا تھا کہ کسی مستقل معاہدہ کے بغیر کسی کو بھی اطمینان نہ ہوگا۔ مٹکاف نے بھی اپنی حکومت پر زور دیا کہ مستقل صلح نامہ تیار کیا جائے۔ اس نے چیف سکریٹری کو لکھا کہ انگریزی حکومت پنجاب میں بغاوت کے جذبہ کو بھڑکانا نہیں چاہتی۔ ان حالات میں یہ مناسب ہوگا کہ انگریزی حکومت اور رنجیت سنگھ کے تعلقات میں خلوص کے جذبہ سے کام لیا جایے تاکہ رنجیت سنگھ اس تاک میں نہ رہے کہ موقع ملتے ہی انگریزوں کے خلاف اعلانِ جنگ کر دے۔ اگر انگریز سرکار نے اس کی اس زوردار عرضداشت کو قبول نہ کیا تو قدرتی طور پر رنجیت سنگھ یہی سمجھے گا کہ انگریزی سرکار کا رویہ اس کی طرف غیر دوستانہ ہے، چاہے وہ اسے ہمارے مخالفانہ ارادوں کا ثبوت نہ سمجھے۔ مٹکاف نے یہ دلیل پیش کی کہ اگر اس کے دل سے کدورت دور کر دی گئی تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ وہ ہندوستان کی کسی اور طاقت کی بہ نسبت انگریزوں سے کم دوستانہ تعلقات رکھے۔ اس نے یہ بھی لکھا کہ برٹش سرکار کی موجودہ پالیسی کے پیشِ نظر جس کے مطابق دریائے ستلج کو حدِ فاصل مانا گیا ہے۔ پنجاب کے سردار اس کے بھی اتنے ہی ماتحت رہیں گے جتنے برٹش سرکار کے، چاہے انگریزوں کے ساتھ اس کی صلح ہو یا جنگ (30) ان ٹھوس دلیلوں سے متاثر ہو کر گورنمنٹ آف انڈیا نے اپریل 1808ء میں جو صلح نامہ طے کیا اس کی شرائط حسبِ ذیل ہیں۔

(1) لاہور سرکار کو ان حکمرانوں کے ساتھ مساوات کا درجہ دیا گیا جن پر حکومتِ ہند کی مہربانی اور کرم بیش از بیش ہے۔ نیز انگریزی سرکار نے یہ بھی تسلیم کر لیا کہ وہ دریائے راوی کے شمال کی طرف مہاراجہ کی ماتحت ریاستوں اور رعایا سے کوئی سروکار نہ رکھے گی۔ *

(2) دریائے ستلج کے بائیں کنارے کا وہ علاقہ جو مٹکاف کے آنے سے پہلے رنجیت سنگھ کے قبضہ میں تھا وہ بدستور اس کے پاس رہے گا۔ لیکن ستلج کے بائیں کنارے پر واقع ریاستوں میں اندرونِ ریاست ضرورت سے زیادہ فوجیں نہیں رکھے گا اور دوسری ریاستوں کے حقوق اور علاقوں پر چھاپہ مارنے کی کوشش نہیں کرے گا۔

(3) ان شرائط سے انحراف کی صورت میں اور دوستی کے دستور سے تجاوز کی صورت میں یہ عہد نامہ منسوخ سمجھا جائے گا۔ (31)

مورخ کرافٹ لکھتا ہے کہ صلح کی بات چیت کے دوران رنجیت سنگھ سنجیدگی سے انگریزوں کے ساتھ جنگ چھیڑنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ مٹکاف کے بیان سے بھی اس خدشہ کا حوالہ ملتا ہے کہ اس کی فوج کا ایک بہت بڑا حصہ کانگڑہ کی وادی میں اس کے بہترین جنرل محکم چند کے زیر کمان موجود تھا۔ اس کا توپ خانہ اور فوج بھی تیار تھی۔ اس کے علاوہ اس نے ان سرداروں کو بھی واپس بلا لیا تھا جو پچھلی جنگ کے بعد اپنے گھروں کو چلے گئے تھے۔ اس نے نئی بھرتی کا حکم بھی جاری کر دیا۔ گولہ بارود اور اسلحہ تیار کرایا اور امرتسر میں ایک نئے قلعے کی تعمیر کو مکمل کیا۔ رنجیت سنگھ کو شاید اندیشہ تھا کہ ستلج پر فوجی اڈوں کا قیام، لاہور کی تیاری کا پیش خیمہ ہے اور شاید وہ اپنی شکست کو قابل قدر بنانے کی تیاری میں مصروف تھا۔ محکم چند کانگڑہ کی پہاڑیوں سے ہوشیار پور بجواڑہ کی طرف بڑھا۔ اس کے بعد ستلج کے کنارے پھلور گھاٹ کی طرف کوچ کیا۔ کچھ عرصہ کے لیے تو مٹکاف کا رابطہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقبوضات سے ٹوٹ گیا اور مٹکاف نے چیف سکریٹری کو مطلع کیا کہ حالات اور واقعات سے کچھ ایسا اندازہ ہوتا ہے کہ رنجیت سنگھ دشمنی پر تلا ہوا تھا۔ (33) انہیں دنوں کچھ دوسری طاقتیں بھی برٹش سرکار سے منحرف ہو کر اس کی دوستی اور اس کے ساتھ اتحاد کی خواہاں بن گئیں۔ گور دیال مسر جس پر سندھیا کے ایجنٹ ہونے کا شک تھا لاہور آیا اور سندھیا کی طرف سے امداد کی پیش کش کی۔ انگریزی حکومت کی جاسوسی کا ہوں سے وہ نہ بچ سکا لہٰذا گور دیال لاہور سے چلا گیا۔ محکم چند نے بھی سندھیا کے وزیر اعظم سارجی راؤ گھاٹگے سے خط و کتابت کی کوشش کی۔ لاہور کا ایک وکیل اندر دیو اور محکم چند کا وکیل اپریل 1809ء میں سندھیا کے علاقے میں موجود تھے انہیں دنوں امیر

---

* "اور برعکس اس کے راجہ اس دریا کے جنوب کے سکھ سرداروں پر اپنے حقوق اور ان کے معاملات میں دخل اندازی کے حق سے بھی دستبردار ہوتا ہے" کسی خاص اہمیت کا حامل نہ ہونے کے باعث اور دوسرے آرٹیکل (شرط صلح نامہ) کے پیش نظر حذف کر دیا گیا۔

خان کا ایک وکیل، بیگم سمرو کا ایک خط اور ہولکر کا ایک خط بھی لے کر لاہور آیا۔ سندھیا کے دربار میں مقیم ریزیڈنٹ لیفٹیننٹ ۔کلوز (R. Close) نے لکھا ہے کہ حالات سے اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ رنجیت سنگھ انگریزی حکومت کے جائز مطالبات کو بھی پورا کرنا نہیں چاہتا۔ اور صرف اسی مقصد کے لیے وہ جنوب کے حکمرانوں کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کر رہا ہے (34) رنجیت سنگھ نے برہمنوں کی مقرر کردہ ایک نیک ساعت میں جنگ چھیڑنے کی ابتدائی رسم بھی ادا کر دی تھی۔ (35)

لیکن آخری لمحہ میں رنجیت سنگھ جھک گیا اور انگریزوں کے مطالبات مان لیے۔ دریائے ستلج پر ایک انگریزی فوجی دستہ کے قیام کے لیے راضی ہو گیا۔ مٹکاف کے مٹھی بھر سپاہیوں کے ہاتھوں اکالیوں کے ایک بڑے جتھے کی شکست، انگریزی حکومت کا پختہ ارادہ، اس کا یہ احساسِ کمتری کہ اس وقت وہ انگریزوں سے لوہا لینے کے قابل نہیں۔ اس کا یہ اندیشہ کہ ستلج کے اس پار کے سکھ سردار اس نازک موقع کا فائدہ اٹھائیں گے اور ساتھ ہی یہ ہلکا احساس کہ اگر وہ جھک گیا تو بالآخر انگریزی حکومت ستلج پار کے اس کے مقبوضات میں دخل نہ دے گی۔ ان حالات نے اسے انگریزی حکومت کے آگے گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ مٹکاف نے درست کہا ہے کہ وہ (رنجیت سنگھ) خطرناک قدم اٹھانے کے لیے مشہور نہیں ہے۔ (36) رنجیت سنگھ کی یہ سیاسی ہار تھی، اپنے غرور اور گھمنڈ کو بالائے طاق رکھ کر اسے جھکنا پڑا۔ یورپ میں اس وقت جو حالات رونما ہوئے تھے ان سے اس کی لاعلمی اس کی اس خفت کا باعث بنی۔ جب ہم اس کی ناکامی کی داستان پڑھتے ہیں تو ہمیں یہ مثل یاد آتی ہے "کہ اگر تم اپنے مقاصد بزورِ شمشیر حاصل کرنا چاہتے ہو تو تمہیں مضبوط ہونا چاہیے اور اگر تم یہ مقاصد باہمی گفت و شنید سے حاصل کرنا چاہتے ہو تو تمہیں اور بھی مضبوط ہونا چاہیے۔"

دو فوجی طاقتوں کے درمیان اس قسم کے جھگڑوں میں تاریخ کا سہارا لینا دراصل بے معنی ہے۔ لیکن چونکہ دونوں دھڑے تاریخی بنیاد پر ہی ستلج کے اس پار کی ریاستوں پر اپنا حق جتا رہے تھے اس لیے اس سوال کی گہرائی میں جانا نامناسب نہ ہوگا۔ رنجیت سنگھ کا دعویٰ تھا کہ سکھ قوم کے سربراہ اور امرتسر اور لاہور کا حکمران ہونے کی حیثیت سے ستلج کے اس پار کی ریاستوں پر بھی اس کا حق فائق ہے۔ اس کے برعکس انگریزی

حکومت اس بات پر زور دیتی تھی کہ دریائے جمنا اور دریائے ستلج کے درمیان کا علاقہ
تاریخی طور پر صوبہ دہلی کا حصّہ تھا اور انگریزی سرکار کو اس پر حکمران ہونے کا حق مرہٹوں سے
ورثہ میں ملا تھا جو انگریزوں کے ہاتھوں پامال ہونے سے پہلے شمالی ہندوستان پر چھائے
ہوئے تھے۔ مغل انڈیا کے جغرافیہ کے مطابق ستلج کے اس پار کا علاقہ پنجاب میں شامل
نہ تھا لیکن 1754ء اور 1761ء کے درمیان سرہند عملی طور پر مغل حکومت کے
ماتحت نہیں رہا۔ 1756ء میں احمد شاہ ابدالی نے عبدالصمد خان شہبت لگاری کو سرہند
کا گورنر مقرر کیا تھا اس کے بعد زین خان اسی عہدہ پر تعینات ہوا۔ 1763ء میں
سکھوں نے زین خان کو شکست دی، اسے موت کے گھاٹ اتار دیا اور سرہند لے کر
اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ سرہند کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد سلطنت کے
اس حصّہ پر جس کا دارالخلافہ سرہند تھا مغل شہنشاہیت کے تسلّط کا آخری نشان
بھی مٹ گیا (37) 1784ء اور 1794ء کے درمیان مہاداجی سندھیا ستلج کے اس
پار کی سکھ ریاستوں پر حکومت کرنے کے حق کو پوری طرح سے ثابت نہ کر سکا۔ اس کے
جانشین دولت راؤ نے بھی 1800ء اور 1802ء کے درمیان اپنے ایجنٹ پیرن
(Perron) کی معرفت ایک بار اس بات کی کوشش کی لیکن جیسا کہ بتایا جا چکا
ہے کہ یہ کوشش اتنی مبہم اور غیر واضح تھی کہ قطعی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس کے
برعکس رنجیت سنگھ یہ دعویٰ کر سکتا تھا کہ مانجھا کے سکھوں کی مانند مالوہ کے سکھ بھی
"خالصہ" کامن ویلتھ کا ایک حصّہ تھے اور انہیں اس سے الگ ہونے اور کسی دوسری
حکومت کو سربراہی قبول کرنے کا کوئی حق نہ تھا۔ "رنجیت سنگھ ترقی پذیر اس قوم
کو ایک منظم ریاست میں ڈھالنے کی کوشش کر رہا تھا" (38) اس کا ہر اقدام ہمیشہ
خالصہ کے نام پر ہوتا تھا۔ رنجیت سنگھ اور انگریزی سرکار کے متضاد دعوے اصولی طور
پر متحد سکھ قوم میں پھوٹ ڈالنے کا باعث بن سکتے تھے۔ ایک متحد فوجی سکھ حکومت کے
ارتقا میں رنجیت سنگھ کی ناکامی کا مقابلہ یورپ اور امریکہ کی دو عظیم کامیابیوں سے
کرنے کو جی چاہتا ہے۔ اگر آسٹریا جنوب کی جرمن ریاستوں پر قابض ہو جاتا تو جرمنی کی
تاریخ میں بسمارک ازم (Bismarkism) کی ناکامی کا تذکرہ ہوتا اسی طرح
جنرل لی (Lee) کی کامیابی نے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی عظیم فیڈریشن کو ختم

کردیا۔ چھوٹے پیمانہ پر رنجیت سنگھ عملی طور پر ناکام بسمارک اور لنکن دونوں کا مجموعہ ہے۔ ستلج کے اس پار کی ریاستوں کو شامل کرنے میں رنجیت سنگھ کی ناکامی سکھ فوجی نیشنل ازم (قومیت) کے لیے سانحہ تھا۔ اور انگریزی حکومت کی امداد سے ستلج کے اس پار کے سکھوں کی کامیابی نے گرد گوبند سنگھ کی اس عظیم قوم کی تخلیق میں تفرقہ ڈال دیا۔

رنجیت سنگھ کا قصور، ملتان اور پہاڑی ریاستوں کے ساتھ آویزش کا ذکر پہلے کیا جاچکا ہے۔ 1807ء میں رنجیت سنگھ نے قصور پر قبضہ کرلیا۔ قصور سے تیس میل کے فاصلہ پر نوشہرہ کے مقام پر اس نے ایک فوج جمع کی اور پٹھانوں کے قلعہ کا محاصرہ کرلیا۔ دارالخلافہ کے پاس ہی پرانے زمانے کی نیم آزادانہ روایات رکھنے والے پٹھانوں کی اس بستی کے قیام کو مناسب نہیں سمجھا گیا۔ نظام الدین قتل کیا جاچکا تھا اور اس کے بھائی اور جانشین قطب الدین نے نظم ونسق سنبھال لیا تھا۔ اس نے چند روز کی لڑائی کے بعد ہتھیار ڈال دیے تھے۔ رنجیت سنگھ نے اس سے بڑی فراخدلی کا برتاؤ کیا اور اسے ایک گراں قدر جاگیر عطا کی۔ ستلج کے دونوں طرف اس کو علاقے دیے گئے۔ مٹکاف مشن کے دورے کے وقت یہ خان (قطب الدین) بھی رنجیت سنگھ کی فوج کے ہمراہ موجود تھا۔ 1825ء میں رنجیت سنگھ نے خان کو اس کی خدمات کے صلہ میں ممدوت کا علاقہ بھی بخش دیا لیکن بعد میں جب خان نے ستلج کے اس پار کے ایک سردار کی حیثیت سے انگریزوں کی سربراہی اور حفاظت میں آنا چاہا تو انگریزوں نے انکار کردیا کیونکہ وہ حاکم لاہور کا وفادار سمجھا جاتا تھا۔

1807ء میں رنجیت سنگھ نے ملتان کو سر کرنے کی کوشش کی اس وقت اسے یہ علم نہ تھا کہ ستلج کے اس پار کی ریاستوں کے خلاف مہم میں اسے بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑیگا۔ وہ اس جانب بڑے اطمینان سے قدم اٹھانا چاہتا تھا اور پہلے سے ہی سہمے ہوئے سرداروں کو ہر جگہ ہراساں نہیں کرنا چاہتا تھا تاہم ملتان کے حاکم کی طرف اپنی توجہ مبذول کرنی پڑی اور اس نے قصور کے لوگوں کو اس کے خلاف بھڑکایا تھا اور ان کی امداد کی تھی۔ شہر پر تو قبضہ ہوگیا مگر قلعہ میں وہ جما رہا۔ نواب بہاولپور کی کوششوں سے صلح ہوگئی اور ایک بھاری رقم کے عوض رنجیت سنگھ نے محاصرہ اٹھانا منظور کیا۔ رنجیت سنگھ جتنا مشرق کی طرف اپنے مقبوضات بڑھانے کا خواہاں تھا اتنا ہی شمال کی طرف اپنی سلطنت کو وسعت دینے کا آرزومند تھا۔ لگ بھگ اسی زمانہ میں اس نے پٹھان کوٹ

پر بھی قبضہ کر لیا۔ وہ جسروٹہ کی طرف بڑھا اور بسوہلی کے راجہ سے 8000 روپے سالانہ خراج لینا طے کیا اور تقریباً اتنی ہی رقم چمبہ کے راجہ پر ڈالی گئی۔ پھر اس نے شمال پنجاب میں کئی علاقے فتح کیے ان میں سے سب سے اہم سیالکوٹ تھا۔ سردار فتح سنگھ کی معیت میں اس نے اس قلعہ کو گھیر لیا۔ رنجیت سنگھ نے سیالکوٹ کے سردار جیون سنگھ سے مطالبہ کیا کہ وہ قلعہ اس کے حوالے کر دے اور دو تین گاؤں بطور جاگیر لے کر ان پر اکتفا کرے۔ جیون سنگھ نے یہ شرط ماننے سے انکار کر دیا اور گھمسان کی جنگ شروع ہو گئی۔ آس پاس کے دو تین قلعوں پر رنجیت سنگھ کا قبضہ ہو گیا۔ ان قلعوں کی اونچی فصیلوں پر توپیں نصب کر دی گئیں جن کا رُخ مرکزی قلعہ کی طرف تھا۔ آخر جیون سنگھ نے اطاعت قبول کر لی اور اس کو جاگیر دے دی گئی۔ شیخوپورہ پر بھی چڑھائی کی گئی اس کی چوکی کو بھی معمولی مقابلہ کے بعد چالاکی سے سر کر لیا گیا۔ متّرے ہمیں بتاتا ہے کہ کانگڑہ کی وادی میں رنجیت سنگھ کی سرگرمیوں سے دینا نگر پر چڑھائی کے لیے الگ فوج کی تعیناتی اور مذکورہ بالا پہاڑی سرداروں سے تحصیل مال گذاری کے سبب جو کنہیا مسل کے مطیع ہونے کے باعث ایسی دستبرد کا پہلے کبھی شکار نہیں ہوئے تھے۔ سدا کور بھڑک اٹھی اور اس طرح اختلافات اور سازشوں کی بنیاد پڑی۔ (۱۴)

کانگڑہ کا علاقہ جس کی راجدھانی نداؤں تھی ایک ہونہار اور قابل کٹوچ سردار سنسار چند کے قبضہ میں تھا۔ رنجیت سنگھ اس مضبوط پہاڑی قلعہ پر قبضہ کرنا ضروری سمجھتا تھا جہاں سے وہ راوی اور ستلج کے درمیان واقع پہاڑی ریاستوں پر اپنا تسلط جما سکتا تھا لیکن اس سے پہلے اسے سنسار چند اور گورکھوں سے نپٹنا ضروری تھا۔ سنسار چند پہلے ہی مشرقی ریاستوں پر حاوی ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے کاہلو کی پہاڑی ریاست پر حملہ کیا جس کے سردار نے تنگ آ کر گورکھوں سے مدد مانگی۔ سنسار چند کی ٹکر پہلے بھی دو ایک بار رنجیت سنگھ سے اس وقت ہوئی تھی جب اس نے ہوشیارپور اور بجواڑہ پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن چونکہ اس کی فوجیں آتشی ہتھیار یعنی گولہ بارود سے بے بہرہ تھیں اس لیے وہ اپنے جنوبی مقبوضات کو لاہور کے حملہ سے نہ بچا سکا۔ اس طرح یہ کٹوچ سردار سکھوں اور گورکھوں کے درمیان گھر گیا اور پہاڑی ریاستوں سے بھی اسے کسی امداد کی امید نہ تھی کیونکہ وہ کئی بار ان پر حملے کر چکا تھا۔ سنسار چند بری طرح سے

مصیبت میں پھنس گیا اس سے نکلنے کا اسے کوئی راستہ دکھائی نہ دیا۔

عہدنامہ امرتسر (اپریل ۱۸۰۹ء) کے تحت جب رنجیت سنگھ کی پیش قدمی مشرقی ریاستوں میں رک گئی تو اس نے اپنی توجہ کانگڑہ کی طرف مبذول کی لیکن کانگڑہ کی فتح کا احوال لکھنے سے پہلے گورکھوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کا ذکر ضروری ہے ستلج کے اس پار بارہ یا اٹھارہ رجواڑے تھے جو سب کے سب گورکھوں کے زیر تحت تھے ستلج کے اس پار کی ریاستوں پر اپنا تسلط پوری طرح قائم کرنے کے بعد گورکھوں نے دریا عبور کیا۔ (42) بہت سے پہاڑی سردار جو سنسار چند کی پالیسی سے مطمئن نہیں تھے، گورکھوں سے مل گیے۔ مئی 1806ء میں انھوں (گورکھوں) نے محال موری کے مقام پر سنسار چند کو شکست دی اور کانگڑہ کی طرف بڑھے اسی اثنا میں ستلج پر واقع ریاست بلاس پور کے ساتھ نامہ و پیام کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ سنسار چند نے ان گورکھوں کے خلاف مدد مانگی جو امر سنگھ تھاپا کے زیر کمان اس سے لڑ رہے تھے۔ رنجیت سنگھ نے اس شرط پر امداد دینا منظور کیا کہ کانگڑہ کا علاقہ اس کے حوالے کر دیا جائے۔ سنسار چند اس قربانی کے لیے تیار نہ تھا۔ ان دنوں جسونت راؤ ہولکر لارڈ لیک سے صلح کرنے کے بعد جوالا مکھی کے مقدس مندر کی یاترا (زیارت) پر آیا ہوا تھا اس حالت اضطراب میں سنسار چند نے اس سے بھی امداد کی درخواست کی لیکن ہولکر کے ساتھ کوئی تصفیہ نہ ہو سکا۔ بغیر امداد کے سنسار چند زیادہ عرصہ مقابلہ نہ کر سکا۔ گورکھوں اور کٹوچ سردار سنسار چند کی اس کشمکش کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے "پہاڑی علاقوں کی تاریخ میں ان مصیبت کے دنوں کی یاد ایک ناقابل فراموش واقعہ رہے گی۔ اسی زمانے سے کسی واقعہ کے اوقات کا شمار کرتے ہیں اور ہر بدبختی اور آفت کو مصیبت اور بلا کے اسی سرچشمہ سے منسوب کیا جاتا ہے۔ گورکھے اپنی کامیابی کو مستحکم بنانے میں لگ گئے اور کچھ علاقوں کو انہوں نے جیت لیا اور قابض ہو گئے تاہم کانگڑہ و دیگر کئی بڑے مضبوط قلعے کٹوچ سردار کی تحویل میں رہے۔ دشمن کے وسائل کو کمزور کرنے کے لیے ایک فریق دوسرے فریق کے مقبوضہ علاقہ میں لوٹ مار کرتا تھا۔ رعایا ہراساں ہو کر پڑوسی ریاستوں کی طرف بھاگ گئی۔ کچھ لوگوں نے ریاست چمبا میں اور کچھ نے جالندھر دوآب میں پناہ لی، کچھ پہاڑی سرداروں نے جو سنسار چند کے ظلم و تشدد سے تنگ تھے موقع دیکھ کر سر اٹھایا اور اس پھیلتی ہوئی بدنظمی کو اور ہوا دی مسلسل

تین سال تک یہ لاقانونیت کانگڑہ کی سرسبز و زرخیز وادی میں جاری رہی کھیتی باڑی کا نام و نشان نہ رہا۔ شہر اجاڑ ہو گئے اور جنگلی جانوروں کی آماج گاہ بن گئے یہاں تک کہ نداؤں کی گلی کوچوں میں شیرنیاں بچے جنتی تھیں۔(44)

ہر طرف سے پریشان اور مایوس ہو کر سنسار چند پھر ایک بار رنجیت سنگھ کی طرف مائل ہوا۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ وہ مٹکاف کے ساتھ بات چیت میں مصروف تھا۔ محکم چند کو اس کی امداد کے لیے کانگڑہ بھیجا گیا لیکن گورکھوں کے خلاف امداد دینے کے عوض فوری طور پر کانگڑہ کے قلعہ کا مطالبہ کیا گیا۔ سنسار چند نے یہ شرط پیش کی کہ پہلے گورکھوں کو شکست دے کر پہاڑی علاقوں سے باہر نکال دیا جائے اس کے بعد ہی کانگڑہ کا لین دین کیا جائے۔ اس وقت اس نے اپنے سب سے بڑے بیٹے کو بطور یرغمال دینے کی پیش کش کی لیکن محکم چند یا اس کا آقا مطمئن نہ ہوا۔(45) انہیں دنوں انگریزوں اور سکھوں کی باہمی بات چیت ایک نازک مرحلہ تک پہنچ چکی تھی۔ محکم چند اپنی فوج کے ساتھ جنوب کی طرف آیا، انگریزوں کے ساتھ عہد نامہ امرتسر طے ہو جانے کے بعد سکھ فوج پھر ایک بار کانگڑہ بھیجی گئی۔ جو کچھ ہوا اس کو خوش وقت رائے نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے "رنجیت سنگھ نے اِدھر عہد نامہ کیا اُدھر امر سنگھ کے ساتھ بھی معاہدہ کر لیا کہ وہ کانگڑہ کا قلعہ اس کے حوالے کر دے گا۔ اس طرح اسے اپنے اہل و عیال کو وہاں لے جانے کی اجازت مل گئی وہ اپنے پیچھے بھائی کو چار ماہ کی رسد دیکر چھوڑ گیا اس طرح اسے امید تھی کہ وہ دونوں دعوے داروں سے قلعہ کو بچائے گا۔(46) رنجیت سنگھ کو جب سنسار چند کی اس دو رنگی کا علم ہوا تو وہ آگ بگولا ہو گیا۔ رنجیت سنگھ دو مہینوں سے اس پہاڑی علاقے میں لڑ رہا تھا اور اس نے اس میں بہت روپیہ بھی صرف کیا تھا۔ سنسار چند کا بیٹا انورودھ چند، رنجیت سنگھ کی خدمت میں تھا۔ اس نے انورودھ چند کو گرفتار کر لیا اور اس سے ایک حکم نامہ لکھوا لیا کہ رنجیت سنگھ کا محل میں خیر مقدم کیا جائے اس طرح بلا روک ٹوک قلعہ کے پھاٹک تک اسے رسائی ہو گئی۔

اس طرح اگست ۱۸۰۹ء میں رنجیت سنگھ کانگڑہ پر قابض ہو گیا۔ کانگڑہ کا قلعہ فتح ہونے سے پہلے ہی امر سنگھ تھاپا نے رنجیت سنگھ سے گفت و شنید شروع کر دی تھی لیکن پہاڑی سرداروں کی امداد سے رنجیت سنگھ نے اس کی آمد و رفت کے سارے

راستے بند کر دیے۔ امر سنگھ کو بھاری نقصان اٹھا کر پیچھے ہٹنا پڑا اس نے اور بھی زیادہ پیچھے ہٹ جانے میں ہی اپنی عافیت دیکھی۔ کہا جاتا ہے کہ رنجیت سنگھ کو ایک لاکھ روپیہ تاوان دے کر ہی اسے پیچھے ہٹنے کے لیے راستہ ملا۔ دریائے ستلج کے دائیں کنارے پر واقع سارے مقبوضہ علاقوں کو چھوڑ کر اس نے دریا کو عبور کیا اور بائیں کنارے کی جانب چلا گیا۔

سنسار چند کی حیثیت اب صرف ایک فرماں بردار دست نگر کی سی تھی۔ اس کے علاقہ کے مالیہ کا تخمینہ چھ لاکھ روپے لگایا گیا تھا لیکن وصولی آٹھ لاکھ روپے کی ہوئی۔ اسے دو لاکھ روپے رنجیت سنگھ کو دینے پڑے۔ وہ ایک یورپین افسر اور کمپنی کے توپ خانے کے فراری جیکسن کے زیر نگرانی دو تربیت یافتہ فوجی دستے رکھتا تھا۔ (47)۔ ستلج پار کے علاقوں کے متعلق انگریزوں کی غیر مداخلت کی پالیسی سے جیکسن کو بہت رنج ہوا۔ انگریزی حکومت کے دستاویزوں سے ہمیں اس بات کا اندازہ بھی ہوتا ہے کہ انگریزوں کی حفاظت میں آنے کے لیے سنسار چند کتنا بے تاب تھا۔ ع٥

وادی کانگڑہ سے گورکھوں کے اخراج پر یہاں سکھوں کا دور دورہ ہو گیا۔ مشرق میں حکومتِ چین سے شکست کھا کر اور مغرب میں سکھوں سے پسپا ہو کر گورکھوں نے جنوب کا رخ کیا تاکہ ان علاقوں میں وہ اپنی جنگی صلاحیتوں کے جوہر دکھا سکیں۔ ان حالات کو انگریزی حکومت اور نیپال کے درمیان جنگ کا ذمہ دار ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ اگر گورکھے کانگڑہ کی وادی میں کامیاب ہو جاتے تو کشمیر تک سارے علاقے کو اپنے تسلط میں لینے سے انہیں کوئی نہیں روک سکتا تھا۔

ع٥۔ سیاسی کارروائی مورخہ ۱۷ مئی 1816ء نمبر ۹۵۔ اس نے انگریزی سرکار سے حفاظت کی درخواست کی ہے اور اس کی حمایت کا اعلان کیا ہے اور انگریزی حکومت کے مقاصد کے حصول کے لیے اپنے دس بارہ ہزار سپاہیوں کے ساتھ تیار کھڑا ہے۔ "کانگڑہ کے قلعہ سمیت اپنے سارے پہلے کے مقبوضات کو دوبارہ حاصل کرنا ہی میرا مقصود ہے۔ ساتھ ہی رعایا کو انصاف دینے کا کام بھی میرے ہی اختیار میں ہے۔ یہی میرا مقصد ہے" (سنسار چند)۔ سیاسی کارروائی 23 اکتوبر ۱۸۱۹ء نمبر ۱۵۱۔ "میں لگاتار دست بدعا ہوں کہ وہ مبارک دن جلد آئے اور مجھے (گورنر جنرل سے) انٹرویو (ملاقات) کی اجازت مل جائے۔ یہ ملاقات میری دائمی خوشی اور دنیاوی ترقی کا وسیلہ بن جائے گی"۔ (سنسار چند)

رنجیت سنگھ کو مشرق میں تو کامیابی ہوئی البتہ شمال میں وہ کامیاب نہ رہا۔ 1809ء تک اس نے قصور، سیالکوٹ، شیخوپورہ و دیگر کئی علاقوں کو فتح کر کے پنجاب میں اپنی سلطنت کو مستحکم کر لیا تھا۔ 1807ء میں رنجیت سنگھ نے دوسری بار ستلج کے اس پار کی ریاستوں پر حملہ کیا۔ سکھ فوج نے نارائن گڑھ کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ اسی اثنا میں رنجیت سنگھ کے ایک ہمراہی ہمدسالہ بوڑھے دتے وال (دلیوال) مسل کے تارا سنگھ گھیبیا کی موت واقع ہو گئی۔ رنجیت سنگھ نے اس کی بیوہ سے مخالفت کی وجہ سے اس کا سارا علاقہ ہڑپ کر لیا۔ عمدۃ التواریخ میں ہم پڑھتے ہیں کہ رنجیت سنگھ نے راہوں کا قلعہ اپنے معتبر سپہ سالار محکم چند کو عطا کر دیا تھا۔ یہ قلعہ تارا سنگھ گھیبیا کے علاقہ میں تھا اس طرح دلیوال مسل کا نام ونشان تک مٹ گیا۔ اس مسل کی سالانہ آمدنی تقریباً چار لاکھ تھی (48)۔ 1809ء میں رنجیت سنگھ نے ہریانہ اور اس کے گرد و نواح کا جالندھر دوآب کا علاقہ بگھیل سنگھ کروڑ سنگھ سے زبردستی لے لیا۔ بگھیل سنگھ اپنے زمانے میں ستلج کی اس پار کی ریاستوں کے معاملات پر بہت عرصہ تک چھایا رہا اس کی کوئی اولاد نرینہ نہ تھی۔ اس کی بیوائیں رام کور اور راج کور رنجیت سنگھ کا پرزور مقابلہ نہ کر سکیں۔ اس مسل کے اس پار کے مقبوضات کلیسا خاندان نے حاصل کر لیے تھے۔ رام کور اور راج کور کے قبضہ میں صرف چلونڈی کا علاقہ رہ گیا تھا۔

حاکم لاہور جسے 1801ء سے اس کے درباری پڑوسی سردار اور دوسری طاقتیں مہاراجہ کے لقب سے مخاطب کرتی تھیں، 1805ء میں اتنا طاقتور ہو گیا تھا کہ اپنے پرانے مشیر کار فتح سنگھ اور رانی سدا کور کے صلاح و مشورے کی پروا کئے بغیر اپنے حسب منشا کام کرنے لگا، اس نے رام گڑھیا مسل کے سردار جودھ سنگھ سے دوستانہ تعلقات قایم کر لیے اس لیے اس کے پرانے ساتھیوں کو بڑی مایوسی ہوئی۔ کنہیا مسل کے سرداروں کی جودھ سنگھ کے علاقہ پر حریصانہ نگاہیں تھیں۔ رنجیت سنگھ نے جودھ سنگھ کو یقین دلایا کہ وہ اس کے علاقوں پر آنچ نہ آنے دے گا ساتھ ہی اس نے امرتسر کے سابق سردار گورودت سنگھ کو ایک جاگیر دینا منظور کر لیا جو ان دنوں جودھ سنگھ کی حمایت میں تھا رام گڑھیا سردار جودھ سنگھ اس کے بعد ہمیشہ رنجیت سنگھ کی وفاداری کا دم بھرتا اور سچے دل سے اس کی حمایت کرتا رہا۔ رنجیت سنگھ تمام سکھ سرداروں میں اس کی بڑی

عزت کرتا تھا اور اسے "باباجی" کے نام سے مخاطب کرتا تھا۔(49)

سداکور پیچ و تاب کھاتی رہی اور فتح سنگھ بھی غیر مطمئن تھا۔ مسر بیلو دیال جس کو رنجیت سنگھ نے مٹکاف کے ساتھ بات چیت کرنے پر مامور کیا تھا، دراصل سردار فتح سنگھ کا ایک معتبر ملازم تھا۔ اس نے مٹکاف سے بات چیت میں اپنے آقا فتح سنگھ، اور اپنے لیے انگریزی حکومت سے مراعات حاصل کرنے کی کوشش کی (50)۔ سداکور نے جو پیغام مٹکاف کے نام بھیجا وہ بھی رنجیت سنگھ کے خلاف تھا۔ مٹکاف لکھتا ہے کہ "وہ کہتی ہے کہ میں (مٹکاف) نے جو تجاویز رنجیت سنگھ کے سامنے رکھی تھیں وہ رنجیت نے سداکور کو بتادی ہیں، ہمارے اس مقصد کو کہ ہم اپنی فوجوں کے گذرنے کے لیے فری (کھلا) راستہ اور ڈپو (فوجی اڈہ) قایم کرنے کے لیے مناسب قطعۂ اراضی پر قبضہ چاہتے ہیں۔ سمجھتی ہے اور اس کا یہ کہنا کہ اگر راجہ ان تجاویز کو مان لے تو ٹھیک ہے ورنہ چند دوسرے سردار ہم کو فوجی گذرگاہ دینے اور ہمارے ساتھ شامل ہونے کو تیار ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وہ اٹل گڑھ کا مضبوط قلعہ بھی ڈپو بنانے کے لیے ہمارے حوالہ کردے گی۔ اس کا صلہ صرف وہ اتنا چاہتی ہے کہ جو علاقے پہلے اس کے قبضہ میں تھے وہ اسے واپس مل جائیں"۔(51) 1809ء میں رنجیت سنگھ نے بغیر کسی جنگ کے انگریزوں کی جو شرائط مان لی تھیں اس کی سب سے بڑی وجہ شاید رنجیت سنگھ کے ساتھ ان سرداروں کی بے اطمینانی تھی۔ ایک طرح سے عہدنامہ امرتسر نے اس کی پوزیشن مضبوط کردی تھی کیوں کہ اب وہ انگریزوں کی مداخلت و مخالفت کے بغیر اپنے ملک گیری کے منصوبے کو باقاعدہ حملہ کرکے پورا کرسکتا تھا۔ مٹکاف نے بھی رنجیت سنگھ کی توجہ اسی فائدہ کی طرف دلائی تھی۔ جو انگریزوں کے مطالبات مان لینے سے اسے حاصل ہوجائے گا۔

1809ء میں کابل سے لوٹتے ہوئے الفنسٹن نے لکھا "تقریباً سارا پنجاب اس وقت رنجیت سنگھ کے قبضہ میں ہے۔ 1805ء میں رنجیت سنگھ دوسرے سرداروں کی طرح ایک معمولی سردار تھا۔ لیکن ہمارے پیٹھ موڑتے ہی اس نے پنجاب کے سارے سکھوں کی سلطنت حاصل کرلی (52)" یہ ایک بڑے قابل غیر ملکی شاہد کے تاثرات تھے۔ ایک طاقتور اور مقناطیسی قوت رکھنے والی شخصیت اب پنجاب کی

تاریخ کو تشکیل دینے لگی تھی۔ مسلوں کی تاریخ کا ایک خاص پہلو یہ تھا کہ مختلف مسلیں باہمی مخالفت اور دھڑے بندیوں میں مصروف رہتی تھیں۔ تنہازدوں اور چھوٹے موٹے جاگیرداروں میں باہمی اختلافات اور جھگڑے رہتے تھے۔ مگر اب ان کی جگہ ایک ایسے مستحکم ارادے والی شخصیت نے لے لی تھی جس کی کامیابیوں نے اپنے ساتھیوں کی طاقت کو جذب کر کے اس کامن ویلتھ پنتھ کے کھنڈرات پر ایک مطلق العنان شہنشاہیت کا جھنڈا لہرایا۔

اشارات

1- گرانڈ ڈف جلد سوم، صفحہ 306 کیمبرے ایڈیشن
2 - ایچیسن جلد ہشتم
3 - تاریخ شاہ شجاع۔ الیف 26۔ ہولکر شاہیچا۔ اتہاسا پنچے ساڈھنے دوئم۔ نمبر 72
4 - مٹکاف (Metcalfe) جلد اوّل۔ صفحہ 267
5 - ویڈ کا خط مورخہ یکم اگست 1827ء
6 - پی۔ آر۔ سی نہم، 49
7 - ایضاً صفحہ 30
8 - ایضاً صفحہ 34، 146
9 - ایضاً صفحہ 40
10- ایضاً صفحہ 64
11- ولزلی کے مراسلے (Owen)
12 - امیر خان کے سیمائرز، صفحہ 276
13 - کننگھم، صفحہ 130
14- مٹکاف کا مراسلہ مورخہ 22 اگست 1808ء و 30 جنوری نمبر 105
15- سردار برجی کا غیر شائع شدہ مسودہ " مالوہ کے لیے کلکتہ لاہور کا مقابلہ "

15 - ایضاً یہی ستلج پار کی دو مہموں کی بنیاد ہیں۔
16 - عمدۃ التواریخ - ظفرنامہ - مرّے کا بیان و پنجاب کے راجہ
17 - کننگھم صفحہ 134
18 - See. Cons - 30 جنوری - نمبر 105
19 - کیمبرج ماڈرن ہسٹری - نہم 47، 48
20 - میسو پوٹیمیا میں انگریزی رسوخ کی بنیاد (ذکی صالح) صفحہ 53
21 - مٹکاف (تھامیسن)
22 - ایضاً نمبر 94
23 - See. Cons 2 جنوری 1808ء نمبر 93
24 - کمانڈر انچیف کی تجاویز پر تحریری یادداشت جو 1808ء
25 - See. Cons 30 جنوری 1809ء نمبر 101
26 - ایضاً نمبر 150
27 - مٹکاف (تھامیسن)
28 - See. Cons 13 مارچ 1809ء نمبر 68
29 - ایضاً نمبر 45
30 - See. Cons 20 مارچ 1810ء نمبر 10
31 - ایچیسن جلد ہشتم (پانچواں ایڈیشن)
32 - لورکرافٹ کے سفرنامے اوّل نمبر 94
33 - See. Cons 30 جنوری 1809ء نمبر 114
34 - پی-آر-سی نمبر 182 12 اپریل 1809ء، جلد گیارہ
35 - Sec. Cons 13 مارچ 1806ء نمبر 63
36 - ایضاً نمبر 78
37 - لدھیانہ ڈسٹرکٹ گزیٹیئر صفحہ 296
38 - کننگھم صفحہ 133
39 - لاہور دربار صفحات 40-41 واڈے کا خط مٹکاف کے نام مورخہ 26 نومبر

1826ء

40- عمدۃ التواریخ صفحہ 64 اینڈ پرنسپ

41- پرنسپ (Prinsep)

42- تاریخ سکھاں الف 16

43- (محفوظ سکھ اور پہاڑی ریاستیں) (Fortescue)
Protected Sikh and Hill States

44- کانگڑہ ڈسٹرکٹ گزیٹیئر صفحہ 35

45- .Sec. Cons 13 مارچ، نمبر 45، پیرا 9

46- تاریخ سکھاں۔ الف 167 و پرنسپ

47۔ ایشیاٹک جرنل اٹھارہویں جلد

48- تاریخ سکھاں الف۔ 115

49- ایضاً الف 127

50- .Sec. Cons 13 مارچ 1809ء نمبر 43

51- ایضاً 6 فروری 1809ء نمبر 92

52- کابل I- صفحہ 111

53- فورسٹر سفرنامے (اوّل) صفحہ 219

تیسرا باب

فتوحات واستحکامِ سلطنت

(1810ء سے 1824ء تک)

عہدنامۂ امرتسر کی رو سے سکھ اپنی سلطنت کو مشرق کی طرف نہیں بڑھا سکتے تھے البتہ کابل کو ضرب پہنچا کر وہ اپنے علاقوں کو وسعت دے سکتے تھے۔ کشمیر، اٹک، پشاور، کوہاٹ، ٹانک، بنوں، ڈیرہ غازی خان، ڈیرہ اسمٰعیل خان پر ابھی تک شاہ کابل کی حکومت تھی۔ ملتان اور سندھ پر بھی کابل کو برائے نام سربراہی حاصل تھی۔ 1810ء سے 1826ء تک رنجیت سنگھ ان علاقوں کو فتح کرنے میں مصروف رہا۔ شاہ کابل کے خلاف فیصلہ کن لڑائیاں لڑیں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے پنجاب پر اپنی حکومت مضبوط کرنے کی کوشش کی۔ بارک زئی پٹھانوں نے جو ان دنوں افغانستان میں زوروں پر تھے، ڈٹ کر رنجیت سنگھ کا مقابلہ کیا۔ اس سے پہلے کبھی رنجیت سنگھ کو ایسے مقابلے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ 1810ء سے قبل ان کے افغانستان سے تعلقات پر تبصرہ ہی ان حالات کو واضح کرے گا۔

درانی حکومت آہستہ آہستہ طوائف الملوکی کا شکار ہوتی چلی گئی۔ شاہ زماں (1793ء سے 1800ء) کی کمزوری اور اس کے جانشین شاہ محمود (1800ء سے 1803ء) کی بے انتظامی اور کاہلی نے حکومت کے لیے لوگوں کے دلوں میں نفرت کا جذبہ بھر دیا۔ شاہ شجاع (1803ء سے 1809ء) شاہ محمود کو تخت سے ہٹانے میں کامیاب تو ہو گیا لیکن اپنی طاقت کو مستحکم نہ کر سکا۔ ان جھگڑوں سے فائدہ اٹھا کر دور دراز کے ہندوستانی علاقوں کے صوبے دار عملی طور پر حکومت کابل سے منحرف ہو گئے۔ رنجیت

سنگھ نے بھی حکومت کابل کی اس کمزوری کا فائدہ اٹھایا اور سندھ کے بائیں کنارے پر واقع اسلامی ریاستوں کو یکے بعد دیگرے فتح کر لیا۔

ایلفنسٹن (Elphinstone) مشن کی کابل سے واپسی کے فوراً بعد 1809ء میں نیلما کی لڑائی میں شاہ شجاع کو اپنے افغانی تخت سے محروم ہونا پڑا۔ اب شاہ شجاع نے پنجاب کی طرف پیش قدمی کی تاکہ کسی پردیسی حکومت سے امداد حاصل کرے۔ رنجیت سنگھ نے شاہ شجاع کے دلی منشا کو جاننا ضروری سمجھا کیونکہ اس موقع پر انگریزی حکومت پر سے اس کا اعتبار اٹھ گیا تھا اور اسے اندیشہ تھا کہ اپنے مفاد میں انگریز شاہ شجاع کو آلۂ کار بنالیں گے۔

مرّے (Murray) لکھتا ہے کہ رنجیت سنگھ نے خوشاب کے مقام پر شاہ شجاع سے ملاقات کی لیکن کنگھم کا کہنا ہے کہ دونوں کی ملاقات ساہیوال میں ہوئی۔ مرّے کا بیان اس لیے غلط ہے کہ شاہ شجاع نے اپنی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ وہ رنجیت سنگھ کو ساہیوال میں ملا تھا۔ شاہ شجاع نے اس ملاقات کے بارے میں لکھا ہے "رنجیت سنگھ نے مجھے پیش کش نذرانہ دیا۔ میں نے بھی اسے اپنی پسند کا تحفہ دیا۔ رنجیت سنگھ نے تجویز رکھی کہ ہم دونوں مل کر ملتان کو فتح کریں۔ اور وہ ملتان میرے حوالہ کر دے گا۔ لیکن مجھے ڈر تھا کہ اگر ملتان اس کے قبضہ میں آگیا تو اسے وہ اپنے پاس رکھے گا "(1) اس طرح شاہ شجاع سے رنجیت سنگھ کی بات چیت لاحاصل رہی۔

کشمیر کے گورنر عطا محمّد خان نے جو شاہ شجاع کے ایک پرانے وزیر کا بیٹا تھا۔ شاہ شجاع کو امداد کی پیش کش کی۔ اور اس کی امداد سے شاہ شجاع نے پشاور پر قبضہ کر لیا لیکن کچھ ہی عرصہ میں کابل کے وزیر فتح خان کے بھائی محمد عظیم خان نے اسے شکست دے کر پشاور سے نکال دیا۔ کئی اور ناکامیوں کے بعد شاہ شجاع اٹک کے گورنر جہاں داد خاں کے ہتھے چڑھ گیا جس نے اسے عطا محمّد خان کے پاس کشمیر بھیج دیا۔ یہاں اسے قیدی بنا کر کڑی نگرانی میں رکھا گیا۔ اسی دوران اس کے نابینا بھائی شاہ زمان نے اپنے اور اپنے بھائی شاہ شجاع کے خاندان کے لیے لاہور میں پناہ کی درخواست کی (2)۔

بارک زئیوں میں سے سب سے بڑا بھائی فتح خان شاہ شجاع کے سوتیلے بھائی

شاہ محمود کا وزیر تھا۔ فتح خان نے ہی شاہ زمان کو ہرا کر 1800ء میں شاہ محمود کو کابل کے تخت پر بٹھایا تھا۔ یہ فتح خان ہی تھا جس نے شاہ شجاع کو ہرا کر اسے دوبارہ 1809ء میں صاحب اقتدار بنایا۔ کابل کا یہ سب سے طاقتور وزیر بہت قابل، ہوشیار اور اقتدار پسند تھا۔ وہ سکھ حکمران رنجیت سنگھ کا کوئی نا اہل مدِ مقابل نہ تھا۔ 1812ء کے آخر میں وہ اس ارادہ سے پشاور آیا کہ عطا محمد خان اور جہاں داد خان دونوں بھائیوں کو سزا دے۔ انہوں نے کشمیر اور اٹک پر قبضہ تو کر لیا لیکن شاہ کابل سے اظہار وفاداری نہیں کیا۔ وہ چالاک وزیر اس بات سے بخوبی واقف تھا کہ اگر رنجیت سنگھ نے اس کی مخالفت کی تو وہ کشمیر پر ہرگز قبضہ نہ کر سکے گا۔ عطا محمد خان کے ساتھ رنجیت سنگھ کے تعاون کرنے کا امکان تھا۔ ایک طرف کشمیر گورنر کی مخالفت، دوسری طرف کابل کے وزیر سے نوک جھونک اور ادھر پہاڑی ریاستوں پر مکمل قبضہ نہ ہونے کے باعث حاکم لاہور نے اپنے آپ کو اتنا طاقتور نہیں سمجھا کہ اکیلے ہی کشمیر پر تسلّط قائم کر سکے اس لیے ان میں سے ہر ایک دوسرے سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ دراصل یہ چالاکی اور چالبازی کے درمیان ٹکر تھی۔ مُرّے کا بیان ہے کہ صلح کی گفتگو میں پہل رنجیت سنگھ نے کی لیکن عمدۃ التواریخ اور ظفر نامہ اس بات کے مظہر ہیں کہ شہزادہ کھڑک سنگھ کی شادی (فروری 1812ء) سے پہلے فتح خان کا ایک وکیل گوڈر مل رنجیت سنگھ کے پاس آیا اور مل کر کشمیر پر حملہ کرنے کی تجویز پیش کی۔ غرض بات چیت میں پہل کسی نے بھی کی ہو دونوں مصالحت پر آمادہ ہو گئے۔ رنجیت سنگھ کی اس مہم کا مقصد کوئی بھاری رقم وصول کرنا یا کسی جنگی یا سیاسی چال سے کشمیر پر تسلّط جمانا نہیں تھا بلکہ وہ مقامی حالات سے پوری طرح واقفیت حاصل کرنا چاہتا تھا تاکہ آیندہ موقع ملنے پر اس سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔ اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ کس طرح وہ شاہ شجاع سابق بادشاہ کو عطا محمد خان کی قید سے رہائی دلائے اور اپنی نگرانی میں رکھے۔ شاہ شجاع کی بیوی وفا بیگم لاہور میں پناہ گزیں تھیں، اس نے اپنے شوہر کی رہائی کے بدلے مشہورِ عالم کوہِ نور ہیرا رنجیت سنگھ کو دینے کا وعدہ کیا تھا (3) کیوں کہ فنڈ کی کمی کے باعث وہ تکلیف میں تھی۔ لاہور دربار کی طرف سے اسے چار ہزار روپے ماہوار دیے جانے لگے (4)۔ شاہ شجاع کے رہا کرنے پر کوہِ نور حاصل کرنے کا پختہ وعدہ اس دریا دلی کا باعث تھا۔

وزیر کابل فتح خان اور لاہور کے حکمران راجہ رنجیت سنگھ کی ملاقات روہتاس میں ہوئی (5) فتح خان کے ہمراہ اس کے اٹھارہ بھائی بھی تھے جو یہ چاہتے تھے کہ دوران ملاقات رنجیت سنگھ کو قتل کر دیا جائے، ان میں سے ایک نے اپنی خدمات اس مقصد کے لیے پیش کیں کہ اشارہ ملنے پر اس کا کام تمام کر دے گا (6) لیکن ایسا کرنے سے فتح خان کی فوری مشکلات حل نہیں ہو سکتی تھیں۔ وہ اپنی رسد اور دوسری ضروری اشیاء کے لیے خود کفیل اور مضبوط سکھ فوجی دستہ کی امداد کے بغیر کشمیر فتح نہیں کر سکتا تھا۔ سلطنت کابل بھی کشمیر کے وسایل کے بغیر اتنے دور دراز کے علاقہ میں کوئی لمبی مہم شروع نہیں کر سکتی تھی اس لیے وہ اس تجویز سے متفق نہ ہوا۔ اس میں اخلاقی اصول کا کوئی سوال نہ تھا۔ رنجیت سنگھ جیسے ٹھنڈے دماغ والا انسان شاید یہ بخوبی جانتا تھا حالات کی نزاکت کے پیش نظر اس پر حملہ کا امکان بہت کم ہے نہیں تو وہ حملہ کے تدارک کے لیے تیار ہو کر آتا۔ ہم جانتے ہیں کہ رنجیت سنگھ نے گورنر جنرل سے ملاقات کی تھی تو اس کے دل میں کتنے وسوسے پیدا ہوئے تھے۔ اگر نوجوان بارک زئی بھائی رنجیت سنگھ کی جان لینے کی کوشش کرتے تو افضل خان اور شیواجی کی ملاقات کی داستان کے ایک دفعہ پھر دوہرائے جانے کا امکان تھا۔

رنجیت سنگھ اور فتح خان کے درمیان اس سمجھوتے کو کئی مختلف رنگوں میں پیش کیا جاتا ہے۔ مُرے لکھتا ہے کہ رنجیت سنگھ نے محکم چند کی سرکردگی میں بارہ ہزار سپاہی بطور امداد فتح خان کو دینا منظور کیا (ویڈ صاحب بھی بارہ ہزار کی تائید کرتا ہے) اس کے علاوہ راجوری اور پیر پنجال سے گذرتے وقت افغان فوج کو تمام سہولتیں پہنچانے کا وعدہ بھی کیا۔ اس کے عوض اسے کشمیر کی لوٹ مار میں سے نو لاکھ روپے اور ملتان پر حملہ کرنے کے لیے ایک فوجی دستہ وزیر خان نے دینے کا وعدہ کیا۔ عمدۃ التواریخ میں اس سمجھوتے کا بیان ذرا مختلف ہے۔ چچھ کی لڑائی کے بعد صلح صفائی کے دوران افغانوں کے وکیل گوڈر مل کو رنجیت سنگھ نے بتایا کہ اگر وہ شرائط پوری کرنا چاہتے ہیں تو کشمیر کی آمدنی میں سے اسے ایک لاکھ روپے سالانہ دیئے جائیں۔ اور حسب وعدہ ملتان پر بھی اس کا قبضہ کرا دیا جائے۔ ان شرطوں کو پورا کرنے کے بعد ہی رنجیت سنگھ نے اٹک کا قلعہ فتح خان کو دینے کا اقرار کیا (7)۔ اپریل 1813ء میں جو خطر رنجیت سنگھ نے

فتح خان کو لکھا اس میں مہاراجہ نے خود ہی روہتاس گڑھ کے عہد نامہ کی مندرجہ ذیل تفصیل دی ہے۔

"ملتان کا قلعہ خالی کرا کے سرکارِ اعلیٰ (رنجیت سنگھ) کے حوالہ کر دیا جائے۔ کشمیر کے ایک تہائی حصّہ پر بھی اس کے تسلّط کو تسلیم کیا جائے اور عہد نامہ کی رُو سے کشمیر سے حاصل کئے گئے خزانہ، جائداد اور دیگر اشیاء میں سے بھی ایک تہائی سکھ حکومت کے حوالے کیا جائے (8)۔ سکھوں کے مطابق روہتاس گڑھ کے معاہدہ کی رُو سے فتح خان کو کشمیر سر کرنے میں امداد کے بدلے سکھوں کو اسے ملتان فتح کر کے دینا تھا۔ اور کشمیر کے مالِ غنیمت میں سے رنجیت سنگھ کو حصّہ دینے کے علاوہ کچھ مفتوحہ علاقے بھی حوالے کرنے تھے۔

محکم چند کے زیرِ کمان بارہ ہزار سکھ سپاہیوں نے افغانوں کے ساتھ مل کر کشمیر پر فتح حاصل کر لی۔ عطا محمد خان کو نکال دیا گیا۔ لیکن اس کے بعد فتح خان وعدہ کے مطابق مالِ غنیمت میں سے حصّہ دینے کو تیار نظر نہیں آیا۔ لاہور کی ایک رپورٹ کے مطابق تخمیناً چالیس لاکھ روپے نقد اور کچھ جواہرات ان کے حصّہ میں آئے تھے (9) آخر مایوس ہو کر سکھ سپاہ لوٹ آئی (10) حقیقت یہ ہے کہ چال بازی میں فتح خان نے رنجیت سنگھ کو مات دے دی۔ رنجیت سنگھ کو نہ تو مالِ غنیمت میں سے کچھ ملا اور نہ مفتوحہ علاقہ میں سے، حالانکہ اس نے مہم کا خرچہ بھی برداشت کیا تھا اور معاہدہ کی رو سے اپنے اقرار کو بخوبی نبھایا تھا۔ یہ بات قطعی ممکن نظر نہیں آتی کہ فتح خان کے زیرِ تحت افغانوں کی سخت مخالفت کے پیشِ نظر رنجیت سنگھ سارے کشمیر کو ہڑپ کرنا چاہتا تھا۔ اس جنگ کے ایک مرحلہ پر تو عطا محمد خان نے سکھوں کو یہ پیش کش کی تھی کہ وہ اپنا سارا روپیہ، زر و جواہرات لے کر ان کے ساتھ شامل ہو جائے گا۔ اگر وہ اس کی امداد کریں۔ محکم چند نے یہ پیش کش منظور نہیں کی بلکہ اپنا ڈیرہ کچھ دوری پر لے گیا۔ اس نے رنجیت سنگھ کو اس پیش کش کی اطلاع دی جس نے یقیناً اسے نامنظور کر دیا ہوگا (11) البتہ اس مہم کے ذریعہ سکھ حکمران کو کشمیر کے متعلق آسانی سے واقفیت ہو گئی۔ لاہور کے راجہ کے بہترین جرنیل کو جسے غالباً مستقبل میں کشمیر کی مہم سر کرنے کے لیے فوج کی کمان سنبھالنی تھی، مقامی حالات کا بخوبی علم ہو گیا۔ یہ واقفیت مستقبل میں اس کے لیے

بڑی کارآمد ثابت ہو سکتی تھی۔ دوسرے الفاظ میں حالات کا جائزہ بڑی کامیابی سے لیا گیا تھا۔ شاہ شجاع بھی محکم چند کے ہاتھ آگیا اور اس نے فتح خان کی پرکشش پیش کش کو ٹھکرا کر سکھوں کا ساتھ دینا منظور کیا (12) فتح خان شاہ شجاع کو آلۂ کار بنا کر افغان سلطنت کو دوبارہ تعمیر کرنا چاہتا تھا اور حصول مقصد کے بعد اس کا کام تمام کر دینے کا ارادہ رکھتا تھا۔ (13)

مرّے رقم طراز ہے کہ کشمیر پر چڑھائی سے پہلے ہی رنجیت سنگھ اٹک کے سردار جہاں داد خان سے ساز باز کر رہا تھا۔ فتح خان سے ملاقات کے بعد لاہور کے لیے روانگی سے پیشتر رنجیت سنگھ نے اپنی فوج کا ایک دستہ دیا سنگھ کے زیر کمان دیا جو دریائے سندھ کے اس پاس متعین تھا۔ فتح خان کی کامیابی اور عطا بھائی محمد خاں کے نکالے جانے کی خبر سن کر جہاں داد خان خوفزدہ ہو گیا اور اس نے رنجیت سنگھ کو پیغام بھیجا کہ صلح کی شرائط کرنے کے لیے اور قلعہ پر قبضہ کرنے کے لیے اپنے نمایندے بھیجے۔ عزیز الدین کو قبضہ لینے کے لیے بھیجا گیا۔ دیگر اشخاص بھی اس علاقہ پر تسلط مضبوط بنانے کے لیے اس کے ساتھ کیے۔ اس نے کشمیر کی مہم کے لیڈروں کو احکام بھیجے کہ اٹک میں طے شدہ کارروائی کے ظاہر ہونے سے پہلے ہی وہ لاہور پہنچ جائیں اور شاہ شجاع کو ہمراہ لائیں۔ ان کے چلے جانے کے بعد اٹک پر سکھوں کے قبضہ کا حال معلوم ہوا۔ وہ بہت بگڑا (14) اس کے برعکس مرّے کا یہ کہنا ہے کہ فتح خان نے اس غاصبانہ کارروائی پر بہت واویلا کیا اسی بنا پر اس نے اپنے آپ کو ان شرائط کو پورا کرنے سے آزاد سمجھا جن کی رو سے اس نے سکھوں سے امداد لی تھی۔ اور یہی سبب تھا کہ اس نے کشمیر میں حاصل کیے گئے مال غنیمت میں سے بھی سکھوں کو کوئی حصہ دیے بغیر انہیں چلتا کیا۔ (15)

سوال یہ ہے کہ فتح خان کو اٹک پر سکھوں کے قبضہ کا حال کشمیر سے محکم چند کی روانگی سے پہلے معلوم ہوا یا بعد میں "دوست محمد کی سوانح عمری" میں موہن لال رقم طراز ہے کہ سکھ سپہ سالار محکم چند نے وزیر فتح خان کو اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ غلام محمد خان کو اس کے ساتھ جانے کی اجازت دے اور غلام محمد ہی نے اپنے تیسرے بھائی جہان داد خان والئ اٹک کو اپنا قلعہ سکھ حکومت کے ہاتھ بیچ ڈالنے پر زور دیا۔ مرّے کا بیان موہن لال سے مختلف ہے۔ بہرحال میں عمدۃ التواریخ کی تفصیل کو زیادہ

قابلِ اعتبار سمجھتا ہوں کیونکہ اس کی تصدیق برٹش ریکارڈ سے بھی ہوتی ہے۔ جب فتح خان کو اٹک کے معاملات کا پتہ چلا تو اس نے اپنے ایک فوجی دستہ کو محکم چند کے زیر کمان واپس جاتی ہوئی سکھ فوج پر حملہ کرنے کے لیے بھیجا لیکن سکھ فوج نے اتنی تیزی کوچ کیا کہ فتح خان کی فوج ان کو نہ پا سکی (16)۔ محکم چند بارہ مولا، راجوری بھیرو کے راستہ لوٹ آیا۔

رنجیت سنگھ نے ایک لاکھ روپیہ کی معمولی قربانی کی بدولت اٹک حاصل کر لیا۔ اور اس مقبوضہ کی حفاظت میں لگ گیا۔ (17) اس سلسلہ میں یہ بتانا مناسب ہوگا کہ رنجیت سنگھ نے 3510 من غلہ، 439 من گولہ بارود، 70 عدد بندوقیں اور کنڈے 439 من کوہستانی نمک اٹک کے قلعہ میں پایا۔ (18) اس طرح رنجیت سنگھ نے اپنے اہم جنگی مقام کو گویا بہت ہی سستے داموں حاصل کر لیا۔ یہ سب مارچ 1812ء کی ابتدا میں ہوا تھا لیکن صورتِ حال جو پہلے ہی کافی پیچیدہ تھی جلد ہی نازک ہو گئی۔ وزیر فتح خان کے نائب دوست محمد خان، دلی بیگ خان اور صمد خان نے کشمیر سے لوٹتے ہوئے اٹک سے 24 کوس کے فاصلہ پر اپنے خیمے گاڑ دیے تاہم وہ اس سے آگے نہ بڑھ سکا۔ محمود شاہ کی فوجیں شہزادہ ایوب اور عباس کی سرکردگی میں دریائے اٹک کے دوسرے کنارے پر تھیں لیکن چونکہ کشتیاں رنجیت سنگھ کے آدمیوں کے قبضہ میں تھیں اس لیے وہ دریا عبور نہ کر سکے۔ حاکم لاہور کو یہ معلوم تھا کہ کڑی آزمائش کا وقت آ پہنچا ہے۔ سکھ سرداروں نے جب اسے مبارک باد دی، نذرانے پیش کئے تو اس نے یہ کہہ کر قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ جب تک وہ ملتان فتح نہیں کرتا کوئی نذرانہ نہیں لے گا۔ (19) اس سے شاید اس کا یہ منشا ہو کہ افغان خطرہ کے ٹل جانے کے بعد ہی وہ نذرانے قبول کرے گا۔

یہ الجھن گفت و شنید سے نہ سلجھ سکی۔ ادھر افغان بھی اتنے طاقتور نہ تھے کہ قلعہ کے اتنے قریب ہوتے ہوئے بھی اس کا محاصرہ کر سکیں۔ کیونکہ رنجیت سنگھ کی فوج بھی نواحی علاقوں میں موجود تھی اور حاکم لاہور اس نئے مفتوحہ قلعہ کو رسد کا زیادہ سے زیادہ سامان بھیج رہا تھا۔ مئی کا مہینہ آتے آتے جنگ کے بادل چھا گئے اور جلد ہی یہ طوفان پھٹ پڑا۔ وزیر کابل کا ایک بھائی دوست محمد خان 4000 گھوڑوں کی

معیت میں قلعہ کے گرد منڈلا رہا تھا۔اس نے قلعہ کے سلسلۂ رسل و رسائل کو جاری رکھنے کے لیے سکھ فوج کے ہراول دستے تیار کیے۔مئی مہینہ کے آخری دنوں میں ان کی افغان دستوں سے جھڑپیں ہوئیں۔اب دیوان محکم چند خود کمک لیکر روانہ ہوا۔ وہ جون کے شروع میں راولپنڈی پہنچا۔کچھ علاقوں پر افغان گھوڑ سپاہ چھائی ہوئی تھی ان علاقوں میں محکم چند کا پہنچنا بہت ضروری ہوگیا۔ فتح خان کے آدمیوں نے پہلے سے ہی حسن ابدال پر حملہ کر دیا تھا اور رام سنگھ کی زیر کمان سکھ فوج کی ایک ٹکڑی جو وہاں تعینات تھی شکست کھا گئی۔لیکن محکم چند نے اپنی شخصیت، احتیاط اور قوت کے بل پر حالات کا پانسہ پلٹ دیا۔اس کی رہنمائی میں فوج سرائے کالا سے حسن ابدال کی طرف بڑھی اور وسط جون میں فتح خان کی فوج سے صرف پانچ یا چھ کوس دور رہ گئی۔اب افغانوں کے خلاف جھڑپوں میں سکھوں کی جیت اس جنگ کا ایک نمایاں پہلو بن گئی۔آخر کار 28 جون 1813ء کو سکھوں نے ایک شاندار فیصلہ کن فتح حاصل کی ۔ع۵ اس فیصلہ کن معرکہ کا خاکہ ایک بینکر (ساہوکار) کے ایجنٹ نے ان الفاظ میں بہترین طور پر کھینچا ہے "اس مہینہ یعنی اساڑھ کی گیارہ تاریخ کی صبح کو محکم چند اور فوج کے کئی اور سردار جمع ہوئے اور اناج حاصل کرنے کے ارادہ سے اٹک کے قلعہ کی طرف بڑھے۔ دوسری طرف سردار فتح خان وزیر کا بھائی دوست محمد خان اور کئی دیگر سردار ڈیڑھ کوس کے فاصلہ پر باؤلی (کنواں) کے قریب تک پہنچ گئے۔ وہ میدان جنگ میں کودنے کے لیے تیار کھڑے دکھائی دے رہے تھے۔یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ درانیوں نے اچانک حملہ کر دیا لیکن ادھر سکھوں کی جانب سے اس قدر گولہ باری اور خوں ریزی

ع۵ عام طور پر 13 جولائی 1813ء اس جنگ کی صحیح تاریخ مانی جاتی ہے لیکن غیر ملکیوں کے بیانات اور تاریخ پر ہمعصر اخباری خطوط کو ترجیح دی جانی چاہیے کیونکہ ان خطوط کے اقتباسات ہمیں اس لڑائی کی صحیح تاریخ کے بارے میں بتاتے ہیں۔

لاہور : 23 جون ۔ سردار فتح خان کی فوجیں سرکار معلّٰی کے لشکر سے سات کوس کی دوری پر ہیں۔ 30 جون ۔ سرکار معلّٰی یعنی رنجیت سنگھ نے گرنتھ پرشاد سے ارداس کی اور شیرینی بانٹی۔ والئی ملتان کی طرف سے اس کے وکیل نے رنجیت سنگھ کو اس فتح پر مبارک باد کا خط پیش کیا۔ وہ لوگ

کی گئی کہ دشمن نے محسوس کرلیا کہ وہ زیادہ دیر تک جم کر مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ لہٰذا بھاگتے ہی بنی۔ افغان فوج کے اکثر سپاہی دریائے اٹک میں ڈوب گئے۔(20) حیوجل (Hugel) نے جو اس جنگ کی تفصیل دی ہے وہ بیان مندرجہ بالا سے ملتی جلتی ہے۔ وہ لکھتا ہے چچ کے میدان میں چھوٹی چھوٹی ندیوں کا جال بچھا ہوا ہے ان میں سے ایک تو اس جنگ کے باعث جو فتح خان اور رنجیت سنگھ کے درمیان ہوئی مشہور ہو گئی کیونکہ سپاہی اسی ندی کے کنارے کے ساتھ ساتھ سارا دن چلتے رہتے تھے۔ اسی ندی نے انہیں گرمی سے محفوظ اور تازہ دم رکھا تھا۔ اس عظیم فائدے ہی کی بدولت لڑائی کا میدان ان کے ہاتھ رہا۔"

ساہوکار (بینکر) رامانند کے ایجنٹ نے حسن باؤلی کا ذکر کیا ہے شاید یہ وہی چھوٹی سی ندی ہوگی جس کا تذکرہ حیوجل (Hugel) نے کیا ہے۔ چچ کا میدان کاشتکاری کے لیے بہت مشہور ہے۔ اس میں صرف ایک ندی چیل ہے۔ یہ جنوبی سرحد پر بہتی ہے اور ہٹی کے دلدل حضرو کے قریب سے نکلتی ہے۔ پھر اٹک کے شمال میں بیس میل کا فاصلہ طے کرکے دریائے سندھ میں جا ملتی ہے۔ حیوجل کا اشارہ غالباً ہارو ندی کی طرف نہیں ہو سکتا جو ہزارہ کی پہاڑیوں سے نکلتی ہے۔ فتح خان کی فوج نے غالباً حضرو میں ڈیرہ ڈال رکھا تھا۔ اس وقت حسن ابدال میں محکم چند کا کیمپ تھا۔ اٹک کے قلعہ کو سامان رسد مہیا کرنے کے لیے جب محکم چند آگے بڑھ رہا تھا تو سیداں ہٹیاں کے قریب ہی غالباً دونوں فوجوں میں مڈبھیڑ ہو گئی۔ سکھ فوج حضرو تک پہنچ گئی اور افغانوں کے ڈیرہ کو

(حاشیہ پچھلے صفحے سے آگے)
جو اس وقت دربار میں موجود تھے انھوں نے امید ظاہر کی کہ اس طرح کشمیر پر بھی جلد فتح حاصل ہوگی۔ حیدرآباد سندھ کے وکیل کے ساتھ بھی دریائے اٹک کے دوسرے کنارے پر واقع علاقوں پر کنٹرول کے بارے میں بات چیت ہوئی۔ سرکار معلیٰ نے فرمایا کہ محکم چند بڑا بہادر شخص ہے۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ دشمن کے پہنچتے ہی میدان جنگ میں کود پڑا اور فتح و نصرت حاصل کی۔

13 جولائی کے بعد کوئی بھی اخبار (خط) افغانوں پر کسی بھی عظیم فتح کے بارے میں ذکر نہیں کرتا جب کہ 5 جون سے لے کر 13 جولائی کے سارے خطوط میں اس حاصل کردہ فتح کا اکثر حوالہ دیا گیا ہے۔
لاہور۔ 8 جولائی۔ اس جنگ کی تفاصیل رام سنگھ تین ماہ تک بیان کرتا رہا۔

لوٹ لیا۔ اس لوٹ میں اٹھارہ من غلّہ ان کے ہاتھ لگا۔ اس میں حیرت نہیں کہ افغان فوج بھگدڑ کے باعث وہاں زیادہ دیر تک نہ ٹھہر سکی۔ یہ یاد رکھنا موجب دلچسپی ہوگا کہ اسی حضرو کے مقام پر 1008ء میں غزنی کے سلطان محمود نے ہندو راجاؤں کی مشترکہ فوجوں کو شکست دی تھی۔ دیوان امرناتھ دوست محمد کی بہادری کی داد دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ وہ بڑھتا ہوا سکھ توپ خانہ تک پہنچ گیا۔ دیوان امرناتھ کے مطابق دو ہزار افغان سپاہی مارے گئے تھے۔ 13 جولائی کو جو پیام رساں لاہور دربار میں پہنچے انہوں نے اطلاع دی کہ سردار فتح خان نے کنڈہ گراہ کے نزدیک ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔ اس نے ساتھیوں کی ہر طرح سے ہمت بڑھانے کی کوشش کی مگر افغان سپاہی فاقہ کشی سے اس قدر تنگ آگئے تھے کہ زیادہ عرصہ تک نہ ٹک سکے اور پشاور کی طرف کوچ کر رہے تھے۔ لہٰذا وزیر خود بھی اس طرف جانے پر مجبور ہو گیا۔ (21)

چچ کے میدان کی لڑائی کی اہمیت نظر انداز نہیں کی جاسکتی۔ ہیوجل لکھتا ہے "مسلمانوں کی طاقت ہندوستان میں گھٹ رہی تھی۔ اٹک کی معمولی لڑائی کے بعد آخری مسلمان فوجی دستوں کو سندھ پار بھگا دیا گیا۔ اس کی یہ رائے بالکل گمراہ کن ہے۔ کسی لڑائی کی اہمیت اس میں لڑنے والے سپاہیوں کی تعداد پر منحصر نہیں ہوتی۔ اگر فتح خان جیت جاتا تو اس کا نتیجہ کیا ہوتا۔ جھنگ اور سندھ ساگر دوآب کے مسلمان سردار یقیناً ایک بار پھر کابل کی اطاعت قبول کر لیتے اور قدرتی طور پر رنجیت سنگھ کی شکست پنجاب پر اس کے اقتدار کو کاری ضرب لگاتی۔ چچ کے میدان میں اگر فتح خان کامیاب ہو جاتا تو یقیناً ہندوستان میں اس کی فتوحات کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ کشمیر جیسے خوشحال ملک کی آمدنی، تالپور کے امیروں سے وصول ہونے والا خراج پشاور اور اٹک پر قبضہ متحدہ، افغانستان کی طاقت اور سکھوں پر اس کی شاندار جیت اس کی اتنی ہمت بڑھاتی کہ وہ احمد شاہ کی چھوٹی وراثت کو مکمل طور پر دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔ چچ کی لڑائی میں افغانوں کی فتح سکھ قوم کی تاریخ میں اتنی ہی اہم ہوتی جتنی کہ شمال میں پانی پت کی تیسری لڑائی مرہٹوں کی تاریخ میں اہم سمجھی جاتی ہے۔ اس وقت پنجاب میں رنجیت سنگھ کی طاقت بہت زیادہ مضبوط نہ تھی۔ یہ شکست اس کے لیے تباہ کن ہی ثابت ہوتی۔ سر چارلس مٹکاف جو دہلی میں مقیم برٹش ریزیڈنٹ

تھا۔ رنجیت سنگھ کا پرانا دوست بھی تھا اور مخالف بھی وہ اس کی اہمیت سے بے خبر نہ
تھا۔ اگر سوہن لال کی تحریر پر یقین کیا جائے تو اس نے رنجیت سنگھ کو ایک خط میں یہ
خواہش ظاہر کی تھی کہ اٹک فتح خاں کے حوالہ نہ کیا جائے بلکہ یہاں تک بھی خیال کیا جاتا
ہے کہ لڑائی کی صورت میں اس نے کچھ پلٹن رنجیت سنگھ کی امداد کے لیے بھیجنے کی پیش
کش بھی کی تھی۔ رنجیت سنگھ نے نہایت دوستانہ انداز میں اس کا شکریہ ادا کیا۔
سکھ حکمران رنجیت سنگھ کے لیے اور انگریزوں وسکھوں کے دوستانہ تعلقات کی ہمواری
کے لیے یہ ایک نیک فال تھی۔ سندھ کے مشرق میں افغانوں کی طاقت تقریباً ختم ہوگئی
تھی اور اب رنجیت سنگھ کو اس علاقہ پر اپنا اقتدار قایم کرنے کا موقع مل گیا۔ اٹک میں
کافی محافظ فوج رکھی گئی اور گرومکھ سنگھ دیوان سنگھ اور سربلند خان اس کی حفاظت
پر مامور ہوئے۔

سال 1813ء ابھی ختم ہونے کو تھا کہ رنجیت سنگھ نے سندھ کی طرف پیش قدمی
کی۔ فتح خان پشاور آیا اور دونوں حریف موقع کی گھات میں رہے۔ کہا جاتا ہے کہ فتح
خان کالا باغ گیا پھر وہاں سے ڈیرہ جات کی طرف روانہ ہوا۔ ڈیرہ غازی خان اور ڈیرہ
اسمٰعیل خان کے نوابوں نے اسے ملتان کے خلاف امداد دینے کا وعدہ کیا۔ نتیجہ یہ
ہوا کہ ملتان کا نواب گھبراگیا۔ اس نے اپنے وکیل غلام محمد کو رنجیت سنگھ کے پاس بھیجا۔
فتح خان کے دریائے سندھ کو عبور کرکے حملہ آور ہونے کی صورت میں رنجیت سنگھ نے
اسے امداد دینے کا وعدہ کیا۔ بہرحال کابل کے وزیر کی دھمکیوں نے کوئی عملی صورت
اختیار نہ کی۔ اس میں شک نہیں کہ وہ اپنا وقار پھر سے حاصل کرنے کے لیے بیتاب
تھا۔ درّانی سرداروں نے اس شکست کے لیے فتح خان کی کھلے دربار میں مذمت
کی تھی چونکہ صرف ترکی بہ ترکی جواب دینے سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوسکتا تھا اس
لیے وہ کوئی ایسا کارنامہ انجام دینا چاہتا تھا جس سے اس کا کھویا ہوا وقار پھر سے قایم
ہوجائے۔ اس لیے وہ دوبارہ ملتان پر تسلّط جمانا چاہتا تھا۔ لیکن انجام کار سکھوں سے
دوبارہ مقابلہ کرنے کے لیے ڈر کی وجہ سے اس نے یہ ارادہ ترک کردیا۔ یہاں تک کہا جاتا
ہے کہ شاہِ کابل اپنا کھویا ہوا اقتدار پھر قایم کرنے کے لیے اس قدر بیتاب تھا کہ بخارا
کے حکمران سے بھی اس نے سکھوں کے خلاف امداد مانگی۔(23)

لوٹ لیا۔ اس لوٹ میں اٹھارہ من غلّہ ان کے ہاتھ لگا۔ اس میں حیرت نہیں کہ افغان فوج بھکری کے باعث وہاں زیادہ دیر تک نہ ٹھہر سکی۔ یہ یاد رکھنا موجب دلچسپی ہوگا کہ اسی حضرو کے مقام پر 1008ء میں غزنی کے سلطان محمود نے ہندو راجاؤں کی مشترکہ فوجوں کو شکست دی تھی۔ دیوان امرناتھ دوست محمد کی بہادری کی داد دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ وہ بڑھتا ہوا سکھ توپ خانہ تک پہنچ گیا۔ دیوان امرناتھ کے مطابق دو ہزار افغان سپاہی مارے گئے تھے۔ 13 جولائی کو جو پیام رساں لاہور دربار میں پہنچے انہوں نے اطلاع دی کہ سردار فتح خان نے کنڈہ گڑھ کے نزدیک ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔ اس نے ساتھیوں کی ہر طرح سے ہمت بڑھانے کی کوشش کی مگر افغان سپاہی فاقہ کشی سے اس قدر تنگ آ گئے تھے کہ زیادہ عرصہ تک نہ ٹک سکے اور پشاور کی طرف کوچ کر رہے تھے۔ لہٰذا وزیر خود بھی اس طرف جانے پر مجبور ہو گیا۔ (21)

چچ کے میدان کی لڑائی کی اہمیت نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ ہیوجل لکھتا ہے "مسلمانوں کی طاقت ہندوستان میں گھٹ رہی تھی۔ اٹک کی معمولی لڑائی کے بعد آخری مسلمان فوجی دستوں کو سندھ پار بھگا دیا گیا۔ اس کی یہ رائے بالکل گمراہ کن ہے۔ کسی لڑائی کی اہمیت اس میں لڑنے والے سپاہیوں کی تعداد پر منحصر نہیں ہوتی۔ اگر فتح خان جیت جاتا تو اس کا نتیجہ کیا ہوتا۔ جھنگ اور سندھ ساگر دوآب کے مسلمان سردار یقیناً ایک بار پھر کابل کی اطاعت قبول کر لیتے اور قدرتی طور پر رنجیت سنگھ کی شکست پنجاب پر اس کے اقتدار کو کاری ضرب لگاتی۔ چچ کے میدان میں اگر فتح خان کامیاب ہو جاتا تو یقیناً ہندوستان میں اس کی فتوحات کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ کشمیر جیسے خوش حال ملک کی آمدنی، تالپور کے امیروں سے وصول ہونے والا خراج پشاور اور اٹک پر قبضۂ متحدہ، افغانستان کی طاقت اور سکھوں پر اس کی شاندار جیت اس کی اتنی اہمیت بڑھاتی کہ وہ احمد شاہ کی چھوٹی وراثت کو مکمل طور پر دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔ چچ کی لڑائی میں افغانوں کی فتح سکھ قوم کی تاریخ میں اتنی ہی اہم ہوتی جتنی کہ شمال میں پانی پت کی تیسری لڑائی مرہٹوں کی تاریخ میں اہم سمجھی جاتی ہے۔ اس وقت پنجاب میں رنجیت سنگھ کی طاقت بہت زیادہ مضبوط نہ تھی۔ یہ شکست اس کے لیے تباہ کن ہی ثابت ہوتی۔ سر چارلس مٹکاف جو دہلی میں مقیم برٹش ریزیڈنٹ

تھا۔ رنجیت سنگھ کا پرانا دوست بھی تھا اور مخالف بھی وہ اس کی اہمیت سے بے خبر نہ تھا۔ اگر سوہن لال کی تحریر پر یقین کیا جائے تو اس نے رنجیت سنگھ کو ایک خط میں یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ اٹک فتح خاں کے حوالہ نہ کیا جائے بلکہ یہاں تک بھی خیال کیا جاتا ہے کہ لڑائی کی صورت میں اس نے کچھ پلٹن رنجیت سنگھ کی امداد کے لیے بھیجنے کی پیش کش بھی کی تھی۔ رنجیت سنگھ نے نہایت دوستانہ انداز میں اس کا شکریہ ادا کیا۔

سکھ حکمران رنجیت سنگھ کے لیے اور انگریزوں و سکھوں کے دوستانہ تعلقات کی ہمواری کے لیے یہ ایک نیک فال تھی۔ سندھ کے مشرق میں افغانوں کی طاقت تقریباً ختم ہوگئی تھی اور اب رنجیت سنگھ کو اس علاقہ پر اپنا اقتدار قایم کرنے کا موقع مل گیا۔ اٹک میں کافی محافظ فوج رکھی گئی اور گرومکھ سنگھ دیوان سنگھ اور سربلند خان اس کی حفاظت پر مامور ہوئے۔

سال 1813ء ابھی ختم ہونے کو تھا کہ رنجیت سنگھ نے سندھ کی طرف پیش قدمی کی۔ فتح خان پشاور آیا اور دونوں حریف موقع کی گھات میں رہے۔ کہا جاتا ہے کہ فتح خان کالا باغ گیا پھر وہاں سے ڈیرہ جات کی طرف روانہ ہوا۔ ڈیرہ غازی خان اور ڈیرہ اسمٰعیل خان کے نوابوں نے اسے ملتان کے خلاف امداد دینے کا وعدہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملتان کا نواب گھبرا گیا۔ اس نے اپنے وکیل غلام محمد کو رنجیت سنگھ کے پاس بھیجا۔ فتح خان کے دریائے سندھ کو عبور کر کے حملہ آور ہونے کی صورت میں رنجیت سنگھ نے اسے امداد دینے کا وعدہ کیا۔ بہر حال کابل کے وزیر کی دھمکیوں نے کوئی عملی صورت اختیار نہ کی۔ اس میں شک نہیں کہ وہ اپنا وقار پھر سے حاصل کرنے کے لیے بیتاب تھا۔ درّانی سرداروں نے اس شکست کے لیے فتح خان کی کھلے دربار میں مذمت کی تھی چونکہ صرف ترکی بہ ترکی جواب دینے سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا تھا اس لئے وہ کوئی ایسا کارنامہ انجام دینا چاہتا تھا جس سے اس کا کھویا ہوا وقار پھر سے قایم ہو جائے۔ اس لیے وہ دوبارہ ملتان پر تسلّط جمانا چاہتا تھا۔ لیکن انجام کار سکھوں سے دوبارہ مقابلہ کرنے کے لیے ڈر کی وجہ سے اس نے یہ ارادہ ترک کر دیا۔ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ شاہ کابل اپنا کھویا ہوا اقتدار پھر قایم کرنے کے لیے اس قدر بیتاب تھا کہ بخارا کے حکمران سے بھی اس نے سکھوں کے خلاف امداد مانگی۔ (23)

لوٹ لیا۔ اس لوٹ میں اٹھارہ من غلّہ ان کے ہاتھ لگا۔ اس میں حیرت نہیں کہ افغان فوج بھکری کے باعث وہاں زیادہ دیر تک نہ ٹھہر سکی۔ یہ یاد رکھنا موجب دلچسپی ہوگا کہ اسی حضرو کے مقام پر 1008ء میں غزنی کے سلطان محمود نے ہندو راجاؤں کی مشترکہ فوجوں کو شکست دی تھی۔ دیوان امرناتھ دوست محمد کی بہادری کی داد دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ وہ بڑھتا ہوا سکھ توپ خانہ تک پہنچ گیا۔ دیوان امرناتھ کے مطابق دو ہزار افغان سپاہی مارے گئے تھے۔ 13 جولائی کو جو پیام رساں لاہور دربار میں پہنچے انہوں نے اطلاع دی کہ سردار فتح خان نے کنڈہ گڑھ کے نزدیک ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔ اس نے ساتھیوں کی ہر طرح سے ہمت بڑھانے کی کوشش کی مگر افغان سپاہی فاقہ کشی سے اس قدر تنگ آ گئے تھے کہ زیادہ عرصہ تک نہ ٹک سکے اور پشاور کی طرف کوچ کر رہے تھے۔ لہٰذا وزیر خود بھی اس طرف جانے پر مجبور ہو گیا۔ (21)

چچ کے میدان کی لڑائی کی اہمیت نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ ہیوجل لکھتا ہے "مسلمانوں کی طاقت ہندوستان میں گھٹ رہی تھی۔ اٹک کی معمولی لڑائی کے بعد آخری مسلمان فوجی دستوں کو سندھ پار بھگا دیا گیا۔ اس کی یہ رائے بالکل گمراہ کن ہے۔ کسی لڑائی کی اہمیت اس میں لڑنے والے سپاہیوں کی تعداد پر منحصر نہیں ہوتی۔ اگر فتح خان جیت جاتا تو اس کا نتیجہ کیا ہوتا۔ جھنگ اور سندھ ساگر دوآب کے مسلمان سردار یقیناً ایک بار پھر کابل کی اطاعت قبول کر لیتے اور قدرتی طور پر رنجیت سنگھ کی شکست پنجاب پر اس کے اقتدار کو کاری ضرب لگاتی۔ چچ کے میدان میں اگر فتح خان کامیاب ہو جاتا تو یقیناً ہندوستان میں اس کی فتوحات کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ کشمیر جیسے خوش حال ملک کی آمدنی، تالپور کے امیروں سے وصول ہونے والا خراج پشاور اور اٹک پر قبضہ متحدہ، افغانستان کی طاقت اور سکھوں پر اس کی شاندار جیت اس کی اتنی ہمت بڑھاتی کہ وہ احمد شاہ کی چھوٹی وراثت کو مکمل طور پر دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔ چچ کی لڑائی میں افغانوں کی فتح سکھ قوم کی تاریخ میں اتنی ہی اہم ہوتی جتنی کہ شمال میں پانی پت کی تیسری لڑائی مرہٹوں کی تاریخ میں اہم سمجھی جاتی ہے۔ اس وقت پنجاب میں رنجیت سنگھ کی طاقت بہت زیادہ مضبوط نہ تھی۔ یہ شکست اس کے لیے تباہ کن ہی ثابت ہوتی۔ سر چارلس مٹکاف جو دہلی میں مقیم برٹش ریزیڈنٹ

تھا۔ رنجیت سنگھ کا پرانا دوست بھی تھا اور مخالف بھی وہ اس کی اہمیت سے بے خبر نہ تھا۔ اگر سوہن لال کی تحریر پر یقین کیا جائے تو اس نے رنجیت سنگھ کو ایک خط میں یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ اٹک فتح خاں کے حوالے نہ کیا جائے بلکہ یہاں تک بھی خیال کیا جاتا ہے کہ لڑائی کی صورت میں اس نے کچھ پلٹن رنجیت سنگھ کی امداد کے لیے بھیجنے کی پیش کش بھی کی تھی۔ رنجیت سنگھ نے نہایت دوستانہ انداز میں اس کا شکریہ ادا کیا۔
سکھ حکمران رنجیت سنگھ کے لیے اور انگریزوں وسکھوں کے دوستانہ تعلقات کی ہمواری کے لیے یہ ایک نیک فال تھی۔ سندھ کے مشرق میں افغانوں کی طاقت تقریباً ختم ہو گئی تھی اور اب رنجیت سنگھ کو اس علاقہ پر اپنا اقتدار قایم کرنے کا موقع مل گیا۔ اٹک میں کافی محافظ فوج رکھی گئی اور گرومکھ سنگھ دیوان سنگھ اور سربلند خان اس کی حفاظت پر مامور ہوئے۔

سال 1813ء ابھی ختم ہونے کو تھا کہ رنجیت سنگھ نے سندھ کی طرف پیش قدمی کی۔ فتح خان پشاور آیا اور دونوں حریف موقع کی گھات میں رہے۔ کہا جاتا ہے کہ فتح خان کالا باغ گیا پھر وہاں سے ڈیرہ جات کی طرف روانہ ہوا۔ ڈیرہ غازی خان اور ڈیرہ اسمٰعیل خان کے نوابوں نے اسے ملتان کے خلاف امداد دینے کا وعدہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملتان کا نواب گھبرا گیا۔ اس نے اپنے وکیل غلام محمد کو رنجیت سنگھ کے پاس بھیجا۔ فتح خان کے دریائے سندھ کو عبور کر کے حملہ آور ہونے کی صورت میں رنجیت سنگھ نے اسے امداد دینے کا وعدہ کیا۔ بہر حال کابل کے وزیر کی دھمکیوں نے کوئی عملی صورت اختیار نہ کی۔ اس میں شک نہیں کہ وہ اپنا وقار پھر سے حاصل کرنے کے لیے بیتاب تھا۔ درانی سرداروں نے اس شکست کے لیے فتح خان کی کھلے دربار میں مذمت کی تھی چونکہ صرف ترکی بہ ترکی جواب دینے سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا تھا اس لئے وہ کوئی ایسا کارنامہ انجام دینا چاہتا تھا جس سے اس کا کھویا ہوا وقار پھر سے قایم ہو جائے۔ اس لیے وہ دوبارہ ملتان پر تسلّط جمانا چاہتا تھا۔ لیکن انجام کار سکھوں سے دوبارہ مقابلہ کرنے کے لیے ڈر کی وجہ سے اس نے یہ ارادہ ترک کر دیا۔ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ شاہ کابل اپنا کھویا ہوا اقتدار پھر قایم کرنے کے لیے اس قدر بیتاب تھا کہ بخارا کے حکمران سے بھی اس نے سکھوں کے خلاف امداد مانگی۔ (23)

1814ء میں رنجیت سنگھ نے کشمیر سر کرنے کی ناکام کوشش کی۔ اس وقت کشمیر کی حکومت محمد عظیم خان کے ہاتھ میں تھی۔ یہ مہم محکم چند کی سرکردگی میں نہ بھیجی جا سکی۔ کیونکہ وہ سخت بیمار تھا اس کی رہنمائی اور تجربہ کے بغیر یہ مہم ناکام رہی جن مشکلات اور اور خطرات سے اُس نے مہاراجہ کو آگاہ کیا تھا۔ اس کی قابلیت اور ہوشیاری کے بغیر ان کا تدارک نہ کیا جا سکا۔ محمد عظیم خان نے ہر گڑھی اور ہر اہم جنگی مقام پر اپنی حفاظتی فوجیں تعینات کر دیں اور 8000 پیدل اور گھوڑ سوار فوج فیصلہ کن جنگ لڑنے کے لیے اپنی تحویل میں رکھی۔ اس بات کا امکان تھا کہ فتح خان امب، دربند گھاٹ کے راستہ یا تور بیلہ کے مقام سے کشمیر میں داخل ہو جائے۔ اس لیے لاہور دربار کی طرف سے قلعہ اٹک کے محافظ کے نام یہ حکم صادر ہوا کہ وہ مظفر آباد گھاٹ کی حفاظت کرے۔[24]

جون کے وسط میں سکھ فوج راجوری پہنچ گئی۔ راجوری کے دغاباز راجہ اگر خان کی صلاح کے مطابق فوج کے دو ڈویژن بنائے گئے۔ بڑی فوج کو رنجیت سنگھ کی فوج کے زیر کمان پونچھ کے راستہ درّہ توش کے میدان کے ساتھ ساتھ کوچ کرنا تھا اور فوج کے دوسرے دستہ کو محکم چند کے پوتے رام دیال، دل سنگھ اور نامدار خان ٹھاکر کی زیر کمان بارہ مولا، ہری پورا اور شپیان (Shupiyan) کی طرف بڑھنا تھا۔ رام دیال کے دستہ نے درّہ پیر پنچال اور ہری پور پر قبضہ کر لیا۔ شپیان پر حملہ ناکام رہا افغان ڈٹ کر مقابلہ کر رہے تھے۔ سب سے بڑی بدقسمتی یہ تھی کہ بارش کے باعث سکھ فوجیں توپیں نہ چلا سکیں۔ تلواروں کی جنگ میں ایک ہیبت ناک جری خالصہ گھوڑ سوار جیون مل منشی اور سردار فتح سنگھ چاچی دونوں مارے گئے۔ انجام کار رام دیال کو پسپا ہونا پڑا اور اس نے کمک مانگی۔ جوں ہی رنجیت سنگھ کے زیر کمان بڑی فوج پونچھ پہنچی اسے بارش اور طوفان سے دوچار ہونا پڑا۔ رنجیت سنگھ منڈی سے ہوتے ہوئے درّہ توش میدان کی طرف بڑھا یہاں عظیم خان نے قدم جما رکھے تھے یہیں اسے رام دیال کے فوجی دستہ کے حالِ زار کا پتہ چلا۔ اور اس نے اپنے معتمد سپہ سالار کے ہونہار پوتے رام دیال کی امداد کے لیے رام سنگھ، دیوی دیال اور قطب الدین کی معیت میں جتنے زیادہ سے زیادہ سپاہی ممکن تھے بھیجے۔ سامانِ رسد اور سلسلۂ رسل و رسائل کی غیر یقینی حالت اور فوج میں کمی کے پیشِ نظر رنجیت سنگھ کے لیے

اب وہاں زیادہ عرصے ٹکنا مشکل ہوگیا۔ اچانک وہ پیچھے ہٹا، جس سے اس کو کافی نقصان اٹھانا پڑا۔ منڈی کی طرف پسپا ہو کر پونچھ سے ہوتا ہوا رنجیت سنگھ ماہ اگست کے وسط میں اپنے دارالخلافہ لاہور پہنچا۔ رام دیال کی فوج کو عظیم خان نے گھیر لیا تھا۔ لیکن اس کے دادا محکم چند سے دوستی کا لحاظ کر کے عظیم خان نے رام دیال کو جانے دیا امرناتھ کا کہنا ہے کہ رام دیال نے 2000 افغان سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور افغان فوج کو پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔ عظیم خاں اس سے خوفزدہ ہو کر رام دیال کو محکم چند کے ساتھ اپنی دوستی کا واسطہ دینے لگا۔ لاہور دربار کے لیے کچھ تحفے دیے اور ساتھ ہی ایک تحریری دستاویز کے ذریعہ اس کی سربراہی کو قبول کیا۔ اس پر رام دیال پیچھے ہٹ گیا۔ دراصل رام دیال نے کوئی عظیم فتح حاصل کی ہو اس کا امکان تو نہیں لیکن یہ بھی پورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ عظیم خاں جیسا النسان، محقق کمانڈر رام دیال کے دادا کے ساتھ دوستی کا لحاظ (جو ان حالات میں مشکوک تھی) کرتے ہوئے سکھ فوج کو اپنے چنگل سے اس طرح بچ کر کبھی نہ نکلنے دیتا۔ اس لیے حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ رام دیال نے وہاں اپنے قدم اتنی مضبوطی سے جما لیے تھے کہ اسے ہرانے یا ہٹانے کے لیے افغان فوج کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا اور قربانیاں بھی دینی پڑتیں۔ رام دیال بھی بڑی فوج کی واپسی کے بعد اپنے آپ کو بالکل غیر محفوظ سمجھتا تھا اس لیے دونوں فریق صلح کے خواہش مند تھے۔ اس کے علاوہ عظیم خان اور محکم چند کی دوستی کا لحاظ بھی تھا۔ کشمیر کی جنگ رنجیت سنگھ کے لیے بڑا مہنگا سودا ثابت ہوئی لاہور میں اس نے نجی طور پر محکم چند اور سدا کور کے ساتھ بات چیت میں کہا۔ "غدار بھائی رام سنگھ کی فوج کے باعث ہی کشمیر کا صوبہ اس کے ہاتھ نہ آسکا اور اس مہم میں لاکھوں روپے بھی برباد ہو گئے۔ علاوہ ازیں مخالفین کی نظر میں اُسے اس قدر بے عزتی اور ذلت اٹھانا پڑی۔"

بلاشبہ رام سنگھ کا اپنی فوج کے ساتھ بزدلی سے پیچھے ہٹنا ہی سکھ فوج کی پسپائی کا بہت بڑا سبب تھا لیکن رام دیال کی زیرِ سرکردگی فوج کی شاندار امداد اور کامیابی نے ترازو کے پلڑے برابر کر دیے۔ محکم چند اور سدا کور نے جواب دیا کہ یہ ایک بہت بڑی بدقسمتی تھی کہ مہاراجہ نے ان کے اس مشورے پر عمل نہیں کیا کہ مہاراجہ خود گجرات کے

شہر یا راجوری میں قیام پذیر رہیں اور صرف اپنی فوجوں کو لڑائی کے میدان میں آگے بھیجیں اس صورت میں اس کے رعب اور وقار سے تمام امور خوش اسلوبی سے انجام پاتے۔ انہوں نے ایک دفعہ پھر ماہ چیت میں (مارچ اپریل) کے مہینے میں کشمیر کو فتح کر لینے کا ذمہ لیا تھا۔ بشرطیکہ مہاراجہ ان پر بھروسہ کریں اور بھیا رام سنگھ کو اپنے حضور میں بلا کر مناسب سرزنش کریں۔ (25) لیکن محکم چند نومبر 1814ء میں ہی راہیٔ ملکِ عدم ہوا۔ اور کشمیر کی اگلی مہم پہاڑی سرداروں کو پوری طرح مطیع کر لینے تک ملتوی کرنا پڑی۔

1805ء اور 1806ء کی فوجی مہمیں کسی خاص اہمیت کی حامل نہیں۔ کشمیر میں ناکامی سے پہاڑی علاقوں میں اس کے اقتدار کو دھکا لگا۔ دینانگر کے مقام پر اس نے گورکھوں کو جو پہاڑی علاقوں میں بہترین سپاہی ثابت ہو سکتے تھے، جنگی تربیت دی۔ راجوری اور پونچھ کے سرداروں کو مطیع کرنا لازمی تھا۔ جن زمینداروں نے اس کی منڈیوں کو لوٹا تھا ان کو سبق سکھانا ضروری تھا۔ علاقائی باشندے پسپا ہوتی ہوئی سکھ فوج کی توپیں، بندوقیں، تلواریں اور دیگر جنگی ہتھیار لے گئے تھے۔ ان کو اس سرکشی کی سزا ابھی دینی تھی۔ نیپالی اس وقت انگریزی حکومت کے خلاف لڑ رہے تھے اور گورکھا سردار امر سنگھ تھاپا نے جس کی ملاقات رنجیت سنگھ سے کانگڑہ کی پہاڑیوں میں ہوئی تھی اس سے مدد چاہی مگر انگریزوں سے دوستانہ تعلقات کے پیشِ نظر رنجیت سنگھ نے معذوری ظاہر کی (26) بہرکیف انگریزوں کے ہاتھوں ان کی شکستِ فاش رنجیت سنگھ کے لیے مایوس کن تھی۔ گورکھے غریب تھے لیکن اعلیٰ درجے کے سپاہی تھے۔ اب وہ روزگار کی تلاش میں پنجاب آئے اور پھر سارے برٹش انڈیا میں پھیل گئے۔ رنجیت سنگھ پہلا شخص تھا جس نے تنخواہ پر گورکھوں کو بڑی تعداد میں اپنی فوج میں بھرتی کیا۔ "یہ تعجب کی بات ہے کہ گورکھے جو وسطی نیپال سے آکر انگریزی فوج میں بھرتی ہوئے تھے ابھی تک لاہوریے کے نام سے مشہور ہیں۔ شاید اس حقیقت کے پیشِ نظر کہ ان کے پیش رو پہلے پہل تلاش روزگار میں لاہور آئے تھے۔" (27)

پہاڑی سرداروں کو مطیع بنایا گیا۔ کشمیر پر حملے سے پہلے پیر پنجال کے درّہ پر پوری پوری نگرانی کا بندوبست کیا۔ منحرف نورپور کے راجہ نے سب سے زیادہ پریشان کیا اور آخر فرار ہو کر انگریزی علاقہ میں پناہ لی۔ سکھ حکمران رنجیت سنگھ کے دل میں ملتان کو

تسخیر کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لینے کی بڑی تمنا تھی۔ اس بات کو ملتان کا صوبے
دار اور لاہور کے درباری بخوبی جانتے تھے ۔ 1802ء اور 1807ء کی مہمیں فقط ابتدائی
جائزہ کی حیثیت رکھتی تھیں۔ بہر حال 1810ء میں ملتان پر مکمل فتح حاصل کرنے کے
لیے رنجیت سنگھ نے ایڑی چوٹی تک کا زور لگا دیا، مسلسل گولہ باری، سرنگیں بچھانا
اور دو بار اس کے بھرپور حملے ناکام رہے اور حاکم لاہور کو اس موقع پر (28) صرف ڈھائی
لاکھ روپے معاوضہ پر قناعت کرنی پڑی۔ اگلے سال اس نے شاہ شجاع کو ترغیب
دینے کی کوشش کی کہ وہ ملتان فتح کرنے میں اس کی مدد کرے لیکن وہ راضی نہ
ہوا۔ پھر رنجیت سنگھ نے فتح خان پر ڈورے ڈالنے شروع کیے اور پیش کش کی
کہ اگر فتح خان اس کی تمنا پوری کرنے میں اس کی مدد کرے گا تو رنجیت سنگھ اس کے
عوض کشمیر کی جنگ سر کرنے میں اس کا ساتھ دے گا۔ اس کا بھی کوئی فوری نتیجہ برآمد نہ ہوا
مہاراجہ دوسرے کاموں میں اتنا مصروف رہا کہ 1813ء سے 1815ء تک وہ اس
طرف توجہ نہ دے سکا۔ 1816ء میں اس نے یہ جدوجہد پھر شروع کی۔ پھولا سنگھ
اکالی کو ملتان پر حملہ کرنے کے لیے بھیجا گیا۔ اس کی زیر کمان جاں باز سپاہیوں کے ایک
جتھے نے قلعہ کی بیرونی فصیل پر قبضہ کر لیا تاہم مظفر خان مقابلے پر ڈٹا رہا آخر دیوان
بھوانی داس جس کی رہنمائی میں جاں باز دستے نے کامیابی حاصل کی تھی 80000
روپے لے کر پیچھے ہٹنے کو تیار ہو گیا۔ پھر بھی مظفر خاں شاید بھانپ گیا تھا کہ اب خطرہ
قریب سے قریب تر آ رہا ہے، انگریزوں نے اس کی مدد نہیں کی۔ افغان سردار فتح
خان سے امداد لینا اسے گوارا نہ تھا کیونکہ ایسا کرنے سے اسے اپنی آزادی کے چھن جانے
کا اندیشہ تھا۔ اب اسے صرف اپنے ساتھیوں کی بہادری اور قلعہ کی مضبوطی پر بھروسہ
تھا۔ پھر بھی جب 1817ء میں بھوانی داس اور رام دیال کے زیر کمان ایک اور فوج
ملتان بھیجی گئی تو اس نے ان کو اکسٹھ ہزار (61000) روپے کی نذر دی اور وہ
لوٹ گئے لیکن مہاراجہ اب اپنی فوجوں کو ایک عظیم حملہ کے لیے جمع کر رہا تھا۔ اور اس
نے قسم کھائی تھی کہ ملتان پر جہاں وہ اب تک ناکام رہا تھا ضرور بالضرور قبضہ کر کے
رہے گا۔ (30) 1802ء سے 1818ء تک اس نے سات بار ملتان پر چڑھائی کی تھی
اس طرح نواب ملتان کے تمام وسائل آہستہ آہستہ ختم ہونے لگے۔ دریا کے ذریعہ آمدورفت

اور بار برداری کو نئے سرے سے منظم کیا گیا۔ اس نے کھڑک سنگھ کو اس مُہم کا برائے نام سپہ سالار بنایا کیونکہ اس جوہر شناس مہاراجہ کی نظرِ انتخاب دیوان چند پر پڑ رہی تھی جسے درحقیقت اس مہم کا رہبر تجویز کیا گیا تھا۔ اور جو شاید سپہ سالارِ اعظم مرحوم محکم چند کی جگہ کے لیے زیادہ موزوں تھا۔ رنجیت سنگھ نے ملتان کی مہم کے سرداروں کے نام احکام جاری کر دیے کہ " ملتان کے وکیلوں کو صاف طور پر یہ جواب دے دیا جائے کہ میں نے اب ملتان پر اپنا تسلط قایم کرنے کا پکا ارادہ کر لیا ہے اس لیے وہ نذرانہ کی پیش کش سے باز رہیں " آخر اس مہم کے لیڈروں نے مہاراجہ کو مطلع کیا کہ ملتان کے وکیلوں نے یہ معاہدہ کر لیا ہے کہ شجاع آباد اور خان گڑھ کو نواب کے گزارے کے لیے چھوڑ کر ملتان کے قلعے اور مظفر گڑھ کو رنجیت سنگھ کے تسلط میں لے لیا جائے لیکن بعد میں دیوان چند نے مہاراجہ کو یہ اطلاع دی کہ بعض افغان سرداروں نے نواب ملتان کو سخت سرزنش کی اور شرائط معاہدہ پر اسے بہت برا بھلا کہا۔ اس وجہ سے نواب معاہدہ سے منکر ہو گیا ہے اور اطاعت قبول کرنے سے انکار کر رہا ہے۔ ماہ فروری میں جنگ شروع ہو گئی۔ مظفر گڑھ اور خان گڑھ پر مسلسل حملے کیے اور انہیں لے لیا گیا۔ ملتان شہر پر سکھوں کا قبضہ ہو گیا تاہم قلعہ ایک بڑی مدت تک فتح نہ ہو سکا۔ قلعہ کی فصیل پر حملہ کے دوران کئی نامی گرامی سکھ سردار کام آئے۔ قلعہ کی دیواروں پر گولہ باری کے باوجود بھی نواب نے پیش کردہ شرائط قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ 2 جون کو سادھو سنگھ اکالی نے اچانک حملہ کیا اور قلعہ بند فوج پر غلبہ پا لیا اور اس طرح باقی سکھ فوج کی امداد سے قلعہ فتح کر لیا۔ مظفر خان اور اس کے بیٹوں میں سے پانچ بہادری سے لڑتے ہوئے مارے گئے۔ اس کا بیٹا ذوالفقار خان سخت زخمی ہوا اور قیدی بنا لیا گیا۔ اس کا سب سے بڑا بیٹا سرفراز خان اور سب سے چھوٹا امیر بیگ دونوں پناہ مانگنے پر مجبور ہوئے۔ فوجوں نے بہت لوٹ مار کی لیکن لاہور لوٹتے پر انہیں سارا مال غنیمت اگلنا پڑا۔ اس طرح رنجیت سنگھ نے پانچ لاکھ روپے کے قریب مالیت کا مال غنیمت سپاہ سے حاصل کیا۔ دیوان چند کو مخلص خیر خواہ فتح جنگ کا خطاب عطا کیا گیا۔ تین سال تک ملتان پر مختلف گورنروں کی حکومت رہی۔ 1821ء میں ساون مل کو صوبے دار مقرر کیا گیا۔ قلعہ کی شکستہ فصیل از سر نو تعمیر کی گئی۔ چھ سو سپاہی قلعہ کی حفاظت کے لیے رکھے گئے۔

ماہ اساڑھ 1875 سے بھادوں 1876 تک ایسی تعمیرات پر کل لاگت مبلغ 38284 روپے، 11 آنے اور 6 پائی آئی۔ لوگوں کو شہر میں واپس آنے کی ہر ممکن سہولت فراہم کی گئی۔ سکھ صوبے داروں میں ساون مل سب سے زیادہ بیدار مغز ثابت ہوا۔ سرفراز اور اس کے بھائی ذوالفقار خان کو تیس ہزار روپے سالانہ کی پنشن دی گئی۔

افغانستان میں وزیر فتح خان کے قتل کے بعد افراتفری ہوئی۔ رنجیت سنگھ نے اس سے فائدہ اٹھایا اور دریائے سندھ کے دائیں کنارے پر حملہ کر دیا۔ کٹک قبیلہ کے سردار فیروز خان نے مرحوم وزیر فتح خان کے بھڑکاتے پر اٹک کے مقابل مقام خیرآباد پر چڑھائی کر دی اور دو سکھ سرداروں کو قتل کر دیا۔ لاہور کے حکمران نے بذات خود فیروز خان پر چڑھائی کر دی۔ اس طرح خیرآباد اور دریائے سندھ کے دوسرے کنارے پر واقع بارک زئیوں کا کافی علاقہ فتح کر لیا۔ پھر وہ پشاور کی طرف بڑھا۔ پشاور کے ناظم یار محمد خان نے شہر خالی کر دیا۔ وہاں کا بالاحصار کا قلعہ جلا دیا گیا۔ شہر میں دو دن قیام کرنے کے بعد مہاراجہ نے کوچ کیا۔ جہاں داد خان کو جس نے رنجیت سنگھ کو اٹک کا علاقہ حوالے کیا تھا وہاں کا صوبے دار بنا دیا گیا مگر اس کو کسی قسم کی مالی یا فوجی امداد نہیں دی گئی جس کے بل پر وہ بارک زئیوں کا مقابلہ کر سکتا۔ یہاں تک کہ پشاور میں جو موجودہ توپیں ملی تھیں وہ بھی مہاراجہ اپنے ساتھ لے آیا۔ عملی طور پر جہاں داد خان کو بارک زئیوں کے مقابلے میں بے یار و مددگار چھوڑ آیا۔ پھر اس میں تعجب کی کیا بات ہے اگر دو ماہ کے عرصہ ہی میں بارک زئیوں نے جہاں داد خان کو نکال باہر کیا۔

1819ء میں مہاراجہ کو کشمیر فتح کرنے میں کامیابی ہوئی۔ کابل لوٹتے وقت محمد عظیم خان اپنے ساتھ افغان فوج کے چیدہ اور تجربہ کار سپاہی لے گیا جس کے باعث کشمیر میں افغان سپاہ برائے نام رہ گئی۔ گذشتہ سال ملتان کی مہم کا کامیاب سردار دیوان چند ہی کشمیر کی تیسری سکھ مہم کا سپہ سالار تھا اور فوج کی رہبری کر رہا تھا۔ کھڑک سنگھ کے تحت ایک دوسرا لشکر کمک کے طور پر پیچھے تھا۔ ان دونوں فوجوں کے پیچھے کچھ فاصلہ پر مہاراجہ بذات خود رسد کی نگرانی کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا، اپنی پہلی ناکامی کے تجربہ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مہاراجہ نے اپنے جرنل مرحوم محکم چند کے پلان پر عمل کیا۔ دیوان چند نے پیر پنجال کے درّوں پر قبضہ کر لیا۔

دوسرا لشکر راجوری کی طرف بڑھا۔ مہاراجہ کی زیر نگرانی تیسرے لشکر نے بھی۔ مرزا
کی طرف کوچ کیا۔ پیر پنجال کو سر کرنے کے بعد دیوان چند گھاٹ کی طرف روانہ ہوا۔
عظیم خان کے نائب جبّار خان نے بارہ ہزار سپاہیوں کی معیت میں مہاراجہ کی فوجوں
کا سامنا کیا مگر بری طرح شکست کھائی اور ایک گولہ پھٹنے سے وہ زخمی ہو گیا۔ اسی
حالت میں وہ سری نگر کی طرف بھاگا۔ وہاں سے بارہ مولا کے راستے سے بچ کر پشاور
جا پہنچا، اس کا تعاقب نہیں کیا گیا۔ اس طرح کشمیر بائیس مہینے میں پورے طور پر سکھوں
کے قبضہ میں آگیا۔ دیوان جوتی رام کو کشمیر کا صوبے دار مقرر کیا گیا اور اسے نصرت جنگ
یا فتح جنگ کے خطاب سے نوازا گیا۔ (36)

فاتح ملتان رنجیت سنگھ کو سندھ کے درمیانی علاقہ پر قابض ہونے کی آرزو تھی
1820ء میں اس نے ڈیرہ غازی خان کو سر کرنے کی ٹھانی جو اس وقت برائے نام
کابل کی تحویل میں تھا۔ خوش حال سنگھ نے ڈیرہ غازی خان کو فتح کر لیا اور مہاراجہ
نے یہ علاقہ بھاولپور کے نواب سعدی خان کو ٹھیکے پر دے دیا۔ وہ رنجیت سنگھ
کی زیر سرپرستی سندھ اور چناب کے دوآب پر بھی قابض تھا۔ 1821ء میں رنجیت
سنگھ نے ڈیرہ اسمٰعیل خان، بکھر اور لیہ کو بھی باسانی فتح کر لیا اس کے بعد اپنی سپاہ
کے ساتھ مہاراجہ خود بھی منکیرہ کی طرف بڑھا۔ منکیرہ کے نواب نے اس سے پہلے ستر
ہزار روپے کا بیش قدر نذرانہ پیش کیا تھا مگر مہاراجہ اس علاقہ کو اپنی سلطنت میں
شامل کرنا چاہتا تھا اس لیے دیوان چند کو ہمراہ لے کر رنجیت سنگھ منکیرہ کی طرف بڑھا
نواب کے دو خاص نمایندے مہاراجہ کی خدمت میں پیش ہوئے۔ نواب کے وکیلوں
نے نذرانہ دینے کا وعدہ کیا مگر دیوان چند نے ان کو صاف طور پر آگاہ کر دیا کہ مہاراجہ
منکیرہ کو اپنی تحویل میں لینا چاہتے ہیں اس لیے بہتر یہی ہوگا کہ نواب منکیرہ اس کے حوالے
کر دے اور اس کے بجائے ڈیرہ اسمٰعیل خان کو اپنی تحویل میں لے لے۔ ان حالات
میں نواب نے ٹالنا بے سود سمجھا اور پیش کردہ شرائط کو منظور کر لیا۔ اس نے منکیرہ
مہاراجہ کے سپرد کر دیا، مہاراجہ نے اسے ڈیرہ اسمٰعیل خان کا جاگیردار مقرر کر دیا۔ منکیرہ
کے محاصرہ سے ظاہر ہو گیا کہ رنجیت سنگھ اپنے سرداروں اور سپاہیوں کو لڑائی کے لیے
کتنا ابھار سکتا ہے۔ پندرہ کوس تک پانی کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا پھر بھی منکیرہ

پر چڑھائی کی صورت میں سرداروں نے مل کر کنویں کھودنے اور سپاہیوں کو پانی مہیا کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ کچھ ہی گھنٹوں میں بہت سے کنویں کھد گئے۔ پانی عام ہو گیا۔ توپ خانے کے مورچے تیار کر دیے گئے (37) جن علاقوں پر مہاراجہ براہ راست حکومت کرتے تھے۔ 1821ء میں منکیرہ کی شمولیت سے سندھ کی سرحد محفوظ ہو گئی۔ دریائے سندھ کے پار ڈیرہ غازی خان اور ڈیرہ اسمٰعیل خان جاگیرداروں کے قبضہ میں تھے اور اٹک کے مقابل مقام خیرآباد پر سکھوں کا قبضہ تھا۔ پاکھلی، دمتور، تور بیلا اور دربند کے علاقوں پر سکھ حکومت ابھی تک غیر محفوظ تھی۔ ان حالات میں ہری سنگھ منوہ کو ایک مضبوط اور مستحکم حکومت کی روایت قائم کرنے کے لیے بھیجا گیا۔

1822ء میں لاہور کے حکمران نے دوسری بار سندھ کو پار کیا۔ اس نے افغان سلطنت کے عملی طور پر تعطل کا فائدہ اٹھایا اور دریائے سندھ کے دائیں کنارے پر واقع رکھی علاقوں کو فتح کر لیا۔ افغان بادشاہ شاہ محمود کے بیٹے کامران نے 1818ء میں افغان وزیر اعلیٰ فتح خان کی آنکھیں نکلوا دیں اور اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ فتح خان کی موت کے ساتھ افغان حکومت کی دوراندیشی اور ان کا اتحاد بھی ختم ہو گیا۔ فتح خان کے بھائیوں نے بادشاہ کے خلاف ہتھیار اٹھا لیے۔ بارک زئی قبیلہ کا سب سے معمر شخص محمد عظیم خان معمولی قابلیت کا غیر مستقل مزاج آدمی تھا۔ محمود کو ہرات میں پناہ لینی پڑی۔ بارک زئی کی بغاوت کی سربراہی کرنے کے لیے محمد عظیم خان کشمیر سے افغانستان روانہ ہو گیا۔ دوست محمد نے شاہ محمود کو کابل سے نکال دیا اور خود ہرات پر قابض ہو گیا۔ کشمیر سے کابل جاتے ہوئے عظیم خان نے لدھیانہ سے شاہ شجاع کو مدعو کیا کہ وہ اس کی حمایت سے افغانستان کے تخت کو سنبھالے، شاہ شجاع رضامند ہو گیا۔ (38) مگر راستے میں اس نے عظیم خان کے کسی دوست کو پالکی استعمال کرتے دیکھا تو اس نے شاہی آداب کی توہین سمجھی اور اسے برا بھلا کہا۔ عظیم خان نے ایسے مغرور شخص کو تخت نشین کرنا مناسب نہ سمجھا، اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور اس پر حملہ کر کے شکست دے دی۔ شاہ شجاع خیبر کی پہاڑیوں سے بھاگتا ہوا سندھ پہنچا۔ عظیم خان نے پھر شاہ ایوب پر ڈورے ڈالے۔ شاہ شجاع نے شکارپور کے مقام پر اپنی فوج کو فراہم کر لیا مگر عظیم خان کے وہاں پہنچتے ہی شاہی فوج درہم برہم ہو گئی۔ غرض 1821ء میں شاہ شجاع واپس

لدھیانہ پہنچا۔ محمد عظیم خان اپنی زیر نگرانی بارک زئیوں کو متحد کرنے میں کامیاب ہو گیا مگر وہ فتح خان کی مانند طاقتور اور بااثر نہ تھا۔ سندھ کے بائیں کنارے پر رنجیت سنگھ کی فتوحات نے بارک زئی سردار کو خواب غفلت سے بیدار کیا۔ اسی زمانے میں ایک مفرور سکھ سردار جے سنگھ اٹاری والا بھی لگ بھگ بارک زئیوں کے ساتھ آملا۔ (39)

بارک زئی برادران میں سے ایک یار محمد پشاور پر قابض تھا۔ اس کو عظیم خان سے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا جیسے ہی مہاراجہ دریائے سندھ پار کرنے کے ارادہ سے راولپنڈی کی طرف بڑھا پشاور کا وکیل تحائف لے کر مہاراجہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ یار محمد نے سرکار معلیٰ کو چالیس ہزار روپے بطور خراج دینا منظور کیا اور بعد میں مزید بیس ہزار روپے ادا کرنے کا وعدہ کیا (40) مورخ مرے (Murray) کا کہنا ہے کہ اس نے کچھ قیمتی گھوڑے بھی مہاراجہ کی نذر کیے۔ عظیم خان جل بھن گیا۔ اور کہا جاتا ہے کہ اس نے دعویٰ کیا کہ اس وقت فقط رنجیت سنگھ ہی اس کا دشمن ہے۔ (41) وہ کابل سے پشاور کی طرف بڑھا۔ اس بار یار محمد خان وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا۔ رنجیت سنگھ عظیم خان کو کسی حالت میں اتنی مہلت نہیں دینا چاہتا تھا کہ وہ پشاور پر اپنے تسلط کو مضبوط کرے اور اس پر چڑھائی کر دے۔ لہٰذا عطر سنگھ، ہری سنگھ نلوہ اور دیگر کئی سرداروں کے ساتھ شہزادہ شیر سنگھ نے قلعہ جہانگیرا کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ (42) میدان جنگ میں افغان ہار گئے اور قلعہ چھوڑ کر بھاگ گئے۔ انتہائی غصہ کے عالم میں افغان وزیر نے جہاد کا اعلان کر دیا اور اس طرح سندھ کے مغربی کنارے پر سکھ سپاہ کا قصہ پاک کرنے کی کوشش کی کیونکہ ہراول دستوں کی امداد دینے کے لیے مہاراجہ کو سندھ عبور کرنے کے بعد ایک فیصلہ کن جنگ ناگزیر دکھائی دی۔ اسی دوران مفرور جے سنگھ اٹاری والا لوٹ آیا اور مہاراجہ سے معافی مانگ لی۔ سکھ اور افغانوں کے درمیان نوشہرہ کے مقام پر جنگ ہوئی۔ دونوں طرف سے تقریباً بیس ہزار سپاہیوں نے اس لڑائی میں حصہ لیا۔ اس جنگ کے بارے میں مورخین میں اختلاف رائے ہے۔ کیئے (Kaye) اور سوہن لال کے بیان کے مطابق رنجیت سنگھ نے سلطان محمد، یہاں تک کہ اس کے بھائی دوست محمد کو رشوت دے کر اپنی طرف ملا لیا تھا۔ اس طرح نوشہرہ کی لڑائی میں میدان اس کے ہاتھ رہا۔ دوسرے سب ہمعصر مورخین لکھتے ہیں کہ گھمسان کا رن پڑا۔ مختلف اندازوں سے اس جنگ میں

دو ہزار (بمطابق مورخ ویڈ) اور بمطابق مورخ امرناتھ چار ہزار افغان سپاہی کام آئے۔ نوشہرہ کی جنگ 14 مارچ 1823ء کو لڑی گئی تھی۔

عظیم خان نے اس جنگ کو جہاد قرار دیا اور پڑوسی قبیلوں سے مذہب کے نام پر امداد مانگی۔ ایک طرف ہٹ دھرم اکالی اور دوسری طرف کٹر غازی تھے۔ ساری افغان سپاہ کو میدانِ جنگ میں نہیں جھونکا گیا اور افغان فوج کی نقل و حرکت کا منصوبہ بھی سوجھ بوجھ سے تیار نہیں کیا گیا تھا۔ عظیم خان اور اس کے کچھ بھائیوں کی تحویل میں متعلق فوج کا ایک حصّہ دریائے کابل کے دوسری طرف تعینات تھا۔ وقت آنے پر وہ دریا کو عبور نہ کر سکے۔ انجام کار دوسرے کنارے پر مامور اپنی فوج کی امداد کرنے میں ناکام رہے۔ رنجیت سنگھ کی فوج کے ایک دستہ نے عظیم خان کی سپاہ کو مصروف رکھا اور اسے دریا عبور کرنے کا موقع ہی نہ دیا۔ دائیں کنارے پر سکھ فوجیں ہتھیار بند غازیوں سے لڑ رہی تھیں۔ شروع میں افغان سپاہ نے یکے بعد دیگرے چار سکھ حملوں کا منہ توڑ جواب دیا۔ جانباز پھولا سنگھ اکالی کی باہمت اور بہادرانہ شہادت کے باوجود سکھ فوج صفِ در صف پھیلے افغان پیادہ سپاہیوں کے جماؤ پر اثر انداز نہ ہو سکی۔ لڑائی کے رُخ کو دیکھ کر اور اپنے سپاہیوں کی ہچکچاہٹ کے پیشِ نظر رنجیت سنگھ بذاتِ خود اپنے ذاتی دستہ کی معیّت میں جنگی پرچم لہراتا ہوا میدانِ جنگ میں کود پڑا۔ اور اعلان کیا "لاہور بہت دور ہے اور سکھ میدان سے بھاگ کر بھی اپنی جان نہیں بچا سکیں گے" میدانِ جنگ میں رنجیت سنگھ کی موجودگی نے سپاہیوں کے (ہاں) پست حوصلے بلند کر دیے۔ پانچویں حملہ میں افغان لشکر کی شکست ہو گئی اور میدان سکھوں کے ہاتھ رہا۔ فریزر (Farier) لکھتا ہے کہ عظیم خان کی ہمت جواب دے گئی ورنہ وہ دریا یقیناً عبور کر سکتا تھا۔ بھاگتے ہوئے افغان سپاہیوں کو دریا کے پار کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ سکھوں کے ایک دستہ نے دریا کے دوسرے کنارے تک ان کا تعاقب کیا۔ عظیم خان فوراً اپنی توپیں اور خیمے چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ رنجیت سنگھ پشاور میں داخل ہوا۔ اس کے بعد ہی دل شکست عظیم خان کی موت واقع ہو گئی۔ مرتے وقت اس نے اپنے بیٹوں کو شکست کا بدلہ لینے کی ہدایت کی۔ پھر ایک بار افغانستان میں گڑبڑ اور لاقانونیت کا دور دورہ ہو گیا۔ "جیسے بچے

کے میدانوں میں فتح خان کے خلاف لڑائی میں سندھ کے مشرقی علاقوں میں سکھوں کی
دھاک بیٹھ گئی تھی ٹھیک ویسے ہی اس مہم کو سر کرنے کے بعد سندھ اور پشاور کے بیچ
کے علاقوں میں بھی سکھوں کی طاقت کا سکہ جم گیا۔ پشاور میں سکھ داخل ہو چکے تھے لیکن
خیرآباد کے مغربی علاقوں میں سرکش افغان قبائل پر حکومت کرنا ٹیڑھی کھیر تھی۔ مہاراجہ نے
عقلمندی کا ثبوت دیا، جس طرح اس نے ڈیرہ غازی خان اور ڈیرہ اسمٰعیل خان کے سرداروں
کو لاہور دربار کی طرف سے اپنے علاقوں کا جاگیردار مقرر کر دیا تھا ٹھیک اسی طرح یار محمد
خان کو پشاور کا جاگیردار بنا دیا۔ 1824ء میں ٹانک اور بنوں بھی خراج گزار ہو گئے۔
1834ء کے بعد ہی پشاور سکھ سلطنت میں شامل کیا جا سکا۔

اگرچہ مہاراجہ رنجیت سنگھ اپنی سلطنت کو شمال، مغرب اور جنوب میں وسیع کر
رہا تھا تاہم ان مفتوحہ علاقوں کو مستحکم کرنے میں اس کی نیند حرام تھی۔ ضلع سیالکوٹ
کے طاقتور فرمانروا جودھ سنگھ والیٔ وزیرآباد نے 1810ء میں انتقال کیا۔ اس کا بیٹا
گونڈہ سنگھ ایک ہی سال میں اپنی جاگیر کو ضبطی سے نہ بچا سکا۔ فیضلپوریہ مقبوضات
پر دیوان محکم چند اور جودھ سنگھ رام گڑھیا نے 11-1810ء میں قبضہ کر لیا۔ بدھ سنگھ
فیضلپوریہ بھی مکمل طور پر آزاد سردار بن بیٹھا۔ گجرات کا صاحب سنگھ ایک نامی بھنگی سردار
تھا۔ وہ رنجیت سنگھ کی تخت نشینی کے خلاف شروع سے سازش کرتا رہا تھا۔ اب اس
کی طاقت زایل ہو چکی تھی لہٰذا بغیر حیل و حجت کے اس نے اطاعت قبول کر لی اُسے
منگلا پور کا قلعہ خالی کرنا پڑا اور دوسرے کئی علاقوں سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔ یکے بعد دیگرے
گجرات، جلال پور، اسلام گڑھ اور دوسرے قلعے جو صاحب سنگھ اور اس کے بیٹے
گلاب سنگھ کے قبضہ میں تھے لے لیے گئے۔ جب صاحب سنگھ نے اطاعت قبول کر لی تو
رنجیت سنگھ نے اسے کھلے دربار میں یقین دلایا کہ وہ ہمیشہ اس کا خیال رکھے گا۔ اپنے باپ
کی طرح اس کا احترام کرے گا اور اس کے وقار پر کبھی آنچ نہ آنے دے گا۔ بیجاوٹ اور
کالووال کے تعلقے اسے دے دیے گئے۔ محکم چند نے 1811ء میں نکائیوں کے علاقے
جن میں پاک پٹن بھی شامل تھا فتح کر لیے۔ ان شمولیات کے بعد یہ پورا علاقہ سلطنت
کے وارث (یوراج)، کھڑک سنگھ کی تحویل میں دے دیا گیا۔ فقیر امام الدین کو رام سنگھ
کے ساتھ ندھان سنگھ کے مقبوضات حاجی پور وغیرہ کو تسخیر کرنے کے لیے بھیجا گیا۔ ندھان

سنگھ مرحوم سردار جے سنگھ کا بیٹا تھا۔ سدا کور مسل کی سردار بن گئی اس لیے جے سنگھ نے ندھان سنگھ کو کچھ علاقے ‌ن سے دے دیے تھے۔ رنجیت سنگھ نے اس خاندان کو بھی جاگیر عطا کی۔ الغرض 1810-11ء میں رنجیت سنگھ کی ادغام کی پالیسی کی کسی نے بھی زیادہ مخالفت نہیں کی۔ البتہ بدھ سنگھ فیضلپوریہ کی فوجوں نے جو امرتسر سے لگ بھگ چالیس میل دور ترنتارن کے قریب پٹی پر قابض تھیں کچھ عرصہ تک رنجیت سنگھ کا مقابلہ کیا۔ 1812ء میں سردار جے مل سنگھ کنہیا کے انتقال پر اس کے مقبوضات تاراگڑھ (46)، فتح پور اور میرتھل وغیرہ سلطنت میں شامل کر لیے گئے۔ جب تک جودھ سنگھ رام گڑھیا زندہ تھا۔ اس نے بہت سی مہموں میں رنجیت سنگھ کی پوری وفاداری سے امداد کی، جودھ سنگھ کے نام کے ساتھ ایک مشہور کہانی وابستہ ہے۔ ایک بار رنجیت سنگھ نے اس بزرگ رام گڑھیا سردار کو کچھ تحفے دینے کا حکم دیا اس نے اس عزت افزائی سے معذرت چاہی اور بتایا " اس زمانے میں خوش نصیب ہے وہ آدمی جس کے سر پر پگڑی سلامت ہے، رنجیت سنگھ کی حرص پر ایک کڑا طنز تھا۔ یہ واقعہ اس کے درباری سرداروں کے اضطراب کا بھی آئینہ دار ہے۔ جودھ سنگھ کی زندگی کے دوران تو رنجیت سنگھ خاموش رہا۔ اس کے مرتے ہی اگست 1815ء میں رام گڑھیا مقبوضات کو جودھ سنگھ کے چچازاد بھائیوں مہتاب سنگھ نہال سنگھ، بیر سنگھ اور دیوان سنگھ سے لے لیا گیا۔ ان مقبوضات سے تقریباً چار چھ لاکھ روپے کی سالانہ آمدنی ہوتی تھی۔ (46)

1821ء میں سدا کور کے مقبوضات کو شامل ریاست کر کے اسے قید میں ڈال دیا گیا۔ مہتاب کور کے بطن سے جس کی موت پہلے ہی ہو چکی تھی، رنجیت سنگھ کے دو بیٹے شیر سنگھ اور تارا سنگھ تھے، انہیں سدا کور نے ہی پالا تھا۔ اس کے داماد رنجیت سنگھ نے مطالبہ کیا کہ سدا کور ان دونوں کو اپنی جائداد میں سے کچھ حصہ دے۔ رنجیت سنگھ نے اسے اپنی جائیداد کا نصف حصہ اپنے نواسوں کو دے دینے پر دباؤ ڈالا۔ سدا کور رضامند نہیں ہوئی اور اس نے انگریزی حکومت کی پناہ میں چلے جانے کی دھمکی دی۔ اسلیے اسے نظر بند کر دیا گیا۔ اس طرح وہ اپنے نواسوں کے حق میں دستاویز تحریر کرنے پر مجبور ہوئی۔ وادنی اور ستلج پار کے مقبوضات کو چھوڑ کر سارے علاقوں کو سلطنت

میں شامل کر لیا گیا۔ ستلج پار کے علاقوں میں سے صرف (48) اٹل کے قلعدار نے کچھ مخالفت کی تھی۔ سدا کور کو مرتے دم تک قید میں رکھا گیا۔

سدا کور کی قید کے بارے میں حالات کی جو تفصیل امرناتھ نے دی ہے وہ کچھ مختلف ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سدا کور دل میں رنجیت سنگھ سے دشمنی رکھتی تھی اور وہ خط و کتابت کے ذریعہ بہت سے لوگوں میں رنجیت سنگھ کے خلاف نفرت پھیلا رہی تھی گامی خان خانساماں اور کمار شیر سنگھ نے رنجیت سنگھ کو اطلاع دی کہ سدا کور اس کی نافرمانی پر تلی ہوئی ہے۔ اور اس بات کا قوی امکان ہے کہ وہ کسی وقت بھی ستلج پار جا کر لوگوں کو اس کے خلاف مسلح بغاوت کے لیے بھڑکا سکتی ہے (49)

سدا کور کی قید کے بارے میں ہر دو بیانات کا اگر موازنہ کیا جائے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان دونوں نظریوں میں کچھ نہ کچھ سچائی ضرور ہے۔ سدا کور اور اس کا داماد دونوں ہی سرکش شخصیتیں تھیں اس لیے ان میں تال میل نہ رہ سکا جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے دونوں میں کافی پہلے سے اَن بَن چل رہی تھی۔ اس کے نواسے شیر سنگھ کی بجائے کھڑک سنگھ کو تخت کا وارث بنانا سدا کور کو گوارا نہ تھا۔ اور اسی لیے شاید وہی ایک اہم ہستی تھی جو کھڑک سنگھ کی شادی کی رنگ رلیوں میں شامل نہیں ہوئی لیکن اس کے فوراً بعد ہی اس نے اپنے آپ کو حالات کے سانچہ میں ڈھال لیا اور دربار کی اطاعت قبول کر لی۔ حالانکہ سدا کور شاہی کونسل کی ممبر نہ تھی مگر پھر بھی اہم معاملات میں اس کی رائے لی جاتی تھی۔ ضلع ہزارہ کے بندوبست کے لیے اس کو ہری سنگھ کے ہمراہ بھیجا گیا تھا اور ایک سلسلہ میں کننگھم کہتا ہے کہ "مہاراجہ فطرتاً سنگدل نہ تھا اور نہ اس کی یہ پالیسی تھی کہ کسی کو ناامیدی کی حد تک ستایا جائے لیکن دوسروں کے مقابلے میں سدا کور کی پوزیشن مختلف تھی۔ سب سکھ مملکتوں کو اپنی سلطنت میں شامل کرنا رنجیت سنگھ کا مقصد تھا۔ کوئی رشتہ ناطہ یا احسان کا جذبہ اس کی راہ میں رکاوٹ نہ بن سکا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ اپنی کسی پالیسی کو عملی جامہ پہنانے میں صبر کا دامن ہاتھ سے کبھی نہیں چھوڑتا تھا۔ البتہ سدا کور کے معاملہ میں 1821ء میں اس نے واقعی جلد بازی کی۔ اس کے لیے سدا کور کا سورخ، اس کی سازشی فطرت اور کبھی کبھی حکم عدولی کی طرف رجحان نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس سلسلے میں مرے ٹھیک ہی کہتا ہے کہ "بھلے ہی انسانیت

سداکور کی طرف ہو لیکن جس قسم کی وہ عورت تھی اس سے زیادہ اس کے ساتھ اور کیا اچھا برتاؤ کیا جا سکتا تھا۔ (50) سکھوں کے ایک بڑے معزز دھارمک لیڈر بابا صاحب سنگھ بیدی نے سداکور کی رہائی کے لیے مہاراجہ سے سفارش کی۔ مہاراجہ انکار تو نہ کر سکا لیکن سداکور کو کبھی رہا ہونا نصیب نہ ہوا۔ وہ ہمیشہ نظر بند ہی رہی۔ مصر بیلی رام کو حکم تھا کہ اخراجات کے لیے (51) سداکور کو دس روپے روزانہ دیے جائیں۔ ستلج کے پار سداکور کے مقبوضہ علاقے، وادنی کا قلعدار بھی کبھی کبھی خرچ کے لیے کچھ رقم دے دیا کرتا تھا۔ سکھ تاریخ میں سداکور کا واقعہ اٹھارہویں صدی کی مرہٹہ تاریخ کی تارا بائی کے واقعہ نظر بندی کی یاد دلاتا ہے۔

اس طرح ستلج پار کی سب مسلوں کو آہستہ آہستہ ملا لیا گیا۔ فتح سنگھ آہلووالیہ کے معاملے میں البتہ استثنا برتا گیا کیونکہ وہ غالباً ایک معتبر دوست تھا۔ رنجیت سنگھ کے ساتھ اس کے خاص تعلقات تھے۔ جب وہ جوان تھے تو دونوں میں برابری کا رشتہ تھا۔ 1802ء میں وہ پگڑی بدل دوست بن گئے۔ اس وقت فتح سنگھ کے مقبوضات اگر رنجیت سنگھ سے زیادہ نہ تھے تو بھی برابر ضرور تھے۔ دونوں نے ایک ساتھ ہی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ دوستی کا معاہدہ کیا لیکن برابری کے درجہ سے آہستہ آہستہ گرتے گرتے فتح سنگھ مہاراجہ کا صرف ایک ماتحت حلیف رہ گیا۔ رنجیت سنگھ کی طاقت بڑھانے میں اس کا بڑا ہاتھ تھا۔ جیسے جیسے مہاراجہ کی طاقت بڑھتی گئی فتح سنگھ کے مقبوضات میں بھی بتدریج اضافہ ہوتا گیا۔ مٹکاف نے لکھا ہے کہ 9-1808ء میں فتح سنگھ کے وزیروں میں سے ایک کو رنجیت سنگھ کا وزیر بھی مقرر کیا گیا۔ اس طرح وہ دونوں کا مشترکہ وزیر تھا۔ کسی اور سکھ سردار کا کوئی ایسا مشترکہ وزیر نہ تھا۔

فتح سنگھ نے باقاعدہ طور پر کبھی مہاراجہ کی اطاعت قبول نہیں کی لیکن عملی طور پر وہ ایک اطاعت گذار ماتحت سردار بن کر رہ گیا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ 1815ء میں حاکم لاہور نے آہلووالیہ سردار کو اس کی ذاتی جاگیر کے معاملوں میں حکم صادر کیے۔ اسے مجبوراً ماننا پڑا کہ وہ مہاراجہ کے احکام کے مطابق عمل کرے گا۔ اس نے کسی بات پر امرداس سنگھ کو نظر بند کر دیا تھا۔ مہاراجہ کے احکام رہائی پر اگرچہ فتح سنگھ تلملایا تاہم اسے جھکنا اور امرداس سنگھ کو رہا کرنا پڑا۔ رنجیت سنگھ کو معتبر ذرائع سے معلوم

ہوا کہ فتح سنگھ آہلووالیہ کے پاس تین ہزار پانچ سو گھوڑ سوار اور پیدل ہیں۔ مہاراجہ نے دسہرہ کے دن آہلووالیہ دستہ کے معائنہ کی خواہش ظاہر کی[52] 1826ء تک آہلووالیہ سردار پوری وفاداری سے اپنے پرانے ساتھی کی خدمت بجا لاتا رہا۔ مگر اچانک ایک دن اُس نے دریائے ستلج کو پار کیا۔ اور اپنے آپ کو انگریزوں کی پناہ میں دے دیا۔ اگر مٹکاف پر یقین کیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ 1809ء ہی سے فتح سنگھ کچھ اکھڑا اکھڑا رہتا تھا۔ اگر خاص طور پر رام گڑھیا اور کنہیا مسلوں کی شمولیت کے بعد سے اس کے اندیشے اور بھی بڑھ گئے۔ لیکن اس کے اس فیصلہ کی فوری وجوہات معلوم نہیں ہو سکیں۔ رنجیت سنگھ کے ساتھ معاہدہ کی شرائط کے مطابق انگریز ستلج پار کے علاقوں سے کوئی رابطہ قائم نہیں کر سکتے تھے ادھر رنجیت سنگھ بھی اپنے پگڑی بدل بھائی کے ساتھ دوستانہ تصفیہ کرنا چاہتا تھا۔ فتح سنگھ کو بڑی عزت کے ساتھ لایا گیا۔ اس نے کہا کہ غلط صلاح کاروں نے اسے گمراہ کر دیا تھا۔ ستلج پار کے آدھے سے بھی زیادہ مقبوضات کے ساتھ پورے اختیارات اسے لوٹا دیے گئے۔ عہ یہاں یہ بتانا مناسب ہوگا کہ 1826ء میں فتح سنگھ کی وفات کے بعد رنجیت سنگھ نے اس کے بیٹے سے ایک بھاری نذرانہ طلب کیا۔

1797ء سے 1823ء تک سکھ فوجی بادشاہت قایم کی گئی اور اسے مستحکم بنایا گیا۔ یہ ایک ہی شخص کا کارنامہ تھا۔ ہر دور اور ہر ملک میں معماران سلطنت کی زندگی جس طرح ایک طویل دور مملکت گیری ہوتی ہے، قدرتی طور پر رنجیت سنگھ کی زندگی بھی ایک ایسے ہی دور مملکت گیری پر مبنی تھی۔ مورخ ہیوجل (Huegel) کے الفاظ میں " وہ بے شمار مختلف اجزا کا مجموعہ تھا "۔ سیاسی تنگ نظری اور مقامی مسل واد اس کے راستہ کی ایسی رکاوٹیں تھیں کہ ان کو ہٹانا الگ تھلگ ناممکن تھا۔ اس وقت عوام میں بھی ان سے چھٹکارا پانے کے لیے کوئی زور دار تحریک نہیں تھی اور نہ کسی فاتح فوجی طاقت (ملٹری ازم) یا 18 جنوری 1871ء کے ورسیلز کے "گیلری ڈیس گلیسز (Galerie Des Glacis) جیسے کسی ڈرامائی منظر نے اس شاندار ڈھانچہ کو

عہ فتح سنگھ کے مقبوضات میں سے مندرجہ ذیل تعلقہ جات الگ کر لیے گئے تھے اُڈھو ٹانڈہ، جنڈیالہ وغیرہ پھگلی نند پور اور ویرال وغیرہ۔ (بمطابق فہرست خالصہ دربار ریکارڈ۔ جلد دوم صفحہ 129)

کھڑا کرنے میں کوئی مدد دی۔ اعلیٰ قسم کی تربیت نہ ہونے کے باعث اس میں کوئی ایسا حسنِ اخلاق بھی نہ تھا جس سے اس کی سیاست کے پھوہڑپن کا نصف حصہ بھی مٹا یا جا سکتا تاہم اس معمار نے جو اپنی قسم کا صاحبِ فن تھا، ایک ایسا منصوبہ بنایا جس کی عظیم کامیابی حیران کن معلوم ہوتی تھی۔ وہ قسمت کی طرح اٹل اور رحم و کرم کے جذبات سے کسی حد تک مُبَرّا تھا۔ جیولز فاورے (Jules Favre) جب آنسو بہاتے ہوئے ایک سوالی کی حیثیت سے اپنے ہارے ہوئے ملک کی قسمت کے بارے میں التجائے کر بسمارک کے پاس گیا تو بسمارک نے اسے بتایا کہ سیاست میں جذبات کے لیے کوئی جگہ نہیں ، اس عظیم منظم کے تعمیری کام کے پیچھے بھی وہی جذبہ کار فرما تھا۔ رنجیت سنگھ ہوشیار، صاحبِ ادراک، صلح کن اور ایک ایسا شاطر تھا جو طاقت کے مقابلے میں سیاست پر زیادہ بھروسہ رکھتا تھا۔ وہ ظالم نہ ہو لیکن تاہم اس کا کوئی اصول بھی نہ تھا۔ بہت سے وہ سردار جن کے علاقوں پر اس نے قبضہ کر لیا تھا (اور جن کی فہرست بھی بہت لمبی ہے) اس بات سے مطمئن تھے کہ ان کا فاتح انہیں اپنی جاگیر عطا کرے گا جس سے وہ آسودہ حال رہ کر اپنی زندگی بسر کر سکیں یا ان کی حسبِ منشا اپنے حضور میں مناسب عہدہ پر فائز کر دے گا۔ قطب الدین والی قصور، محمدؐ خان والی جھنگ، سرفراز خان والیٔ ملتان ، سلطان خان والیٔ بھمبر، صاحب سنگھ والیٔ گجرات اور اس کا بیٹا گلاب سنگھ، کٹوچ کا رنبیر چند، سنسار چند کا پوتا ان کے علاوہ اور بہت سے سردار مطمئن تھے کہ ان کا پرانا دشمن کافی حد تک فراخدل ہے اور ایک خاص حد تک فیاض بھی ہے۔ مرّے کہتا ہے کہ " بڑے بڑے قصور کے لیے بھی اس نے کسی کو موت کی سزا نہیں دی "

اشارات

1۔ تاریخ شاہ شجاع الیف 49- 48

2۔ ایضاً الیف 5-51

3۔ ظفر نامہ رنجیت سنگھ

4۔ مولوگراف نمبر 17، مورخہ 17 ستمبر 1812ء

5۔ ایضاً 18 اپریل 1813ء

6۔ محکمۂ خارجہ متفرق نمبر 305 باب دوم، پیرا 4

7۔ محکمہ خارجہ امور متفرق نمبر 128، عمدۃ التواریخ جلد دوم، 181

8۔ مولوگراف نمبر، 17 اپریل 1812ء

9۔ ایضاً 5 مئی 1813ء

10۔ محکمۂ خارجی اور متفرق نمبر 305، باب دوم، پیرا 5

11۔ عمدۃ التواریخ، جلد دوم، صفحہ 134

12۔ ایضاً 135

13۔ فیرابیر۔ تاریخ افغانان

14۔ عمدۃ التواریخ، دوم، صفحہ 135

15۔ پرنسپ۔ 95-96

16۔ پی پی 23 اپریل 1813ء نمبر 11، پیرا 7

17۔ برنز، سوم، صفحہ 238

18۔ فہرست خالصہ دربار ریکارڈ جلد اوّل، صفحہ 30

19۔ مولوگراف نمبر 17 مورخہ 13 مارچ 1813ء

20۔ ایضاً صفحہ 77، یکم جولائی 1813ء

21 ایضاً 6 جولائی 1813ء

22۔ عمدۃ التواریخ دوم، صفحہ 142

23۔ ایضاً صفحہ 152۔ مولوگراف نمبر 17، مورخہ 10، 26 ستمبر 1813ء

24۔ مولوگراف نمبر 17، 1814ء نمبر 19-18

25۔ کشمیر کی دوسری مہم کا احوال ظفر نامہ، عمدۃ التواریخ اور مولوگراف نمبر 17 کے مطابق ہے۔

26۔ مولوگراف نمبر 17، 1810ء

27۔ گورکھے، مصنفہ ڈبلیو براک نارتھی و سی۔ جے۔ نارس

28۔ مولوگراف نمبر 17، 1810ء (4) ملتان گزیٹیر

29۔ لدھیانہ ایجنسی جلد 15، 1808ء مولوگراف نمبر 17، 23 اپریل 1816ء

30۔ ملتان گزیٹیر (84-1883ء)

31۔ عمدۃ التواریخ جلد دوم، صفحات 218۔ 217۔ 212۔ 211

32۔ محکمہ خارجی امور متفرق

33۔ فہرست خالصہ دربار ریکارڈ جلد دوم، صفحہ 63

34۔ ایضاً

35۔ عمدۃ التواریخ دوم، 1875ء

36۔ ظفر نامہ

37۔ ویڈ کا خط یکم اگست (صلاح و مشورہ 12 اکتوبر 1827ء)

38۔ برنز، سوم، صفحہ 246

39۔ مولوگراف نمبر 17، 1822ء (1)

40۔ ایضاً 1822ء (1)

41۔ ایضاً

42۔ عمدۃ التواریخ دوم، 1879ء

43۔ محکمۂ خارجہ امور متفرقہ نمبر 128

44۔ ایضاً نمبر 206، صفحہ 142

45۔ ایضاً نمبر 305۔ پیراگراف 13

46۔ تاریخ سکھاں صفحہ 141، مولوگراف نمبر 17، 1810ء

47۔ مولوگراف نمبر 17، 1815ء (نمبر 18۔ 17) فہرست خالصہ دربار ریکارڈ جلد دوم، صفحہ 47

48۔ پرنسپ صفحات 128۔ 127

49۔ ظفر نامہ 1821ء

50۔ پرنسپ صفحہ 135

51۔ عمدۃ التواریخ، جلد سوم، صفحات ۴۰-۴۱، رنجیت سنگھ دربار کی خبریں، 1825ء الف۔ 637

52۔ مونوگراف نمبر ۱۷، 1813ء (22)

چوتھا باب

سرکار انگریزی سے رنجیت سنگھ کے تعلقات

(1809ء سے 1839ء تک)

معاہدہ امرتسر 1809ء کے مطابق سکھوں اور انگریزوں کی دوستی کا آغاز ہوا۔ رنجیت سنگھ کی کارروائیاں ستلج کے دوسرے کنارے تک ہی محدود رہیں۔ اور انگریزی سرکار نے صرف ستلج کے اس پار کی ریاستوں کو اپنی تحویل میں رکھا۔ اس معاہدہ نے رنجیت سنگھ کے سب سکھ ریاستوں کے حاکم اعلیٰ ہونے کے منصوبوں پر پانی پھیر دیا لیکن اس کے ساتھ ہی اس معاہدہ نے اس کو ستلج کے مغربی علاقوں پر پورے اختیارات دے دیے۔ سر چارلس مٹکاف جب رنجیت سنگھ سے رخصت ہونے لگا تو اس نے رنجیت سنگھ کو بتایا کہ انگریزوں سے معاہدہ کا فائدہ اسے بیس سال بعد پہنچے گا۔ مہاراجہ نے ویڈ (Wade) کو 1827ء میں بتایا کہ مٹکاف کے الفاظ کی واقعی تصدیق ہو گئی۔ (1)

معاہدہ کے بارے میں 1812ء تک تو شک و شبہ رہا۔ پھلور میں ایک چھوٹا سا قلعہ تعمیر کیا گیا۔ پھلور ستلج کے دوسرے کنارے پر واقع ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ یہ شہر اس وقت انگریزوں کی نزدیکی چھاؤنی سے کوئی پانچ میل دور تھا۔ یہ نیا قلعہ محکم چند کی تحویل میں رکھا گیا۔ رنجیت سنگھ نے مٹکاف مشن کے موقع پر اس بات کو تسلیم کیا کہ محکم چند انگریزی حکومت کا پکا دشمن ہے اور اسے انگریزوں سے جنگ کرنے کے

لیے اکسا تا رہتا ہے۔ پھلور نے ایک سرحدی چوکی اور نگراں چھاؤنی کا کام دیا۔ اور گویا یہ ایک حفاظتی مینار تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انگریزی فوج کے معزور سپاہیوں کا خیر مقدم محکم چند اس مقام پر کرتا رہا تھا اس کے باوجود دونوں حکومتوں کے دوستانہ اتحاد کے تعلقات بتدریج بہتر ہوتے گئے۔ رنجیت سنگھ کو انگریزوں کی غیر مداخلت کی پالیسی پر یقین آتا گیا اور اس طرح دوستی کا رشتہ استوار ہوتا گیا۔

انگریزوں اور سکھوں کے تعلقات 1823ء تک اچھے رہے۔ اس دوران میں انگریزی سرکار اپنے معاملات میں مصروف رہی۔ اُدھر سکھ سردار بھی دوسرے معاملات میں گھرا رہا اس لیے معاہدہ کی اہمیت پرکھنے کا موقع ہی نہیں آیا۔ انگریزی سرکار نیپالیوں کی طاقت کم کرنے اور رہی سہی مرہٹہ طاقت کا قلع قمع کرنے اور راجپوت قبایل کو باج گزار بنانے میں لگی رہی۔ جبکہ دوسری طرف مہاراجہ رنجیت سنگھ ملتان، ڈیرہ جات، کشمیر، پشاور اور پنجاب کے میدانی اور پہاڑی علاقوں کو سر کرنے اور فوج کو دوبارہ منظم کرنے میں لگا۔ دونوں فریق جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے، دیگر مسایل میں گھرے رہنے اور باوجود اس بات کے کہ ستلج سے متعلقہ کئی معاملوں پر دونوں کے درمیان شک رہا اور دونوں ایک دوسرے پر نظر رکھتے رہے۔ دونوں کی دوستی کے علاقائی گلشن کو دریائے ستلج تلملنگی اور دل کشی بخشتا رہا اور سمندر تک برابر اس کے زرخیز اثرات جاری رہے گویا دو برادرانہ طاقتوں کو جدا کرنے کے ساتھ جلاتا بھی رہا۔ مرہٹہ اتحاد کے ٹوٹنے کے بعد انگریزی حکومت کے نظریات میں کافی تبدیلی آگئی۔ وہ سندھ اور پنجاب کے مشرق میں ہندوستان کی سب سے بڑی طاقت بن گئی۔ لیکن اسی دوران جیسا کہ کننگھم لکھتا ہے۔ رنجیت سنگھ بھی پنجاب کا مالک بن گیا تھا (۳) انگریزوں نے اس طرف توجہ نہیں کی۔ رنجیت سنگھ کے لیے یہ مسلسل خوشی کا دور تھا۔ کشمیر، اٹک اور ملتان کی تسخیر، پیچ کے میدان اور نوشہرہ کی لڑائیوں میں افغانوں پر فتح، یورپ کے جنگی طریقوں سے اس کے جرنلوں کی واقفیت، یورپین ڈھنگ پر اس کے سپاہیوں کی جنگی تربیت اور بہت سی لڑائیوں میں فتح و نصرت کا پرچم لہرانے کے بعد پنجاب کا یہ سردار رنجیت سنگھ ہندوستان میں ایک طرح سے انگریزوں کا مدمقابل بن گیا۔ اب وقت آگیا کہ اس کو آگے بڑھنے سے روکا جائے اور اس کی طاقت کو کم کیا جائے۔ انبالہ

میں پولیٹیکل ایجنٹ مٹرے کے خیال کے مطابق "ملک گیری کا زبردست حوصلہ رکھنے والے اس شہزادہ کے علاقہ سے انگریزی سرحد کی قربت، ایک کافی اہم معاملہ تھا" (4)
ستلج کے اس پار کی سرحد کی کبھی تشریح نہیں ہوئی تھی۔ 1809ء کے معاہدہ میں ستلج کے جنوب میں واقع ان اضلاع کی کوئی کیفیت نہیں دی گئی تھی جن پر مہاراجہ کی حکومت رہتی تھی۔ آکٹرلونی (Ochterlony) کے خط مورخہ 6 جولائی 1809ء کے مطابق دیوان محکم چند، گڑھیا سنگھ، سردار عطر سنگھ اور گنگرانہ ونارا کے اضلاع لاہور دربار کی سرپرستی کا دم بھرتے تھے۔ جہاں تک دوسروں کا تعلق ہے سردار فتح سنگھ اور دھنا سنگھ کے مقبوضات اور ماچھی واڑہ، مکھو وال کے اضلاع نزاعی تھے ان کو چھوڑ کر باقی اضلاع انگریزی سلطنت کی زیر حکومت تھے ان علاقوں پر تسلط کے بارے میں شک کی گنجائش تھی۔ رنجیت سنگھ سے جنگ کرنا گورنر جنرل غیر ضروری سمجھتے تھے۔ معاہدہ کے بارے میں بات چیت کے ذریعہ مندرجہ ذیل اصول طے پایا کہ ان علاقوں میں جو پنجاب کے سرداروں کو اطاعت کی شرط کے بغیر عطا کئے گئے تھے۔ رنجیت سنگھ مداخلت نہیں کرسکتا۔ دوسرے اس کی سلطنت ان اضلاع تک محدود کردی گئی جو اس کے اپنے قبضہ میں تھے یا جو علاقے اس نے اطاعت کی شرط پر بطور جاگیر اپنے اعزّا و اقربا کو دے رکھے تھے وادنی و آہلوالیہ ستلج کے مغربی کنارے پر واقع مقبوضات سیلبہ کے علاقے، ماچھی واڑہ، جگکور، فیروز پور، امرالہ، کلال ماجرا، کوٹ گرد پرشش منی، رجوانہ، لوگل، آنند پور اور مکھو وال ؏ کے علاقے متنازعہ فیہ تھے۔ وادنی اور فیروز پور کے تنازعوں سے رنجیت سنگھ کی طرف انگریزوں کے موجودہ رویہ کی وضاحت ہوجاتی ہے۔ (5)

؏ آہلوالیہ مقبوضات :۔ وہ علاقے جو رنجیت سنگھ سے بطور عطیہ حاصل ہوئے تھے نارائن گڑھ 46 گاؤں، کراؤں 66 گاؤں۔

جدّی مقبوضات :۔ بھروگ 62 گاؤں، بھونڈری ملتھ، بلّی پور، چالیس گاؤں، بوانڈہ، بیس گاؤں، بستی بیس گاؤں۔

الیسرو :۔ 60 گاؤں، کوٹ الیسو خان ڈابے وال 42 گاؤں، تلّو وال 23 گاؤں

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

وادی پر ایک زمیندار میاں لوذ کا قبضہ تھا۔ 1807ء میں رنجیت سنگھ کی مہم کے
درمیان رانی سدا کور نے اس کی جان بچائی تھی جس پر اس نے رانی کے ساتھ اپنی آئندہ
وفاداری کا عہد کیا۔ 1808ء میں رنجیت سنگھ کی تیسری مہم میں بھی رانی سدا کور نے
اس علاقہ کی حفاظت کی اور رنجیت سنگھ نے یہ علاقہ 15000 روپے کے عوض رانی
سدا کور کو بغیر کسی شرط کے دے دیا۔ ستمبر 1821ء میں مہاراجہ نے سدا کور کو قید کر لیا
اس پر سر ڈیوڈ آکٹرلونی نے یہ حکم دیا کہ باوجود اس کے کہ سدا کور نے سوائے ایک
آدھ بار کے انگریزی حکومت کی برتری کو کبھی تسلیم نہیں کیا اور نہ کبھی انگریزوں سے
امداد طلب کی۔ انگریزوں کو بہر حال اس کی حفاظت کرنی چاہیے تاکہ وہ رنجیت سنگھ
کے دباؤ کے پیش نظر اسے دریا پار کرنے اور انگریزی سرحد میں گھسنے نہ دے خواہ اسے
انگریزوں کی حمایت لینے سے نفرت ہی کیوں نہ ہو۔ یہ سوال بھی غور طلب تھا کہ سدا
کور کی موت کے بعد اس کے مقبوضات، جائداد لاوارث ضبط شدہ بحق سرکار تصور ہوں
گے۔ سکھوں اور پہاڑی معاملات کے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ کیپٹن راس نے اگست 1822ء
میں اپنی رپورٹ میں کہا کہ اس معاملہ پر بحث کی گئی کہ جس علاقہ پر رانی سدا کور کا قبضہ
تھا وہ مہاراجہ لاہور کی ملکیت تھا یا سرکار انگریزی کی سلطنت کا حصہ تھا کیوں کہ
رانی لاوارث بیوہ تھی اور اس کو جو سند حاکم لاہور کی طرف سے عطا کی گئی تھی اس کا مطلب
یہ نکالا جا سکتا تھا کہ جاگیر اسے اپنی زندگی تک کے لیے عطا کی گئی تھی اور اس سے ثابت

مکھو 12 گاؤں، پیر محمدہ 3 گاؤں، سہم الم پور 25 گاؤں۔

گورنمنٹ کے احکام مورخہ 17 فروری 1826ء کے تحت سردار فتح سنگھ کے جدی مقبوضات
انگریزی حکومت کی نگرانی میں لے لیے گئے تھے۔ اور جو علاقے رنجیت سنگھ نے اسے عطا کیے تھے وہ
بھی انگریزی حکومت کی سرپرستی کے تحت سمجھے گئے تھے۔ آئندہ کے لیے عطیوں کا دینا ناقابل تسلیم
سمجھا گیا۔

سیلبہ :۔ سردار دارا سنگھ والی سیلبہ کو آکٹرلونی کا ایک خط ملا کہ وہ اپنے آپ کو انگریزی
حفاظت میں دے دے۔ 1809ء، 1811ء اور 1815ء کے خطوط بنام آکٹرلونی میں اس کی
انگریزی سرپرستی کی تصدیق ہو گئی۔

ہوتا تھا کہ اس جاگیر کے حقوقِ ملکیت رنجیت سنگھ کے پاس تھے۔ اور سدا کور کی موت کے بعد اس کے لاوارث ہونے کی وجہ سے مہاراجہ کو اس کی جائیداد کی ضبطی کا حق حاصل تھا۔ کیپٹن راس نے اس بات پر زور دیا کہ یہ جائیداد بھی ایک جاگیر تھی۔ ٹھیک دھرم کوٹ کی طرح یا ستلج کے مغربی کنارہ پر واقع مقبوضات کی طرح جن پر دیوان چند بطور جاگیر دار قابض تھا یا ضلع تہاوٹ وغیرہ کے دوسرے مقاموں کی طرح جو بطور جاگیر مختلف لوگوں کے قبضے میں تھیں۔

دہلی میں گورنر جنرل کا ایجنٹ اس نظریے سے متفق نہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر رانی نے 1807ء میں اس علاقہ پر قبضہ کیا تھا تو اس نے رنجیت سنگھ کی برتری کو تسلیم کیے بغیر ہی ایسا کیا تھا اور اگر رنجیت سنگھ نے رانی کو جاگیر کی سند مٹکاف کے آنے کے بعد 1808ء میں دی تو ایسا کرنا ناجائز تھا۔ اس نے لدھیانہ کے معاملات کا حوالہ دیتے ہوئے دلیل دی کہ لدھیانہ رنجیت سنگھ کے سب سے پہلے مفتوحہ علاقوں میں سے ایک ہے اور اس نے یہ علاقہ بغیر کسی شرط کے اپنے ماموں بھاگ سنگھ کو دے دیا تھا لیکن 1809ء میں لدھیانہ کو انگریزی سلطنت کے زیرِ نگیں مان کر اس شہر کو فوجی چوکی بنانے کے لیے چنا گیا۔

ہند سرکار کو یہ دلیلیں زیادہ وزن دار معلوم ہوئیں لہٰذا اس وقت رانی کے حقوق کو قایم رکھنا ضروری سمجھا گیا اور اس کی موت کے بعد یہ علاقہ انگریزی سرکار نے

ماچھی واڑہ :۔ یہ دعویٰ کیا گیا تھا کہ انگریزوں نے اس علاقہ پر 1816ء اور 1823ء میں براہِ راست مداخلت کر کے اپنی حکومت کا حق جتایا تھا۔ 1816ء میں جن دو مواضعات پر رنجیت سنگھ کے آدمیوں نے قبضہ کر لیا تھا ان کو پھر سلطنتِ انگریزی میں شامل کر لیا گیا اور 1824ء میں انگریزی حکومت نے اس علاقہ کو تین دعویداروں میں تقسیم کر کے اپنی بالادستی کا ثبوت دیا۔

چمکور :۔ یہ علاقہ 1810ء میں بطور عطیہ سکھ سرداروں کی کنفیڈریشن سے حاصل کیا گیا تھا اس لیے یہ اعلان کیا گیا کہ رنجیت سنگھ اس پر اپنا حق نہیں جتا سکتا۔

عمرالہ :۔ یہ علاقہ انگریزی حکومت کی طرف سے بموجب حکم مورخہ 25 اپریل 1815ء راجہ پٹیالہ کو دیا گیا تھا۔ لاہور کے وکیل کے بیان کے مطابق یہ علاقہ غلطی سے متنازعہ علاقوں کی فہرست

اپنی تحویل میں لینے کا فیصلہ کیا پھر میاں لوذ کے وارثوں کے حقوق پر بھی غور کرنا تھا۔

فیروز پور پر رنجیت سنگھ کے دعووں کو نامنظور کیا گیا تھا۔ لاہور کے مہاراجہ کا دعویٰ تھا کہ فیروز پور کے سکھ اس کی سب سے پرانی رعیت ہیں۔ نہار سنگھ اٹاری والا جو 1805ء میں رنجیت سنگھ کی آسامی تھا اس کا اطاعت گزار تھا۔ جب فیروز پور کے سکھوں اور نہال سنگھ کے درمیان جھگڑا ہو گیا تو وہ بابا صاحب کی تحویل میں چلے گئے۔ وہ ان کو علاقہ کی سابقہ آمدنی کا جو تھا حصہ ادا کرتا تھا۔ سکھوں نے کچھ گڑبڑ کی تو رنجیت سنگھ کے وکیل آنند سنگھ نے کیپٹن برک کو لکھا "کہ ان کو قانون میں رکھا جائے "اس عرضداشت کی پشت پر کیپٹن برک نے لکھ دیا کہ فیروز پور کے سکھوں کو وہاں سے نکال دینا یا ان کو سزا دینے کا حکم صرف ان لوگوں کو ہے جو مہاراجہ کے معاملات کی نگرانی کرتے ہیں کیپٹن راس کے زمانے میں فیروز پور کے سرداروں میں سے ایک دھنا سنگھ کی بیوہ نے کیپٹن راس کو دھرم سنگھ اور کوشل سنگھ کے خلاف ایک عرضی دی جس پر اس نے حکم دیا کہ وہ عرضی مہاراجہ کے وکیلوں کے حوالے کر دی جائے۔ ان پچھلے فیصلوں اور حقوق کی مانگ کو رد کرنے کی وجوہ ہند سرکار اور اس کے نمائندوں کے درمیان خط و کتابت میں دی گئی ہیں۔ مرے نے لکھا ہے کہ دارالخلافہ لاہور صرف چالیس میل کی دوری پر ہے اور بیچ میں صرف ایک دریا کو پار کرنا ہوتا ہے جو سال میں چھ ماہ پیدل ہی عبور کیا جا سکتا ہے فیروز پور کی چوکی ہر لحاظ سے انگریزی حکومت کے لیے بڑی اہم تھی۔ حاکم لاہور کی بڑھتی

میں درج ہو گیا تھا۔

خلاّل ماجرہ، حسن پور اور اجک :۔ یہ علاقے آہلوا لیہ مسل کی جدی جائیداد کا حصہ تھے اور فتح سنگھ آہلوا لیہ نے موجودہ خاندان کو یہ علاقے عطا کیے تھے۔ 1826ء میں ہمت سنگھ کی وفات پر جس کو فتح سنگھ نے عطیہ دیا تھا، انگریزوں نے مداخلت کی اور یہ عطیہ فتح سنگھ کی خواہش کے خلاف ہمت سنگھ کے وارثوں سے لے لیا گیا۔

کوٹ گورو ہرشہ :۔ اس علاقہ میں 1811ء میں براہ راست مداخلت کے پیش نظر انگریزوں نے اس پر اپنے تسلط کا اعلان کیا۔

ملّی :۔ رنجیت سنگھ کے تسلط کی اس علاقہ پر کوئی وجہ جواز نہ تھی۔

ہوئی ہوس ملک گیری کو روکنے کے لیے اس چوکی کو اپنے تسلط میں رکھنا انگریزوں کے لیے ضروری تھا۔ سردارنی لچھمی کور نے 1824ء میں جب انگریزوں کو یہ پیش کش کی کہ اس کے مقبوضات کے عوض اسے ہریانہ میں اتنی ہی اراضی اپنے باپ کی جائیداد کے قریب دے دی جائے تو انگریزی حکومت نے اسے نامنظور کر دیا البتہ یہ ہدایت کر دی کہ کسی بھی حالت میں ان مقبوضات پر رنجیت سنگھ کو قبضہ کرنے کی اجازت نہ دی جائے اور کسی حالت میں یہ نہ سمجھا جائے کہ گورنر جنرل نے تبادلہ کی تجویز کو ٹھکرا دیا ہے کیونکہ ایسا کرنے سے رنجیت سنگھ کے دل میں اندیشہ پیدا ہو سکتا ہے اور وہ اسے دخل اندازی سمجھ کر اعتراض اٹھا سکتا ہے اس لیے فی الحال رانی کی پیش کش کو منظور نہیں کیا جا سکتا۔ بالآخر 1835ء میں انگریزوں نے فیروز پور پر قبضہ کر لیا اور 1838ء میں وہاں فوجی چھاونی بنا دی گئی۔ اس کی (لاہور کے) کھلے دربار میں مخالفت کی گئی۔ کہا گیا کہ انگریز نزدیک سے نزدیک تر آتے جا رہے ہیں۔ مہاراجہ نے بھی اپنی بے چینی کا اظہار کیا، فیروز پور کے ہاتھ سے نکل جانے سے ظاہر ہوتا تھا کہ مہاراجہ کا سیاسی اقتدار کمزور پڑ رہا ہے۔ انگریزوں کے فیروز پور پر قبضہ کرنے کے فوراً بعد ہی 1836ء میں رنجیت سنگھ نے قصور میں ایک چھاؤنی قائم کرنے کی کوشش کی۔

فروری 1823ء تک ستلج پار کے پڑوسی کی حیثیت سے رنجیت سنگھ کی طرف انگریزی حکومت کے رویّہ پر لدھیانہ کے انگریزی پولیٹیکل اسسٹنٹ مرے کا بہت اثر ہوا۔

رہوارہ و توگل :۔ یہ دونوں گاؤں مذہبی وقف تھے۔ اس کے مالکان کے بیچ جب کبھی کوئی چھوٹا موٹا تنازع ہوا تو وہ اپنی شکایت حسب خواہش کسی کے پاس لے جاتے تھے۔ 1820ء میں انہوں نے لاہور دربار سے تحفظ کی درخواست کی اور 1821ء میں وہ پٹیالہ راج کی حفاظت میں چلے گئے۔ انگریزی حکومت نے اس بات کو کوئی اہمیت نہ دی کہ وہ کسی حکومت کی رعایا ہیں۔

آنند پور، لکھووال :۔ 1807ء میں حکم چند نے کوٹ کپورہ، منی ماجرا، رسیہا اور ہتھاوٹ پر قبضہ کر لیا۔ آنند پور، لکھووال، ہتھاوٹ کے علاقہ میں واقع ہے۔ حکم چند نے کرتار پور میں جو پہلے سے ہی رنجیت سنگھ کے تسلط میں تھا ایک فوجی دستہ رکھا۔ بہرحال دیوان نے سوڈھیوں کے مسلمہ حقوق میں کسی قسم کی دخل اندازی نہیں کی۔ 1824ء میں آنند پور، لکھووال میں جو سوڈھیوں

رنجیت سنگھ کو ستلج کے جنوب میں اپنی حکومت محفوظ کرنے کی اجازت نہیں دی گئی اور نہ جنوبی ریاستوں میں سے کسی کو رنجیت سنگھ کے ساتھ گٹھ جوڑ کرنے کی اجازت دی گئی۔ انگریزی حکومت رنجیت سنگھ پر نگاہ رکھنے لگی۔ جیسا کہ مرے نے لکھا ہے کہ انگریزی حکومت کو کسی پل بھی اپنے اصلی مدعا کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ جس کے حصول کے لیے ہماری فوجیں سرحد کی طرف بتدریج بڑھ رہی ہیں۔ مشکوک معاملات میں کوئی بھی باقاعدہ اعلان ستلج کے شمالی کنارے کے سرداروں کو پریشان کر سکتا ہے اس لیے کسی بھی معاملہ میں اس وقت تک باقاعدہ اعلان نہ کیا جائے جب تک مہاراجہ خود کسی معاملہ میں انگریزی سرکار کی فیصلہ کن رائے طلب نہ کرے۔ جو چھوٹی چھوٹی ریاستیں انگریزی علاقہ اور لاہور ریاست کے درمیان واقع تھیں وہ سب مکمل طور پر انگریزوں کے زیر نگیں ہو گئیں۔ ستلج کے اس پار کے معاملات پر انگریزی سرکار اور رنجیت سنگھ کے تعلقات دوستانہ نہیں تھے۔ ہمیں ان کی باہمی خط و کتابت کی سیاسی لفاظی اور زبان کی شستگی سے گمراہ نہیں ہونا چاہیے۔

1823ء میں ویڈ (Wade)، لدھیانہ کا پولیٹیکل اسسٹنٹ مقرر کیا گیا اور مرے کو انبالہ میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی لاہور دربار سے انگریزی خط و کتابت کی زبان میں کافی تبدیلی دکھائی دینے لگی۔ وادنی کے معاملہ پر اور آہلو والیہ کے مقبوضات پر جو رنجیت سنگھ نے بطور جاگیر دئے تھے، ویڈ نے رنجیت سنگھ کے حقوق کی حمایت کی۔

(حاشیہ پچھلے صفحہ سے آگے)

کے تسلط میں تھا، حالات بدتر ہو رہے تھے، راس تنہا نے ایجنٹ کے ذریعہ مہاراجہ مرے کی خدمت میں یہ تجویز پیش کی کہ حالات کے تصفیہ میں انگریزوں کا تعاون بھی شامل ہو۔ تجویز کو سوڈھیوں کی رضامندی حاصل کیے بغیر ماننے سے انکار کیا گیا۔

1842ء میں ستلج کے اس پار کے لاہور دربار کے مقبوضات سے 17 لاکھ روپے سالانہ لگان کا تخمینہ لگایا گیا تھا۔

(اینڈریو۔ ڈی۔ کرز۔ انگریزی حکومت اور مقامی جنوب، مغربی سرحدی ریاستوں کے درمیان سیاسی رابطہ، صفحہ 128)

لہٰذا ان علاقوں پر لاہور دربار کی بالادستی کا اعلان کیا گیا اس طرح کانگ سردار ہری سنگھ کو رنجیت سنگھ کا باج گذار ہونے کا علان کیا گیا۔ ماچھی واڑہ کے سوڈھی مکھووال اور آنند پور کو بھی لاہور دربار کی رعایا تسلیم کرنا ضروری سمجھا گیا۔ ممدوٹ کا سردار بھی لاہور دربار کا وفادار رہا (7)، جہاں تک فیروزپور کا تعلق تھا اس معاملہ میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی۔ 1823ء کے بعد ستلج کے اس پار کے علاقوں کے جھگڑے نپٹاتے وقت کئی چھوٹے چھوٹے معاملات میں انگریزی حکومت جھکتی دکھائی دی لیکن دوسری طرف رنجیت سنگھ کے کئی بڑے بڑے علاقوں پر یکے بعد دیگرا اپنا حق جتانے لگی۔ ہاں اس کو تسلی دینے کے لیے چھوٹے موٹے علاقے اس کو دے دیے۔ لیکن ایسا کرتے ہوئے انگریزوں نے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ رنجیت سنگھ کے ستلج کے علاقے منتشر رہیں اور ان کو یکجا کرنے کی کوششوں کو کامیاب نہ ہونے دیا جائے۔ ان غیر اہم علاقوں سے دستبردار ہوکر انگریزوں کو ایک اور فائدہ بھی ہوا کہ ویڈ جو انگریزی سیاست کا بنیادی مہرہ تھا رنجیت سنگھ اس پر کافی مہربان ہوگیا۔ (8)

جیک مونٹ (Jacquemont) نے 1829ء میں لکھا کہ اگر آپ کو معلوم ہو کہ رنجیت سنگھ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی سرحدوں کو توڑا ہے تو آپ اپنے آپ کو مبارک باد دیں کہ اس طرح آپ کو راہ چلتے "ایشیائی جنگ دیکھنے کا موقع مل جائے گا۔ یا اگر ہمالہ لوٹ کر پاش پاش ہو جائے (جو یقیناً اتنا ہی ناممکن ہے جتنا رنجیت سنگھ کا حملہ) اور بنگال کے میدانوں کی طرح ہموار ہو جائے تو بھی آپ اپنے آپ کو مبارک باد دیں کہ اس طرح آپ کو سطح ارض کی تہوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع مل جائے گا" (9) اس ذہین فرانسیسی سیاح نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ رنجیت سنگھ کے دماغ میں یہ بات گھر کر گئی ہے کہ وہ ہتھیاروں کے ساتھ ٹکر لینے کے ناقابل ہے۔ اس سلسلے میں اس نے کئی وجوہات پیش کی ہیں۔ گورکھوں کے وکیل پرتھی بلاس سے ملاقات کی اور استدعا کی کہ وہ انگریزوں کے خلاف لڑائی میں اس کا ساتھ دے اور ساہوکاروں سے کہہ کر پانچ لاکھ روپے دلوانے کے علاوہ گورکھوں کو گنگا اور جمنا عبور کرنے میں امداد دے۔ انگریزوں کے خلاف گورکھوں کو امداد دینے سے مہاراجہ نے انکار کر دیا حالانکہ بعد میں انگریزوں نے نیپال جنگ میں جب گورکھوں کو پڑوسی علاقوں سے پیچھے ڈھکیل دیا تو مہاراجہ نے

مایوسی کا اظہار کیا۔ 1820ء میں ناگپور کے سابق راجہ کی عرضداشتوں کا رنجیت سنگھ پر کوئی اثر نہ ہوا۔ (11) اسی طرح 1822ء میں سابق پیشوا باجی راؤ دوم کی اپیلوں کا اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ (12) پہلی انگریز برما جنگ کے دوران (13) رنجیت سنگھ پر فضول نگرانی رکھی گئی۔ 26-1825ء میں بھرتپور کے لوگوں نے اس کی امداد چاہی مگر اس نے انکار کر دیا رنجیت سنگھ نے آسبورن (Osborne) کو چند سال کے بعد بتایا کہ جب انگریز فوج بھرتپور پر حملہ کرنے کی تیاری میں مصروف تھی تو اس وقت اس کی فوج کشمیر پر حملہ کرنے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ بھرتپور کے سردار نے اسے یہ پیش کش کی کہ اگر وہ (رنجیت سنگھ) ان کے پاس بیس ہزار سپاہی بھیجے تو کوچ کے ہر دن کا معاوضہ ایک لاکھ روپیے اور اس کے علاوہ پچاس ہزار روپے فی دن دیا جائے گا۔ رنجیت سنگھ نے یہ بھی بتایا کہ اس کے آدمی اس پیش کش کو قبول کرنے کے حق میں تھے۔ جیک مونٹ (14) نے رنجیت سنگھ کے بارے میں جو رائے قائم کی تھی واقعی درست تھی۔ اس کے باوجود انگریزی حکومت ہمیشہ اسے شک کی نظر سے دیکھتی رہی کیونکہ انگریز جانتے تھے کہ رنجیت سنگھ کبھی نچلا نہیں بیٹھ سکتا۔ لہذا ان حالات میں اس پر نگرانی قدرتی طور پر ضروری تھی۔

اس سلسلے میں یہ بتانا ضروری ہے کہ ویڈ (Wade) کا یہ دعویٰ کہ اس نے رنجیت سنگھ کو برما یا راجہ بھرتپور کا ساتھ دینے سے روکا تھا، بالکل ہی غلط ہے (15) کیونکہ رنجیت سنگھ کو ویڈ پر اتنا بھروسہ نہیں تھا کہ اس کا مشورہ رنجیت سنگھ کی پالیسیوں پر کسی طرح سے اثر انداز ہوتا۔ ایسا دعویٰ کر کے ویڈ فقط اپنے آپ کو دھوکا دے رہا تھا۔ رنجیت سنگھ اسے زیادہ سے زیادہ دوسروں کی آواز بازگشت خیال کرتا تھا۔

1827ء اور 1831ء کے درمیان پشاور کی سرکشی نے جس کا سرغنہ سید احمد تھا، رنجیت سنگھ کو برسرپیکار رکھا۔ اسی طرح اس سکھ سردار کو روک کر سید نے بلاواسطہ انگریزوں کی ایک بہت بڑی خدمت سرانجام دی تھی۔ 1831ء میں جب سید احمد مارا گیا تو ویڈ نے سکریٹری آف سٹیٹ کو لکھا کہ سکھوں نے سید احمد کو جس نے پانچ سال تک ان سے مقابلہ کیا تھا ختم کر دیا ہے اور اب وہ اپنی آئندہ

کی مہموں کے بارے میں غور کر رہے ہیں۔ ان کی زندگی مسلسل لڑائی اور جدوجہد کی زندگی تھی اور اتنے عظیم لاؤ لشکر کی موجودگی میں اس مہم کو سر کرنے کے بعد مہاراجہ جلد ہی کسی دوسری مہم پر اپنی توجہ مرکوز کرے گا۔ مرکزی حکومت نے سید احمد کو براہِ راست یا بالواسطہ کوئی امداد نہیں دی البتہ ان کی ملی بھگت سے انگریزی رعایا سید احمد کو خفیہ طور پر امداد دیتی رہی۔ 1827ء میں دہلی کے ریذیڈینٹ مٹکاف نے سکریٹری آف اسٹیٹ کو لکھا کہ "سکھوں کے علاقہ پر حالیہ حملوں کے دوران دہلی کے لوگوں کو سکھوں کی کامیابی مشکوک دکھائی دیتی تھی۔ انجام کار بہت سے لوگ اپنا گھر بار چھوڑ کر سید احمد کے ساتھ جا ملے۔ کمپنی کے کئی ملازم نوکری چھوڑ کر چلے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ دہلی کے بادشاہ نے لوگوں کو ایسا کرنے کے لیے اکسایا تھا۔ اگر واقعی بادشاہ نے ایسا کیا تو کسی نے اس کی طرف اس (مٹکاف) کی توجہ مبذول نہیں کرائی (۱۶۱)

سید احمد سے فراغت پا کر رنجیت سنگھ نے اب سندھ کی طرف توجہ دی۔ لیکن انگریزی حکومت ہوشیار تھی۔ رنجیت سنگھ کو سندھ کی طرف بڑھنے میں کچھ وقت لگا اور اسی بیچ انگریزوں نے اس معاملہ میں اسے مات دے دی، روپڑ کے مقام پر جب کہ گورنر جنرل اور رنجیت سنگھ دوستی کا دم بھر رہے تھے عہ کرنل پوٹنجر (Pottinger) بحری معاہدہ جیب میں لیے سندھ کو روانہ ہو گئے۔ ہندوستان کے سوداگروں اور بیوپاریوں کو سندھ کی سڑکوں اور دریاؤں کا استعمال کرنے کے معاہدہ پر بصد مشکل اور پس و پیش کے بعد امرائے سندھ راضی ہوئے۔ اس طرح مفادِ عامہ کے نام پر یہاں بھی رنجیت سنگھ کی ناکہ بندی کی گئی۔ لیکن رنجیت سنگھ بھانپ گیا کہ جس طرح بنگال میں تجارتی مراعات حاصل کرنے کے بعد انگریز وہاں پر قابض ہو گئے تھے ٹھیک (۱۶۲)، وہی کھیل انہوں نے سندھ میں شروع کر دیا ہے۔

عہ روپڑ کی ملاقات کے خفیہ مقاصد :- ہندوستان پر روسی حملہ کے پیشِ نظر ضروری ہو گیا کہ دنیا کے سامنے انگریزی حکومت اور لاہور دربار کی باہمی یگانگت کا مظاہرہ کیا جائے۔ رنجیت سنگھ بھی اس بات کی پرزور حمایت کرنا چاہتا تھا کہ انگریزی حکومت اسے "لصر" کا سربراہ تسلیم کرتی ہے۔

اس کے باوجود رنجیت سنگھ اس موقع پر جھک گیا۔ 36-1834ء میں رنجیت سنگھ نے شکارپور اور سندھ کے علاقوں پر دوبارہ حقوق کا مطالبہ کیا مگر ہمیشہ وہ ہچکچاتا ہی رہا اور بالآخر انگریزی حکومت کے مضبوط رویہ نے اسے اپنا ارادہ ترک کرنے پر مجبور کر دیا۔ چیف سکریٹری نے لکھا کہ "ان پڑوسی ریاستوں پر جن سے انگریزوں کا معاہدۂ دوستی ہے، رنجیت سنگھ کے حملہ آور منصوبوں کو (کونسل میں) گورنر جنرل ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ جواب میں ویڈ نے سکریٹری کو لکھا کہ بڑے وسیع علاقوں پر رنجیت سنگھ پہلے ہی سے قابض ہو چکا ہے۔ اور اپنے ارادوں میں بلاتاخیر تکمیل اس کی فطرت بن چکی ہے۔ لہٰذا شکارپور اور دوسرے علاقوں کو فتح کرنے میں اپنے آپ کو حق بجانب سمجھتا ہے۔ ان حالات میں میری طرف سے لگائی گئیں پابندیاں اسے ناگوارِ خاطر تو ضرور ہوں گی مگر انگریزی حکومت جس نئی پالیسی پر عمل پیرا ہونے پر تلی ہوئی ہے (۱۸) اس سے وہ بے خبر نہیں رہ سکتا۔ اپنے سرداروں کو اکسانے کے باوجود رنجیت سنگھ پھر ایک بار جھک گیا۔ رنجیت سنگھ کی سندھ کی طرف پیش قدمی روکنے کا بدلہ یہ ملا کہ انگریز سرکار نے 1838ء میں سندھ کے امیروں سے حیدرآباد میں ایک ریذیڈینٹ رکھنے کی منظوری حاصل کرلی۔ حالانکہ شروع میں ان امیروں نے اس میں کافی پس و پیش کیا تھا۔

اس سلسلہ میں یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ سندھ کی تسخیر رنجیت سنگھ کے لیے کتنی اہم ہو سکتی تھی۔ اوّل تو رنجیت سنگھ کو انگریزی حکومت کی وساطت کے بغیر دوسرے ملکوں کے ساتھ سلسلۂ رسل و رسائل قائم کرنے کا موقع مل جاتا دوسرے جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے سندھ اور پنجاب اسی طرح سندھ کے صوبے ہیں جس طرح بنگال اور بہار گنگا کے صوبے ہیں۔ یہ صوبے اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک ایسا حصہ بن جاتے ہیں جن کو دریا، پہاڑ، سمندر یا ریگستان دوسرے حصوں سے الگ کرتے ہیں۔ اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ سندھ کے معاملہ پر رنجیت سنگھ انگریزوں کے آگے کیوں جھک گیا۔ اس مسئلہ پر انگریزوں کے سامنے بخوشی گھٹنے ٹیک دینے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں تک انگریزی حکومت کا تعلق تھا رنجیت سنگھ بہت ہی کمزور اور ڈرپوک تھا۔ سکریٹری نے 1836ء میں لکھا کہ " رنجیت سنگھ ہماری

طاقت سے خوفزدہ ہے اور یہی ڈر اس بات کی گارنٹی ہے کہ وہ انگریزی حکومت کے نظریات اور خواہشات کے خلاف اس وقت تک نہیں جائے گا جب تک ہم اسے بطور دوست اپنے ساتھ رکھیں گے۔ ہیوجل (Huegel) نے بھی اس بات کی تصدیق کی ہے کہ رنجیت سنگھ ہندوستان میں انگریزی حکومت سے اتنا آزاد ہے جتنا کہ ایک کمزور پڑوسی ہو سکتا ہے (۱۹)۔

آہستہ آہستہ رنجیت سنگھ کو بخوبی معلوم ہو گیا کہ افغانستان کے معاملہ میں انگریزوں کی دلچسپی سیاسی رُخ اختیار کرے گی اسے اس بات کا پتہ چل گیا کہ اس کو تحائف پیش کرنے کے بہانے الیگزینڈر برنز (Alexander Burnes) نے سندھ کے بارے میں چھان بین کی۔ 1832ء میں الیگزینڈر برنز ایک عام مسافر کی حیثیت سے پشاور اور جلال آباد کے راستے کابل اور وہاں سے وسط ایشیا گیا اور جب وہ ہندوستان لوٹا تو اس نے اپنی ساری معلومات گورنر جنرل کو دیں۔ ویڈ نے نومبر 1834ء میں لکھا کہ افغانوں کے معاملات میں ہماری بڑھتی ہوئی دلچسپی اور افغانستان میں لیفٹیننٹ برنز کا سفر اور بعد ازاں افغان سرداروں سے اس امر کی خط و کتابت کرنا کہ وہ ان سے دوبارہ رابطہ قایم کرنا چاہتا ہے۔ ان باتوں کے پیش نظر مہاراجہ کو یقین ہو گیا ہے کہ ہم اس ملک کے ساتھ سیاسی تعلقات قایم کرنے کے بارے میں غور کر رہے ہیں (20) نومبر 1836ء میں پھر ایک بار برنز کو بظاہر کسی تجارتی مقصد کے لیے افغانستان بھیجا گیا۔ اس نے کابل پہنچنے کے فوراً بعد ہی لکھا کہ اس کو یہاں کے معاملات دیکھنے اور اس بات کا فیصلہ کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا کہ اس کے بعد کون سا اقدام مناسب ہوگا۔ مگر اس کے بعد کا وقت تو پہلے ہی آچکا ہے۔ (21) اکتوبر 1837ء میں اس نے لکھا کہ ہم راجہ رنجیت سنگھ کے ساتھ معاہدہ کی سرحد تک پہنچ چکے ہیں۔ اس معاہدہ کی شرائط کی بنیاد یہ ہوگی کہ رنجیت سنگھ پشاور سے ہٹ جائے گا۔ اور اسے کسی بارک زئی کی تحویل میں دے دے گا جو لاہور دربار کا باج گذار ہوگا۔ کابل کا سردار بھی اپنے بیٹے کو رنجیت سنگھ سے معافی مانگنے کے لیے بھیجے گا (22) برنز نے سوچا کہ پشاور پر سلطان محمد کے قابض ہو جانے سے اس علاقہ پر انگریزوں کا اثر و رسوخ بڑھ جائے گا۔ دوست محمد اس بات کا قطعی مخالف

تھا کہ پشاور سلطان محمد کے حوالے کیا جائے اس کی طرف سے یہ تجویز پیش ہوئی کہ پشاور کا علاقہ امیر دوست محمدؐ اور سلطان محمدؐ دونوں کی تحویل میں دیا جائے اور اس کے بدلے رنجیت سنگھ کو اس کا معاوضہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ سب کچھ برنز کی جلدبازی اور شدت جوش کا نتیجہ تھا۔ مگر یہ تجویز 1837ء میں رنجیت سنگھ کے ایجنٹ کے سامنے پیش کی گئی تھی کہ پشاور پر سلطان محمدؐ کی حکومت کو اس شرط پر بحال کیا جائے کہ اس کی فوجی حکومت کی ذمہ داری سکھوں پر ہو۔ مہاراجہ نے (23) ایسی پالیسی کے خاکہ کو دیکھ کر خاموشی اختیار کر لی۔ خود گورنر جنرل نے 1837ء میں تحریر کیا کہ "میرا پختہ یقین ہے کہ افغانوں کے ساتھ مناسب معاہدہ رنجیت سنگھ کے لیے فائدہ مند ہوگا۔ اس علاقہ میں امن و آشتی قائم رکھنے کے لیے مہاراجہ کو افغانوں سے سمجھوتے کی ترغیب دینے پر کچھ سکھ سرداروں اور جنگ بازوں کی عارضی ناپسندیدگی کے باوجود بھی میں نے کسی کی دخل اندازی کے بغیر اس مقصد کو حاصل کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ (24) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح مشرق اور جنوب میں ہوا تھا، وہی حالات اس معاملہ میں ظہور پذیر ہوں گے۔ مگر روسی سازشوں اور ایران کی مخالفت نے بات چیت کے رُخ کو بدل دیا۔ روسی ایجنٹ وکووچ (Vikovech) کابل میں تھا اور وہ رنجیت سنگھ کے ساتھ بات چیت کرنے کو تیار بھی تھا۔ ایرانیوں نے ہرات کا محاصرہ کر لیا اور قندھار کے بارک زئی ایرانیوں کے ساتھ اس سازش میں شامل ہو گئے۔ ان حالات کے پیش نظر لارڈ آک لینڈ نے دوست محمدؐ کی طرف دوستی کا رویہ ترک کرنے کا فیصلہ کیا کیوں کہ وہ پشاور پر قبضہ کرنے کے لیے مُصر تھا۔ آک لینڈ نے ہاب ہاؤس (Hobhouse) کو لکھا "اس کے لیے اگر ہم سکھوں سے جھگڑا کریں تو یہ سراسر پاگل پن ہوگا۔ حالانکہ ہم اس بات کے خواہش مند ہیں کہ اس کی آزادی برقرار رہے۔ (25) سائکس (Sykes) کہتا ہے کہ مغلوب رنجیت سنگھ کو انگریزی پالیسی کا سہارا بنانا سراسر احمقانہ قدم تھا لیکن (26) حقیقت یہ ہے کہ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا پشاور پر دوست محمد کے حق کو تسلیم کرنے سے مہاراجہ یقیناً انگریزوں کا مخالف ہو جاتا جب کہ ہرات ایران کے گھیرے میں تھا۔ اور وکووچ کابل میں موجود تھا۔ اس پالیسی پر عمل کرنا انگریزوں کے

لیے کسی طرح بھی خطرہ سے خالی نہ تھا۔ 25 اپریل 1838ء کو برنز کابل سے چلا آیا۔
مئی 1838ء میں میکناٹن (Macnaghten) لاہور آیا۔ اور اس کی وساطت
سے تین فریقوں (انگریز، افغان اور رنجیت سنگھ) کے درمیان ایک سمجھوتہ ہوا، اس
سمجھوتہ سے پانچ سال پہلے رنجیت سنگھ نے شاہ شجاع سے جو معاہدہ کیا تھا نئے معاہدہ
میں بہت حد تک اس سمجھوتے کی شرط کو دہرایا گیا اور اس کے ساتھ ہی کچھ نئی شرائط
شامل کر دی گئیں۔ دراصل یہ سہ فریقی سمجھوتہ رنجیت سنگھ اور شاہ شجاع کے مابین ایک
معاہدہ تھا۔ جس کی گارنٹی انگریزوں کی طرف سے دی گئی تھی۔ اس سمجھوتہ کے دو پہلوؤں
کو ٹھیک طور پر واضح نہیں کیا گیا۔ حقیقت میں اس سمجھوتے کے ذریعہ رنجیت سنگھ پر روک
لگانا ہی انگریزوں کے مدِنظر تھا۔ اور رنجیت سنگھ بھی اس سے بے خبر نہ تھا، انگریزوں
کے نقطۂ نظر سے یہ سہ فریقی سمجھوتہ روس اور ایران کی چالوں کو ناکام بنانے کے لیے
طے کرنا پڑا۔ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ ایک طرف دوست محمد اور وکووچ کے درمیان
بات چیت چل رہی تھی اور دوسری طرف ایرانیوں نے 23 نومبر 1837ء سے 9 ستمبر
1838ء تک ہرات کو محاصرہ میں کر لیا تھا۔ بہرحال یہ معاہدہ سکھوں کے سندھ پر
حملہ کرنے کے ارادوں کو ناکام بنانے کے لیے انگریزوں کے منصوبوں کی اگلی کڑی
کڑی تھا۔ اس سمجھوتہ کی دفعہ ۱۶ کے مطابق شاہ شجاع سندھ پر اپنے اور اپنے وارثوں
کے حقوق، حکومت اور بقایا رقم بطور خراج بذمہ امرائے سندھ سے اس شرط پر دستبردار
ہوتا ہے کہ انگریزی حکومت کی مصالحت سے طے شدہ رقم سندھ کے امرا سے ادا کریں
گے اور اسی رقم میں سے پندرہ لاکھ روپے رنجیت سنگھ کو دیے جائیں گے۔ اس
رقم کی ادائیگی پر 12 مارچ 1833ء کے معاہدہ کی دفعہ نمبر ۴ منسوخ سمجھی جائے گی۔
اور سندھ کے امیروں کے درمیان رسمی خط و کتابت اور تحفہ و تحائف کا لین دین بدستور
جاری رہے گا۔

یہ سہ فریقی سمجھوتہ 26 جون 1838ء کو طے پایا۔ 23 جولائی کو اس پر منظوری کی
مہر ثبت ہوئی۔ رنجیت سنگھ بارک زئیوں کو خوف زدہ کرنے کے لیے اکثر شاہ شجاع
کو آگے کھڑا کر دیتا تھا۔ 34-1833ء میں شاہ شجاع نے جو دوبارہ تخت نشینی کی
کوشش کی تھی، رنجیت سنگھ نے اس کا پورا ساتھ دیا۔ یہ شاید اس لیے کیا گیا کہ ہر

فرد اس مہم کے ساتھ انگریزوں کو وابستہ سمجھتا تھا۔ شاہ شجاع کی 1836ء کی مہم کے
بارے میں ایلین برو نے لکھا ہے کہ "افغانستان کے حاکموں نے قدرتی طور پر سمجھا کہ
اس مہم کو انگریزی حکومت کی شہ حاصل ہے اور یہی سارے وسط ایشیا کا خیال
تھا۔ فریزر (Fraser) کے سفر نامے سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ دور دراز تک
ترکمان علاقوں میں بھی یہ احساس تھا کہ اس تحریک میں انگریز شامل تھے اور ان کے
علاقوں پر انگریزوں کی نظریں تھیں۔ اس شدتِ احساس کے باعث ترکمان علاقوں
میں کسی بھی یورپین کا جانا خطرہ سے خالی نہ تھا (27) 1838ء میں رنجیت سنگھ کو
شروع میں بہت تامل ہوا اور دراصل یہ تامل اس کی مخالفت کا آئینہ دار تھا۔
افغانستان کے بارے میں ویڈ کے خطوط کا شروع میں اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ ویڈ
نے اندازہ لگایا کہ غالباً وہ مزید واقعات رونما ہونے تک اس معاملہ پر (28) غور
نہیں کرنا چاہتا تھا، اس بارے میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ اس اسکیم میں رنجیت سنگھ
ناراضامند حصہ دار کی حیثیت سے شریک ہوا۔ اس نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ اب مغرب
میں انگریزوں کی طاقت کے ماتحت ان کے کسی ساتھی سے اسے واسطہ پڑنے والا
تھا اس کے ساتھ ہی اسے یہ بھی بخوبی معلوم تھا کہ اس معاہدہ سے الگ رہنا بھی اس
کے لیے مفید نہ ہوگا۔ میکناٹن کے ایک ہمراہی میکسن (Mackeson) نے رنجیت
سنگھ کو بتایا کہ اپنی حفاظت کے لیے وہ شاہ شجاع کو بحال کرانے کے مقصد میں اپنی
فوجوں کا استعمال کرنے سے بھی گریز نہ کریں گے۔ یہ بات بھی میکناٹن نے فقیر عزیز الدین
کو بتائی تھی لہٰذا النگھم کا یہ دعویٰ غلط نہ تھا کہ اس بات کا کوئی تحریری ثبوت نہیں کہ
رنجیت سنگھ پر یہ بات واضح کر دی گئی تھی کہ اگر وہ اس سمجھوتہ کا فریق نہ بنے گا تو اسے
اس سمجھوتہ سے خارج کر دیا جائے گا۔ بہرحال طویل بات چیت کے دوران اس معقول
دلیل کا استعمال کیا گیا تھا (29) اس سہ فریقی سمجھوتہ کے سات دن پہلے میکناٹن کے
ہمراہی آسبورن نے لکھا "کہ وہ بوڑھا شیر (رنجیت سنگھ) پینترہ بدل رہا ہے
اور ناقابلِ قبول مراعات حاصل کرنے کے ارادہ سے سمجھوتہ پر دستخط کرنے سے انکار
کرتا ہے" (30) آسبورن کا یہ اندراج سہ فریقی سمجھوتہ کے لیے رنجیت سنگھ کی مخالفت
کو روزِ روشن کی طرح نمایاں کر دیتا ہے۔ لیکن بالآخر رنجیت سنگھ کو جھکنا پڑا۔

رنجیت سنگھ نے تمام ممکن پیش بندیاں کیں۔ شاہ شجاع اور انگریزوں نے اسے اپنے مقبوضات کے بارے میں پوری گارنٹی دی۔ شاہ شجاع الملک نے درۂ خیبر تک اور دریائے سندھ کے دونوں کناروں پر واقع پشاور کے مطیع سب علاقوں پر سے اپنے اور اپنے وارثوں کی دستبرداری کا اعلان کیا اور ان پر رنجیت سنگھ کی حکومت کو تسلیم کیا۔ اس موقع پر آک لینڈ شاہ شجاع کی طرف سے کوئی خاص مداخلت کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ مئی 1838ء میں اس نے لکھا کہ "رنجیت سنگھ شاہ شجاع کی کچھ فوج کو کام دے کر شاہ کی امداد کرے۔ ہم (انگریز) کچھ مالی امداد دینے کے علاوہ اس کے دربار میں اپنا ایجنٹ رکھیں گے اور اس کی فوج کی تربیت کے لیے کافی افسروں کو مقرر کر کے شاہ کی امداد کریں گے" (31)۔ یہ امر قابل غور ہے کہ سہ فریقی سمجھوتہ میں انگریزی سرکار نے اپنی فوجوں کو سرحد سے پار بھیجنے کا کہیں وعدہ نہیں کیا تھا اور اس سے یہ امید نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ ایک ایسی سپاہ منظم کرے گا جو کامیابی سے مورچہ لے سکے گی۔ اس لیے آک لینڈ کا اس فیصلہ پر پہنچنا غیر قدرتی نہیں تھا کہ شاہ شجاع کو تخت نشین کرانے کے لیے ایک انگریزی فوج کا دستہ کابل بھیجا جائے۔ اس طرح لارڈ آک لینڈ نے جولائی 1808ء میں اس کابل کی مہم کو سر کر لیا اور یہ سمجھوتہ افغانستان پر حملے کے ایک وسیع منصوبہ کی شکل اختیار کر گیا۔

یہ صورت حال توقع کے خلاف نہ تھی۔ پیٹر اعظم کے چودہ آرٹیکلوں پر مشتمل مسودہ (Testament) کے بارے میں شکوک و شبہات رکھتے ہوئے بھی روسیوں اور انگریزوں نے اسے حق بجانب مان لیا تھا۔ اس کے ایک آرٹیکل کے مطابق روسی حاکموں کو اس بات سے باخبر رہنا تھا کہ "ہندوستان کے ساتھ تجارت کا مطلب دنیا کے ساتھ تجارت ہے" اور جو بھی اس ملک کی تجارت پر مکمل طور پر قابض ہوگا وہی یورپ کا ڈکٹیٹر یعنی مختار کل ہوگا۔ جیسا کہ پیٹر کے مبینہ معاہدہ سے ظاہر ہے انگریزوں اور روسیوں کی عداوت ترکمان چئی (Turkomanchai) کے معاہدہ کے ساتھ 1828ء میں شروع ہوئی جس کے مطابق روسیوں نے ایران پر کڑی شرائط عائد کی تھیں۔ سارے مشرق وسطیٰ میں روسی اثر و رسوخ کے پھیلاؤ کو روکنے کے لیے برطانوی مزاحمت کی کوششیں بہت بڑھ گئی تھیں۔ ہندوستان میں داخل

ہونے کے درّے ہونے کی حیثیت سے ایک بار پھر میسوپوٹیمیا ایران اور افغانستان کی فوجی اہمیت بڑھ گئی۔ روسیوں کے جذبہ کو روکنے کے تحت انگریزوں نے آہستہ آہستہ افغانستان پر بالواسطہ اپنی حمایت میں برطانوی حکومت قایم کرنے کی کوشش کی۔

اس تحریک پر رنجیت سنگھ کو راضی کرنے کے لیے ۳۰ نومبر کو گورنر جنرل نے مصلحتاً برابری کا درجہ دیتے ہوئے رنجیت سنگھ سے فیروز پور میں ملاقات کی۔ فاتح فوج کو سندھ اور بلوچستان کے راستہ قندھار کی طرف بڑھنا تھا۔ کرنل ویڈ (Wade) شہزادہ تیمور کے ساتھ تھوڑی سی فوج کو ساتھ لے کر براستہ خیبر آگے بڑھا تاکہ دشمن کی توجہ منتشر ہو جائے۔ رنجیت سنگھ پنجاب میں سے انگریزی سپاہ کو راستہ دینے کے خلاف تھا۔ بولان کے شمال میں افغانستان کے سارے درّوں پر رنجیت سنگھ کا قبضہ تھا۔ فوجی نقطۂ نظر سے شاید حالات پر پوری طرح سے حاوی دکھائی دیتا تھا لیکن پھر بھی وہ اس بات سے بے خبر نہ تھا کہ دراصل انگریزوں کے زیر اطاعت ہی شاہ شجاع کابل پر تخت نشین ہو رہا ہے۔ مذکورہ بالا حالات کے پیش نظر انگریزوں کی شکست لازمی دکھائی دے رہی تھی۔ انگریزی حکومت کے ساتھ رنجیت سنگھ کے تعلقات سہ فریقی سمجھوتہ اور انگریزی حکومت کی خارجہ پالیسی کے تحت بعد کے حالات کو اگر ہم پیش نظر رکھیں تو اس بات کی شہادت ملتی ہے کہ رنجیت سنگھ انگریزوں کے سامنے بے بس تھا۔ اس بات کو وہ خود بھی بخوبی جانتا تھا۔ بظاہر رنجیت سنگھ پورے عروج پر پہنچ چکا تھا جس سلطنت نے اس کے کسان بزرگوں پر ظلم ڈھائے تھے اس پر رنجیت سنگھ کی دھاک جم چکی تھی۔ ہندوستان کے حاکم اعلیٰ کی نظر میں بھی اس کا بڑا احترام تھا۔ (۵۲) شاہ شجاع کی حکومت قایم ہونے سے پہلے ہی رنجیت سنگھ کا انتقال ہو گیا لیکن وہ اپنے پیچھے بہت سی الجھنیں اور پیچیدگیاں چھوڑ گیا۔ رنجیت سنگھ کی موت کے بعد جب پنجاب میں حالات دگرگوں تھے انگریزی افواج اور فوجی نقل و حمل پنجاب کے راستہ افغانستان بھیجنا پڑے۔ ان حالات میں سکھ دربار کو انگریزی حکومت کے سامنے جھکنا پڑا۔ درحقیقت انگریزوں اور افغانوں کی جنگ کے زمانے میں انگریزی فوجوں کی پنجاب کے راستہ سے لگاتار آمد و رفت اور ان کے پنجاب میں پڑاؤ ڈالنے

کے باعث ہی خالصہ کی آزادی کمزور پڑ گئی۔

1809ء سے 1839ء کے درمیان رنجیت سنگھ اور انگریزی حکومت کے تعلقات کا یہ ایک مختصر خاکہ ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی طاقت کو تسلیم کرتے، انگریزوں کے وعدے پر یقین کرنے اور اپنے دیے ہوئے وعدوں پر قایم رہنے کا جہاں تک سوال ہے (33) مشرق کے دوسرے حاکموں کے مقابلہ میں رنجیت سنگھ کا طرزِ مملکت مختلف تھا۔ امرتسر کے معاہدہ کے بعد انگریزوں اور سکھوں کے باہمی تعلقات کے متعلق روایتاً یہی اندازہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ رنجیت سنگھ نے ایک بار یہ کہا تھا کہ "شاید میں انگریز بہادر کو علی گڈھ تک پیچھے دھکیل سکتا ہوں۔ لیکن ساتھ ہی وہ مجھے بھی ستلج پار اپنی سلطنت کے باہر دھکیل دیں گے "۔ روایت ہے کہ اس نے یہ بھی کہا "کہ سب لال ہو جائے گا " (34) انگریزی حلقوں میں مغرب کی طرف اپنی حدودِ سلطنت بڑھاتے کی بات چیت پہلے ہی سے چل رہی تھی۔ 1837ء میں لارڈ آک لینڈ کے شمالی صوبہ کے دورہ کے وقت کمانڈر انچیف اور مٹکاف نے فقط حصولِ واقفیت کے مقصد ہی سے پنجاب کو سر کرنے کے بہترین طریقہ پر بات چیت کا لطف اٹھایا تھا۔ (35) مئی 1838ء میں آسبورن نے لکھا " کہ رنجیت سنگھ کی موت کے بعد ایک راستہ یہ تھا کہ اپنے پورے لاؤ لشکر کے ساتھ یکبارگی پنجاب پر قبضہ کر لیا جائے اور دریائے سندھ کو انگریزی سلطنت کی شمال مغربی سرحد بنایا جائے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اس لیستو پر قابو پانے کے لیے نہ جانے کتنے اونٹ نگل چکی ہے "۔ یہ ظاہر ہے کہ رنجیت سنگھ پر واضح تھا کہ اس کا راج ایسے ترغیب آمیز قرب کی وجہ سے کسی وقت بھی انگریزی سلطنت میں مدغم ہو سکتا تھا۔ لیکن پھر اس مصیبت سے بچنے کے لیے اس نے کیا اقدام کیا۔ بے شک رنجیت سنگھ نے میکلیسن (Maakeson) وینڈ اور دیگر کئی اصحاب سے ذکر کیا تھا کہ انگریزوں کے ساتھ دوستانہ معاہدہ کرنے سے پہلے اس نے شری گرنتھ صاحب سے رجوع کیا اور اس کا جواب انہیں اثبات میں ملا تھا۔ (36) انگریزی حکومت اور سکھوں کے درمیان خط و کتابت میں ان کی دوستی کے استحکام کی تصدیق اور گواہی کے لیے چاند اور سورج تک کا واسطہ شامل رہا لیکن کسی بھی سیاسی معاہدہ کی بنیاد فریقین کی اپنی ضرورتیں اور مطلب برآری ہوتی ہے۔

یا کسی ایسی سیاسی سوجھ بوجھ کا مظاہرہ نہیں کرتا جس پر ہم عش عش کر اٹھیں۔ کسی سیاستدان کی کامیابی کا اندازہ اس کی کامیابی سے ہوتا ہے۔ انگریزوں کے ساتھ اس کی لڑائی جلد یا بدیر ہونی تھی۔ اس لیے اسے ملتوی کرنے کے بجائے سندھ کے معاملہ پر اسے انگریزوں کا مقابلہ کرنا چاہیے تھا حالانکہ جیسا کہ بعد میں ثابت ہوا اس سے بھی کچھ حاصل نہ ہوتا۔ دراصل اس نے ایک ناقابل عبور راستہ اختیار کیا تھا۔ اس نے ایک ایسی شہنشاہیت کو راضی کرنے کی کوشش کی تھی جو سکون قلب کے ساتھ اس فوجی اجتماعی طاقت کو برداشت کر سکتی تھی جو اس نے تیار کی تھی۔ شاید دوسرے عظیم بانیان سلطنت کی طرح رنجیت سنگھ بھی اپنی سلطنت کے کھوکھلے پن کو ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتا تھا لہذا اس نے انگریزوں سے جنگ کا خطرہ مول نہ لیا۔ اس کے برعکس وہ ان کے آگے جھکتا رہا اور جھکتا ہی چلا گیا۔

اشارات

۱- ویڈ کا خط 1827ء
2- سیکنڈری کالنس (Sec. Cons) مورخہ 13 مارچ 1809ء نمبر 63 ایضاً مورخہ 29 اپریل 1809ء نمبر 39
3- کننگھم صفحہ 180
4- مرے کا خط مورخہ ۱۹ فروری 1827ء
5- ستلج کے اس پار کے حالات محکمہ خارجہ سیاسی کارروائیوں مورخہ 6 اگست 1827ء و 14 نومبر 1828ء نمبر 3
6- سیاسی کارروائیاں (ج ج) مورخہ 6 اگست 1828ء نمبر 3
۷- لاہور دربار، باب چہارم
8. لاہور دربار صفحہ 18 (Foot Note)
۹ سیاسی کارروائیاں 47-46 جیک مونٹ
۱۰- مونوگراف ۱۷ صفحہ ۱۹

11- سیاسی کارروائیاں۔ 2 ستمبر 1820ء، نمبر 17

12- رنجیت سنگھ سینٹ ی (Centenary) جلد کاپور، مہاراجہ رنجیت سنگھ کا خط بنام مہاراجہ مان سنگھ، مورخہ 25 دسمبر 1822ء

13- جیک مونٹ صفحہ 27

14- کورٹ اینڈ کیمپ، آسبورن

15- ڈکشنری آف نیشنل بائیوگرافی، بیسویں جلد صفحہ 412- ویڈ سے مرے تک ۹ ستمبر 1824ء، ۱۵ اکتوبر 1825ء جس کا حوالہ لاہور دربار کے صفحہ 22 پر دیا گیا ہے۔

16- سیاسی کارروائیاں، ۱۷ جون ۱831ء نمبر 41

17- کننگھم صفحہ ۱۹۴

18- سیاسی کارروائیاں مورخہ 2 اکتوبر 1836ء نمبر 27

19- ہیوجل کا سفر نامہ (Hugel Travels)

20- سیاسی کارروائیاں 2 دسمبر 1834ء نمبر 60

21- برنز کی غیر شائع شدہ خط و کتابت جس کا حوالہ کئے (Kaye) نے جلد اوّل صفحہ 183 پر دیا ہے۔

22- برنز بنام ایک ذاتی دوست بحوالہ کئے (Kaye) صفحہ ۱۸۵

23- سیاسی کارروائیاں ۱۱ ستمبر 1837ء نمبر 42

24- سیاسی کارروائیاں 2 اکتوبر 1837ء نمبر 72

25- آک لینڈ بنام ہاب ہاؤس، سائکس کی افغانستان جلد اوّل

26- سائکس، افغانستان جلد اوّل صفحہ 397

27- انڈیا انڈر الن برا مصنفہ ایلجر نان لا (Algernon Law)

28- سیاسی کارروائیاں ۹ مئی 1837ء نمبر 45

29- کننگھم صفحہ 220

30- کورٹ اینڈ کیمپ ۱۹ جون مصنفہ آسبورن

31- لارڈ آک لینڈ کی یادداشت (Minutes) مورخہ 12 مئی 1839ء

مسودہ ریکارڈ کے لیے صفحہ 319

32۔ کننگھم صفحہ 221

33۔ مینڈاکی، مصنفہ رابرٹش، صفحہ 27

34۔ میک گریگر جلد دوم، صفحہ 35

35۔ مشکلات مصنفہ ٹھامسین

36۔ سیاسی کارروائیاں مورخہ 23 جنوری 1836ء نمبر 115

37۔ میک گریگر (Mec Gregor) جلد دوم، صفحہ 33

38۔ سیاسی کارروائیاں مورخہ 20 اکتوبر 1837ء نمبر 61

پانچواں باب

رنجیت سنگھ اور افغانستان

(1823ء تا 1838ء)

نوشہرہ میں اپنی شکست کے فوراً بعد بارک زئی سردار عظیم خان فوت ہو گیا۔ بستر مرگ پر اس نے اپنی بیویوں کو طلب کیا اور ان سے سب ہیرے جواہرات لے کر اپنے بیٹے حبیب اللہ خان کو اس ہدایت کے ساتھ حوالہ کیے کہ اس کے نام پر شکست کا جو دھبّہ ہے وہ اسے دھو ڈالے۔ (۱) عظیم خان نے اپنی پوری جائداد بھی حبیب اللہ کو دے دی۔ لیکن 1823ء سے (جس سال عظیم خان کی وفات ہوئی) 1826ء (جس سال دوست محمد کابل کا حاکم اعلیٰ بنا)، تک کے عرصہ میں سکھ تاریخ میں افغانستان کا کہیں شمار نہ تھا۔ دُرّانی مملکت کے حصّے علاحدہ ہو گئے تھے۔ کابل پر دوست محمد کا قبضہ تھا۔ اس کے دوسرے بھائیوں میں سے شیر دل خان نے قندھار اور یار محمد خان نے پشاور لے لیا۔ دُرّانی بادشاہ ہرات میں تھا اور سندھی اسے کوئی خراج نہیں دیتے تھے۔ کابل میں بھی دوست محمد کو عظیم خان کے بڑے بیٹے حبیب اللہ خان کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اس طرح بارک زئی آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ لڑائی جھگڑا کر رہے تھے۔ دوست محمد کے کابل پر مستحکم ہو جانے اور حبیب اللہ کے ہار جانے کے بعد بھی وہ 1831ء تک اندرونی معاملات میں اس قدر پھنسا رہا کہ دریائے سندھ کے مغرب میں سکھ حکومت کے استحکام کی اس نے

کوئی پرواہ نہیں کی۔ اس تمام عرصہ میں وہ دُرّانیوں ہی کو کچلنے میں لگا رہا۔

1831ء میں شاہ شجاع نے افغانستان کے تخت کو پھر سے حاصل کرنے کی کوشش کی اور رنجیت سنگھ سے معاہدہ کرنا چاہا لیکن مہاراجہ نے یہ شرطیں رکھیں کہ کامیاب ہونے کی صورت میں سارے افغانستان میں گئوکشی ممنوع قرار دی جائے۔ سومنات مندر کے دروازے اسے دے دیے جائیں اور تخت کا وارث شہزادہ ایک دستہ فوج کی معیت میں رنجیت سنگھ کی حاضری میں رہا کرے۔ (2) حالات کی خرابی کے باوجود شاہ نے رنجیت سنگھ کی ان بیہودہ تجویزوں کو ماننے سے انکار کر دیا جنھیں مان کر وہ عملی طور پر رنجیت سنگھ کا غلام بن جاتا۔ (3) انگریزی حکومت نے بھی اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کی کوئی حمایت نہ کی۔ غرض یہ ناکام رہا۔

1833ء میں شاہ شجاع نے جو اپنے ارادوں میں پختہ تھا افغان تخت کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ وہ کسی کام کو شروع تو کر دیتا تھا مگر نہ وہ مستقل مزاج تھا اور نہ کسی مہم کو سر کرنے کی اس میں طاقت تھی۔ اس بار لارڈ ولیم بینٹنک کے کہنے پر انگریزی جھنڈے تلے شاہ شجاع نے لشکر بھرتی کیا۔ شاہ نے انگریزوں سے اپنی چار ماہ کی پنشن بھی پیشگی لے لی۔ اس نے ایک بندوق اور کچھ اونٹ بہاول خان سے لیے اور شکارپور پر چڑھائی شروع کر دی۔ سندھی اس کے خلاف تھے لیکن شکارپور سے سات کوس دور ایک مقام پران کی ہار ہوئی اور انہوں نے چھ لاکھ روپے دینا منظور کیا۔ شکارپور کے علاقہ میں کھیتی باڑی کرنے کے عوض سالانہ لگان مقرر کیا گیا۔ لیکن قندھار کے نزدیک دوست محمد نے شاہ شجاع کو شکستِ فاش دی۔ بہت عرصہ تک ادھر اُدھر چکر کاٹنے کے بعد مارچ 1835ء میں وہ لدھیانہ پہنچا۔ نئی مہم شروع کرنے سے پہلے رنجیت سنگھ اور شاہ شجاع کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جو بعد میں سہ فریقی معاہدہ کی بنیاد بنا یہ معاہدہ پندرہ آرٹیکل (دفعات) پر مشتمل تھا۔ جب کہ 1831ء کے مجوزہ معاہدہ میں سترہ آرٹیکل تھے۔ یہ شرط کہ شاہ کا ولی عہد مع ایک دستہ فوج رنجیت سنگھ کے حضور میں رہے اڑا دی گئی۔ نوروز اور دسہرہ کے موقع پر شاہ نے رنجیت سنگھ

تحائف بھیجنے کی تجویز کو کچھ اس طرح ترمیم کر دیا کہ جس سے یہ ظاہر نہ ہو کہ شاہ شجاع مہاراجہ کی حکمرانی کو کھلے طور پر تسلیم کرتا ہے۔ شکارپور اور سندھ کے دائیں کنارے پر واقع علاقوں کے بارے میں شاہ شجاع نے کپتان ویڈ (Wade) کے فیصلہ پر عمل کرنے کا وعدہ کیا۔ سومنات کے دروازے کے بارے میں اس معاہدہ میں کوئی ذکر نہ تھا۔ سابق بادشاہ نے دریائے سندھ کے دائیں کنارے پر واقع کابل کے ان مقبوضات پر مہاراجہ کی حکومت تسلیم کر لی جو رنجیت سنگھ (4) نے فتح کیے تھے۔ خالصہ دربار کے ریکارڈ کی دستاویز جلد دوم سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ رنجیت سنگھ نے 1833ء اور 1834ء کے درمیان کئی مختلف تاریخوں میں 114500 روپے دیے تھے۔ اگر عمدۃ التواریخ پر یقین کیا جائے تو شجاع الملک کو مختلف تاریخوں میں ایک لاکھ پچیس ہزار روپے دیے تھے۔ (5)

شاہ شجاع سے معاہدہ کرنے کی کئی وجوہ تھیں۔ شاہ شجاع کی فتح یابی کی صورت میں دریائے سندھ کے دائیں کنارے پر واقع علاقوں پر رنجیت سنگھ کی حکومت مضبوط ہو سکتی تھی۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ افغانستان پر انگریزی حکومت کی نگاہیں تھیں۔ افغانستان میں لیفٹیننٹ برنز کا سفر اور سرداروں کے ساتھ بعد میں جو اس کی خط و کتابت ہوئی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ان سے رابطہ قایم کرنا چاہتا تھا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ انگریز افغان معاملات میں دلچسپی لے رہے تھے۔ رنجیت سنگھ بھانپ گیا تھا کہ انگریز اس ملک کے ساتھ سیاسی تعلقات قایم کرنے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ رنجیت سنگھ چاہتا تھا کہ جب کبھی حصولِ مقصد کے لیے انگریز کوئی قدم اٹھائیں تو وہ معاہدہ میں شریک ہونے کا اپنا حق جتا سکے۔ (6)

رنجیت سنگھ کو اس بات کا خدشہ تھا کہ اگر شاہ شجاع کامیاب ہو گیا تو وہ معاہدہ کو ردی کی ٹوکری میں پھینک دے گا۔ اس لیے رنجیت سنگھ نے پشاور کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ قبل ازیں لاہور دربار کے باج گزار کی حیثیت سے پشاور پر سلطان محمد کا تسلط تھا۔ درحقیقت شاہ شجاع سے یہ بات بھی منسوب کی جاتی ہے کہ 'معاہدے بیکار ہیں ان کی کوئی قیمت نہیں، بلکہ جس کی لاٹھی

اسی کی پھنسی ہوگی اور وقت آنے پر وہ بزور بازو رنجیت سنگھ سے کوہ نور کا ہیرا حاصل کر کے اپنے تاج کی زینت بڑھائے گا۔ (7) ہری سنگھ نلوہ نے پشاور کے قلعہ پر طوفانی حملہ کیا اور سلطان محمد بھاگ کر دوست محمد کے دربار میں جا پہنچا۔ ہری سنگھ اور نونہال سنگھ کے ماتحت یہ سکھ لشکر صرف نو ہزار افراد پر مشتمل تھا۔

رنجیت سنگھ نے شاہ شجاع پر جو شاندار فتح حاصل کی تھی اس سے دوست محمد کو شاہ شجاع کی طرف سے خطرہ جاتا رہا اور اب دوست محمد نے پشاور پر اپنی توجہ مبذول کی۔ یہاں سے سکھوں اور افغانوں کے تعلقات کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ 17 جنوری 1833ء کو جب شاہ شجاع قندھار کی طرف بڑھ رہا تھا۔ دوست محمد نے انگریزوں سے معاہدہ کی پیش کش کی۔ انگریزی حکومت نے اس کو جواب دیا کہ افغانستان سرداروں کے باہمی جھگڑوں میں ان کی پالیسی بالکل غیر جانبدارانہ ہے (8) لیکن یہ ظاہر تھا کہ شاہ شجاع کی طرف انگریز زیادہ مائل تھے۔ وہ اس سے مقابلتاً فیاضی کا سلوک کرتے تھے۔ 1835ء کے شروع میں سکھوں کے خلاف مہم شروع کرنے سے پہلے دوست محمد نے انگریزی حکومت سے پشاور پر سکھوں کے قبضہ کر لینے کے بارے میں شکایت کی اور اپنا یہ ارادہ ظاہر کیا کہ وہ سکھوں کے خلاف جہاد کرے گا۔ اس نے انگریزی حکومت سے امداد کی درخواست کی۔ اپنی عرضداشت میں دوست محمد نے گورنر جنرل کے پچھلے خط میں تحریر ان لائنوں پر زور دیا جن میں اسے یہ یقین دلایا گیا تھا کہ گورنر جنرل وقت آنے پر اس کی فلاح و بہبود میں اپنی دلچسپی کا ثبوت دیں گے۔ کچھ بھی ہو (9) دوست محمد کو یہ بتایا گیا کہ سابق گورنر جنرل کے خطوط میں امداد کا کوئی وعدہ نہیں ہے۔

سکھوں سے مورچہ لینے کے لیے دوست محمد نے زبردست تیاریاں شروع کر دیں پشاور پر رنجیت سنگھ کے قبضہ کے باعث کچھ بارک زئی سردار بھی اپنے علاقوں سے محروم ہو گئے۔ رنجیت سنگھ کی پیش قدمی سرحدی علاقوں کے مسلمان قبائل اور اور کابل کی بادشاہت کے لیے خطرہ تھی۔ سیاسی تقاضے، مذہبی جذبات اور اپنی حفاظت کے خیال نے مسلمانوں کو ایک عظیم کوشش کرنے پر مجبور کر دیا۔ دوست محمد اسی جدوجہد کو جہاد یا مذہبی جنگ کا رنگ دینا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے

اپنے آپ کو امیرالمومنین کا لقب دیا عہ۔ اس لڑائی کے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے کابل میں مقیم شکارپوری سوداگروں کو حراست میں لے کر ڈیڑھ لاکھ روپے بطور قرض حاصل کیا گیا۔ قندھار کے سرداروں نے اس کی کوئی حمایت نہیں کی کیونکہ دوست محمد کے امیرالمومنین بن جانے پر وہ ناراض ہو گئے۔ دوست محمد نے سندھ کے امیروں سے بھی مالی امداد کی درخواست کی کیونکہ دوری کے باعث ان سے فوجی امداد کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ لیکن سندھ کے امیروں کو یہ ڈر تھا کہ دوست محمد کو مالی امداد دینے کی صورت میں رنجیت سنگھ ان سے ناراض ہو جائے گا۔ آخر کار انہوں نے اس شرط پر دوست محمد کو امداد دینے کا یقین دلایا کہ وہ سندھ کی سالمیت کو قایم رکھنے اور انگریزوں، سکھوں یا کسی اور دشمن کے سندھ پر حملہ آور ہونے کی صورت میں انہیں امداد دینے کے لیے ایک عہد نامہ تحریر کر دے امیر دوست محمد سمجھ گیا کہ یہ تجویز فقط اس کو بہلانے کے لیے سوچی گئی ہے۔ بہاول پور کے (۱۵) خان کو بھی خط بھیجے گئے۔ بجال اور یوسف زئی سرداروں نے دل و جان سے اس کا ساتھ دیا اور امیر کا حوصلہ بڑھایا۔ کھٹک، مہمند، خلیل، خیبر اور پشاور کے گرد و نواح کے قبائل سے بھی امداد مانگی گئی۔ کوہستان سے، دور دراز پہاڑیوں سے، ہندوکش کے علاقوں سے اور ترکستان تک کے دور افتادہ علاقوں سے بھی مختلف قبائل کے لاؤ لشکر امیر دوست محمد کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔ غزنی اور کوہستانی آب و تاب والے قزلباش اور سخت جان روز بیک۔ گھوڑ سوار اور پیادے اس لشکر میں شامل ہو گئے۔ اس عظیم اجتماع کے سامنے رنجیت سنگھ کا دل بھی دھڑکنے لگا۔

دوست محمد کے بیان کے مطابق اس کا لشکر چالیس ہزار پر مشتمل تھا۔ اس کے علاوہ غازیوں کے ٹولے بھی اس کے ساتھ تھے۔

عہ اس جدوجہد کے درمیانی عرصہ میں کابل میں صاحب زمان یعنی حکمران وقت کے نام پر ایک سکہ جاری کیا گیا۔ اس سکہ پر "بفضل خدا امیر دوست محمد" کے الفاظ کندہ کیے گئے تھے۔

1- امیر کی اپنی فوج	(غالباً)	12000
2- کابل کے ایلچوری سپاہی		10000
3- پشاور کے سرداروں کی فوج		1500
4- سادات رحمان کی فوج		15000
5- میر عالم خان باجور کی سپاہ		5000
6- فتح خان پنج توڑ کے سپاہی		10000
	میزان	40000

دوست محمد کے پاس 37 توپیں تھیں اور ہر توپ کے لیے سات سو گولے تھے اس کے پاس تین لاکھ روپے کا سرمایہ بھی تھا۔ امیر کے سپاہیوں کو پیشگی تنخواہیں دی گئیں۔ جلال آباد کے مقام پر غلہ کے اسٹاک جمع رکھے گئے۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اس وقت کابل کی وادی میں سکھوں کے پاس 80000 فوج تھی۔(111)

سکھوں کی تاریخ میں یہ ایک نازک مرحلہ تھا۔ رنجیت سنگھ کو شکست ہو جاتی تو غالباً اسے اٹک کے پار تک پیچھے دھکیل دیا جاتا اور دریائے سندھ کے دونوں کناروں پر مسلمان قبائل بغاوت کا علم بلند کر دیتے۔ چالباز مہاراجہ سیاسی چالوں پر اتر آیا۔ اس میدان میں ہمیشہ سے وہ بہت ہوشیار مانا جاتا تھا۔ اس نے ہرلان فرنگی اور عزیز الدین کو دوست محمد سے بات چیت کے لیے بھیجا تاکہ اپنی سپاہ کو جمع کرنے کا اسے وقت مل جائے۔ اور اسی بیچ دوست محمد کو اپنے پشاوری بھائیوں سے بھی دور کیا جا سکے۔ سلطان محمد کو اچھی طرح معلوم تھا کہ افغانوں کی کامیابی کی صورت میں پشاور کو افغان سلطنت میں مدغم کر لیا جائے گا۔ اندریں حالات وہ رنجیت سنگھ کے ساتھ معاہدہ کے خلاف نہ تھا۔ مہاراجہ کی طرف سے سلطان محمد اور اس کے بھائیوں کو کوہاٹ، ٹونک اور بنوں کے علاقے بطور جاگیر دینے کا وعدہ کیا گیا۔ سلطان محمد اور دوست محمد نے قرآن شریف ہاتھ میں لے کر قسم کھائی کہ وہ ایک دوسرے کے وفادار رہیں گے اور یہ بھی طے کیا کہ پشاور کا سابق سردار سلطان محمد سکھوں کے وکیل کو حراست میں لے کر پشاور کی واپسی کے لیے بطور یرغمال رکھے گا۔ دوست محمد کے وزیر مرزا احمد خان کو یہ امید تھی کہ عزیز الدین کے

قید ہو جانے پر رنجیت سنگھ چاروں شانے چت ہو جائے گا۔ کیونکہ فقیر عزیز الدین کے پاس ہی اس دوا کا راز تھا جو مہاراجہ کی طاقت کو قایم رکھے ہوئے تھی۔ سلطان محمد بخوبی جانتا تھا کہ دوست محمد پشاور کو اپنے قبضہ میں رکھے گا۔ اسے صرف رنجیت سنگھ کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کے لیے آلۂ کار بنایا جا رہا تھا۔ ہرلان اور عزیز الدین کے بہکانے پر سلطان محمد اپنے لاؤ لشکر سمیت سکھوں کے ساتھ مل گیا۔ افغان کیمپ پر اس کا بہت برا اثر پڑا۔ افغان سپاہیوں کے حوصلے پست ہو گئے۔ دونوں فوجیں ایک دوسرے سے صرف سات کوس کے فاصلہ پر تھیں۔ دوست محمد کے اپنے بیان کے مطابق ہر دو فوج نے ایک دوسرے کا سترہ دن تک مقابلہ کیا۔ رنجیت سنگھ نے بات چیت کے دوران اپنی فوجوں کو یکجا کر لیا اور دوست محمد کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اپنے آپ کو مشکل میں پا کر دوست محمد نے عقل مندی سے کام لیا اور رات کی تاریکی میں بھاگ نکلا۔ دوست محمد جس تیزی اور ہوشیاری سے اپنے سارے سامان جنگ اور مال و اسباب کو لے کر نکل گیا۔ اس کے لیے اس کی تعریف کی جا سکتی ہے۔ اس طرح رنجیت سنگھ نے خون کا ایک بھی قطرہ بہائے بغیر فتح حاصل کر لی۔ رنجیت سنگھ کا دبدبہ بڑھ گیا۔ اور دریائے سندھ کے مغرب میں اس کی سلطنت مستحکم ہو گئی۔ دوست محمد عوام کی نگاہوں میں بری طرح گر گیا۔ میدان جنگ میں پیٹھ دکھانے کی بے عزتی اس کے دل پر ہمیشہ بوجھ بنی رہی۔ اس قوم کو جسے دوست محمد ہمیشہ گالیاں دیتا تھا اور ہیچ سمجھتا تھا اور جس کے ساتھ مذہب کے مقدس نام پر جنگ جاری رکھنے کا اس نے عہد کیا تھا اس قوم کے سامنے اس طرح پیٹھ دکھانے پر اس کی شہرت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ حملہ کرنے میں تاخیر ہی دوست محمد کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ وہ رنجیت سنگھ کے جھانسے میں آ گیا۔ اس بات کو جانتے ہوئے کہ اس کا کیمپ سازشوں کا اڈا ہے اور حملہ میں تاخیر اس کے دشمن کے لیے سازگار ہو گی۔ اس نے رنجیت سنگھ کے ساتھ بات چیت کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اس نے اپنے خیال میں رنجیت سنگھ کو جل دینے کی کوشش کی۔ اس نے بھی رنجیت سنگھ کو اپنی فوجوں کو یکجا کرنے کا جو موقع دیا اس سے اسے زبردست سیاسی شکست بھگتنی پڑی۔ اور رنجیت سنگھ کے الفاظ میں "اس سے دوست محمد

کی بڑھتی ہوئی شہرت کو زبردست دھکا لگا۔" (12)

میزن (Masson) نے ویڈ کو اطلاع دی کہ دوست محمد اپنی شکست کا داغ دھونے کا بہت خواہش مند ہے۔ اس نے باجور کے سرداروں اور دوسرے کئی آزاد افغان قبیلوں کے سرداروں سے بات چیت جاری رکھی۔ "امیر المومنین" کے لقب کی بدولت دوست محمد کو سکھوں سے لگاتار دشمنی کا عہد نبھانا تھا۔ میلیسن (Malleson) کیئے (Kaye) اور دوسرے مورخین کے مطابق "شکست کے بعد دوست محمد کی روح تڑپ اٹھی تھی۔ اور فوجی شہرت کے کھوکھلے پن کی تبلیغ کرتے ہوئے وہ قرآن شریف کے مطالعہ میں بے طرح مصروف ہوگیا۔" مورخ موہن لال کے مطابق خیباری سرداروں نے اس سے بار بار سپاہ طلب کی اور یہاں تک لکھا کہ اگر ان کو فوجی امداد نہ دی گئی تو وہ رنجیت سنگھ کی حکومت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائیں گے" (13) اس دوران سکھ افغانستان کے مشرق میں اپنی حکومت کو مستحکم کر رہے تھے۔ اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ دوست محمد کے خلاف جلد ہی قدم اٹھائیں گے۔ پشاور کے پاس سکھ شب قدور کے قلعہ کی تعمیر کو مکمل کر رہے تھے۔ اس طرح انہیں گنداب سڑک کو اپنی تحویل میں لینا ممکن ہوگا۔ پشاور اور جلال آباد کے درمیان پہاڑی دروں میں سے خیبر کے بعد گنداب سڑک ہی توپ خانہ کے رسل و رسایل کے لیے کارآمد تھی (14) رنجیت سنگھ نے 1822ء میں منکیرہ کے حافظ احمد خان کو ڈیرہ اسمٰعیل خان کا علاقہ دیا تھا مگر اب اس کے بیٹے سے یہ جاگیر واپس لے لی۔ اور ڈیرہ اسمٰعیل خان کو سکھ سلطنت میں مدغم کر لیا۔ اس موقع پر اس میں بڑی مصلحت تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ دوست محمد کے لیے ایک دوسرے مقام سے بھی خطرہ لاحق کر دے۔ (15) شاہ شجاع کا ایک ایجنٹ رنجیت سنگھ کے دربار میں تھا جو بظاہر رنجیت سنگھ کی رعایا کے ذمہ کچھ بقایا رقم وصول کرنے آیا تھا مہاراجہ نے اس کی موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ تجویز رکھی کہ اگر شاہ شجاع تحریری طور پر پشاور اور شکارپور سے دستبردار ہو جائے تو مہاراجہ اس کے لیے کابل اور قندھار فتح کرے گا۔ ہری سنگھ نلوہ، درہ خیبر کے دہانے پر واقع مقام پر جمرود کے قلعہ کی تعمیر میں مصروف تھا۔ سردار ہری سنگھ کے کابل کو

سر کرنے کا خیال زبان زدعام تھا کیونکہ ڈیرہ اسمٰعیل خان کے ادغام پر خوش حال سنگھ نے یہ بیان دیا تھا کہ ٹونک اور کابل کے درمیان صرف ساٹھ کوس کا فاصلہ ہے(۱۷)
اسی اثنا میں دونوں حاکموں یعنی دوست محمد اور رنجیت سنگھ کے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا مگر یہ خط و کتابت کسی طرح بھی دوستانہ نہ تھی۔ رنجیت سنگھ کے ایک خط میں یہ شعر تھا " اگر مجھے اپنا دشمن نہیں بنانا چاہتے تو پیچھے ہٹ جاؤ۔ اور اگر تمہارے دل میں کوئی اور جذبہ کارفرما ہو تو سمندری لہروں کی مانند میری بے شمار فوجیں سامنے ہوں گی "(۱۸)، دوست محمد کا آخری شعر کچھ اس طرح تھا " مجھ سے اگر لطف و کرم کی درخواست کی ہے تو اس کی اور بات ہے لیکن اگر تم اپنے آپ کو تباہ کرنا چاہتے ہو تو میری تلوار تمہاری خدمت کے لیے حاضر ہے " (۱۹)

سرحد سے موصول شدہ خبروں نے دوست محمد کو خطرہ سے آگاہ کر دیا۔ اس نے ایک فوج اپنے بیٹوں شمس الدین اور محمد اکبر کی سپردگی میں سکھوں کا سامنا کرنے کے لیے جمرود بھیجی۔ جمرود میں سکھوں کی شکست کے بارے میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ آؤ ہم بھی اس جنگ کی تاریخ کا بغور مطالعہ کریں۔ مسٹر فاسٹ (Fast) کے مطابق افغان فوج کی تعداد اٹھارہ ہزار تھی اور دوست محمد کی ساری گھوڑ سوار فوج بر سر پیکار تھی جیسا کہ میکسن (Mackeson) نے ویڈ کو خبر دی۔ جمرود پر افغانی حملہ کے وقت ہری سنگھ کے ایک افسر مہا سنگھ کی تحویل میں صرف چھ سو سپاہی تھے۔ اس کے باوجود سکھ فوجوں نے تین چار دن تک افغانوں کا مقابلہ کیا ہری سنگھ نے دس ہزار سپاہیوں اور پچیس توپوں کی معیت میں پشاور سے جمرود کی طرف کوچ کیا۔ سکھوں نے لڑائی کا آغاز توپوں سے کیا مگر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ نجیب دستوں نے آگے بڑھ کر افغانوں پر گولہ باری کی۔ انجام کار افغان فوجیں تین توپیں میدان جنگ میں چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوئیں۔ سکھوں نے افغانوں کے کیمپ کو لوٹنا شروع کیا جس سے سکھ فوجیں تتر بتر ہو گئیں۔ اکبر خان نے دور بلندیوں سے سکھ سپاہ کی افراتفری دیکھی اور جب شمس الدین تازہ دم فوجیں لے کر میدان میں اترا تو افغانوں نے سکھوں پر ایک پُر زور ہلہ بول دیا۔ سکھ گھبرا کر قلعہ کی طرف بھاگے۔ اگرچہ اس مڈبھیڑ میں ہری سنگھ نلوہ بُری طرح زخمی ہو گیا پھر بھی سکھ فوجوں

نے دوبارہ منظم ہو کر افغانوں کا مقابلہ کیا۔ افغان اپنی برائے نام فتح (20) سے آگے اور کچھ نہ کر سکے۔ رات ہی رات میں سکھوں نے قلعہ جمرود کے ارد گرد خندقیں کھود دیں افغان پانچ چھ دن تک یہ سب کچھ دیکھتے رہے۔ اور بالآخر لوٹ گئے۔ اس لڑائی میں آٹھ سو سکھ سورما کام آئے یا زخمی ہوئے۔ افغان فوج کے پانچ سو سپاہی کھیت رہے۔ پشاور کے شمال میں شب قدور کے مقام پر سردار لہنا سنگھ سدھالوالہ کی سرکردگی میں پندرہ سو سپاہی تھے۔ حاجی خان کاکڑ اور میر عالم خان نے افغان فوج کے ایک دستہ کی معیت میں شب قدور پر چڑھائی کر دی۔ اس چال پر افغانوں کی کئی امیدیں وابستہ تھیں لیکن ان کی یہ چال ناکام رہی عہ۔

افغان فوجیں بڑی عجلت میں پسپا ہوئیں لیکن اس لڑائی میں رنجیت سنگھ کو سکھ بہادری کے گل سرسبد اور سکھ سپاہ کے سرتاج ہری سنگھ سے ہاتھ دھونا پڑا۔ دراصل اس عظیم سکھ جنگ جو کی موت کے باعث جمرود کی لڑائی کے بعد افغان خوشی کے شادیانے بجانے لگے۔ دوسری طرف اس غمناک حادثہ سے سارے پنجاب پر اداسی چھا گئی۔ ویسے جمرود کی لڑائی کی کوئی اہمیت نہیں۔ اس لڑائی میں افغان نہ قلعہ جمرود کو سر کر سکے اور نہ تباہ، اور نہ پشاور اور شب قدور پر قبضہ جما سکے۔

جیسا کہ آسبورن (Osborne) نے لکھا ہے کہ مہاراجہ نے اس شکست کو بڑے سکون سے برداشت کیا اور ایک سوال کے جواب میں بتایا کہ 'گاہ لگاہ چھوٹی موٹی ہار مفید ثابت ہوتی ہے کیوں کہ اس سے سپاہی اور افسران دونوں آئندہ کے لیے ہوشیار ہو جاتے ہیں (21) اگر میزن پر یقین کیا جائے تو (22) امیر دوست محمد خوش تھا کہ اس کی فوج خیبر کی پہاڑیوں سے بہت زیادہ بے عزتی کے ساتھ واپس جا سکی۔ اس لڑائی میں دوست محمد نے اپنی پوری طاقت اور ہمت لگا دی تھی اس فوج کے ساتھ اس کے پانچ بیٹے جمرود کے مورچہ پر گئے تھے اور اس کے خاندان کے

عہ میزن بنام وینڈ :- یہ ایک عام رائے ہے کہ ہرلان سنگھ کی موجودگی سے پشاور پر افغانوں کی کارروائی میں بہت مدد ملی، سراسر غلط ہے۔ وہ (ہرلان) اور نہ کوئی یورپین امیر کی فوجوں کے ہمراہ تھا رنجیت سنگھ کی ملازمت سے ہرلان کو برخواست کر دیا گیا تھا اور وہ دوست محمد کے ساتھ مل گیا۔

دیگر سبھی افراد کابل میں مورچہ سنبھالے ہوئے تھے۔ جمرود کی لڑائی کے نتیجہ کے طور پر امیر دوست محمد کو یقین ہو گیا کہ اپنی طاقت سے زیادہ کوشش کرنا بیکار ہے اور عین موقع پر یوسف کو کوئی مفاد حاصل نہیں ہو سکتا۔ جیک مونٹ نے لکھا ہے کہ "دراصل افغانوں کی طاقت اس قدر محدود تھی کہ وہ صرف کبھی کبھی رنجیت سنگھ سے ایک آدھ جھڑپ لے سکتے تھے۔(23) 1838ء میں دوست محمد کی سالانہ آمدنی چوبیس لاکھ روپے تھی۔ اس کے پاس بینتالیس توپیں تھیں، ڈھائی ہزار پیادہ اور بارہ تیرہ ہزار گھوڑ سوار تھے (24) ظاہر ہے کہ وہ اس قدر کمزور تھا کہ غیر ملکوں کو فتح کرنے کی بڑے پیمانے پر کوئی مہم جاری نہیں رکھ سکتا تھا۔ دوست محمد نے برتر کے روبرو خود تسلیم کیا کہ وہ رنجیت سنگھ کو کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا اور دوست محمد کے خوف نے یقینی طور پر رنجیت سنگھ کو سہ فریقی سمجھوتے کی تکمیل پر آمادہ نہیں کیا۔

اشارات

۱۔ غیر ملکی متفرق نمبر 135، جلد دوم، پیرا نمبر 13
2۔ برنز سوم، صفحہ 248
3۔ کیئے (Kaye) جلد اول، صفحہ 127
4۔ سیاسی کارروائیاں (P.P.) مورخہ 2 دسمبر 1834ء، نمبر 60
5۔ فہرست (Catalogue) جلد دوم، صفحہ 192، عمدہ سوم صفحہ 16
6۔ سیاسی کارروائیاں 2 دسمبر 1834ء نمبر 60
7۔ ظفر نامہ 1832ء
8۔ ویڈ کا خط مورخہ یکم اگست 1827ء
9۔ سیاسی کارروائیاں (P.P.) 23 مارچ 1835ء نمبر 25
10۔ میزن بنام ویڈ، 2 فروری 1835ء

11- سیاسی کارروائیاں مورخہ 25 مئی 1835ء، نمبر 30
12- سیاسی کارروائیاں مورخہ 15 جون 1835ء، نمبر 25
13- کیئے (Kaye) جلد اوّل، صفحہ 136
14- Life of Dost Muhammad (دوست محمد کی زندگی) مصنفہ موہن لال۔
15- سیاسی کارروائیاں 21 نومبر 1836ء، نمبر 32
16- ایضاً 3 اکتوبر 1836ء، نمبر 24
17- سیاسی کارروائیاں (P.P.) 15 اگست 1836ء، نمبر 17
18- " انگلش مین " مورخہ 10 جولائی 1837ء
19- ایضاً
20- میکسن بنام ویڈ 24 اکتوبر 1837ء
21- آسبورن، 8 جولائی
22- میزن بنام ویڈ۔ مورخہ 16 مئی 1837ء
23- جیک مونٹ، صفحہ 105
24- سیاسی کارروائیاں (P.P.) مورخہ 7 مئی 1838ء، نمبر 65

چھٹا باب

رنجیت سنگھ اور شمال مغربی سرحدی مسئلہ

شمال مغربی سرحدی مسئلہ برسر اقتدار حکومت کے لیے ہمیشہ ہی دردِ سر بنا رہا۔ اس حقیقت کے پیش نظر اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے ماضی میں جو کوششیں کی گئی تھیں ان کا ذکر خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ اس سے پہلے کہ یہ مسئلہ انگریزوں کے ہاتھ میں جاتا شیر پنجاب رنجیت سنگھ نے اسے حل کرنے کی کوشش کی۔ ان لوگوں کے لیے جو ہندوستان کے دفاع میں دلچسپی رکھتے تھے رنجیت سنگھ کی مغربی سرحدی پالیسی کا مطالعہ کافی اہمیت رکھتا ہے۔

ہندوستان کی شمال مغربی سرحد کا مسئلہ مندرجہ ذیل چار ملحقہ مسائل پر مشتمل ہے۔

۱ - ہندوستان و افغانستان کے بیچ بین الاقوامی تعلقات کا مسئلہ
2 - سیاسی یعنی سرحدی قبائل پر اقتدار کا مسئلہ
3 - سرحدی حفاظت (فوجی دفاع) کا مسئلہ
۴ - شمال مغرب کی سرحد کے نظم و نسق کا مسئلہ

رنجیت سنگھ افغانستان کو فتح کرنا چاہتا تھا۔ اس نظریہ کے حق میں دلائل بہت وزن دار معلوم ہوتے ہیں۔ خصوصی مقامی حالات کی وجوہ کی بنا پر کشمیر کو سر کرنے کی پہلی کوشش میں رنجیت سنگھ کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا تھا۔ بلاشبہ اسے یہ ڈر تھا کہ کابل کی تسخیر کے دوران کہیں ویسے ہی حالات کا سامنا نہ کرنا پڑے

ایک بار 1827ء میں اس نے کابل فتح کرنے کے بارے میں ویڈ سے بات چیت کی۔ اس انٹرویو کے بارے میں ویڈ لکھتا ہے کہ "میں نے اسے بتایا کہ یہ ایک خطرناک مہم ہے، اس علاقہ سے سکھ قطعی ناواقف ہیں، کوہستانی علاقہ ہونے کے علاوہ راستہ میں پڑنے والی ندیوں اور پہاڑوں کو عبور کرنا آسان نہیں، سلسلہ رسل و رسائل قایم رکھنا اور فوجوں کے لیے سامان رسد پہنچانا بھی مشکل ہوگا۔ عہ اس وقت مہاراجہ رنجیت سنگھ نے بھی ان خیالات کو تسلیم کیا۔

رنجیت سنگھ نے بھی شاہ شجاع کی بیوی وفا بیگم کے نام ایک خط میں انھیں خیالات کا اظہار کیا۔ بے شک ان دونوں سے اپنے ارادے مخفی رکھنے کی تو اس کے پاس وجوہات تھیں لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ان خیالات نے اس کے فیصلہ کو یہاں تک متاثر کیا کہ اس نے محمد عظیم خان کی موت اور دوست محمد کی تخت نشینی کے درمیانی طویل وقفہ انتشار میں بھی فائدہ نہیں اٹھایا اور افغانستان کو سر کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے فرانسیسی افسر بلاشبہ کابل پر چڑھائی کرنے کے متمنی تھے۔ سکھ سردار اور دوسرے سپاہی بھی اس مہم کے لیے کسی طرح کم خواہش مند نہ تھے۔ رنجیت سنگھ نے کئی موقعوں پر محض اپنے فرانسیسی افسران اور سرداروں کو خوش کرنے کے لیے اور دوست محمد کو چوکنا رکھنے کے لیے افغانستان پر حملہ کرنے کا ذکر کیا تھا لیکن ہمیشہ اس کی سیاسی سوجھ بوجھ اس کی جنگجویانہ فطرت پر حاوی رہی۔ غالباً ایک ایسا موقع آیا تھا جب اس نے افغانستان کو فتح کرنے کے لیے سنجیدگی سے غور کیا تھا اور یہ وہ موقع تھا جب افغانوں کے اچانک حملہ سے ہری سنگھ نلوہ مارا گیا تھا۔ کچھ عرصہ کے لیے غصہ و غرور اور رنج و قلق اس کے دل و دماغ پر چھا گئے لیکن جوں ہی رنجیت سنگھ کو سکون ہوا اس نے حملہ کا خیال

عہ ویڈ کا خط یکم اگست 1827ء۔ راجہ نے بتایا کہ "فرانسیسی افسران مجھ سے کہتے ہیں کہ دس باقاعدہ فوج بنالیں، دو یا تین گھوڑسوار دستے اور کچھ گولہ بارود ان کی تحویل میں دے دیا جائے تو وہ کابل کی تسخیر میں موجود ہوجائیں گے۔ اور سارے افغانستان کو میرے مطیع بنا دیں گے لیکن فوج کو سامان رسد پہنچانا مشکل ہوگا۔

ترک کر دیا۔ اس معاملہ میں انگریزی حکومت کی رائے کا بھی علم ہونا چاہیے۔ سکریٹری نے پرنسپ کو لکھا "گورنر جنرل کا خیال ہے کہ بلاشبہ مہاراجہ کے لیے اس دشوار گذار ملک پر قبضہ کرنے کی مہم خطرناک اور نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے پھر بھی اس کے پاس جو وسیع ذرائع ہیں اور جو بیش بہا خزانہ اور منظم عظیم فوج ہے اس سے وہ افغانستان کو تہ و بالا کرتا ہوا حاکم وقت کی تباہی کا سامان کر سکتا ہے" لیکن (2) رنجیت سنگھ چنگیز خان، تیمور، نادر اور احمد شاہ جیسے حملہ آور کی آخری کڑی نہ بن سکا جو بصورت دیگر وہ بن جاتا۔ اپنی فتوحات کو ہندوکش کے پار تک لے جانے کا شوق۔ افغانوں کو ان کی بے شمار غلطیوں کی سزا دینے کا انتقامی جذبہ، صندل کے دروازوں کی برآمدگی کے بارے میں قانونی پنڈتوں کے نجوم کو پورا کرنے کی خواہش اور یہ ہوس کہ یہ کارنامہ اس کی شان و شوکت کو چار چاند لگا سکتا ہے (3)۔ ان سب خوابوں کو اس نے بالائے طاق رکھ دیا۔ ایسے بے قاعدہ اور بے ڈھنگے حملوں پر اسے کوئی یقین نہ تھا۔ جن علاقوں کو وہ فتح کرتا تھا وہ اسے اپنے مخصوص ڈھنگ سے یکجا کرتا تھا اور اپنی حکومت کو مستحکم بناتا تھا۔

شاہ شجاع کو دوبارہ کابل کے تخت پر بٹھانے کے لیے رنجیت سنگھ نے سہ فریقی سمجھوتہ میں شمولیت کی تھی۔ اس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ رنجیت سنگھ افغانستان پر حملہ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن درحقیقت رنجیت سنگھ بے دلی سے اس سمجھوتہ میں شریک ہوا تھا۔ وہ بخوبی جانتا تھا کہ انگریز اس کی شمولیت کے بغیر اس مہم کو سرانجام دے ڈالیں گے۔ ایک طرف تو اسے یہ خدشہ لاحق تھا کہ جس مہم کو وہ بذات خود سر کرنے کی امید نہیں رکھ سکتا تھا، انگریز اپنی خوش قسمتی اور وسیع ذرائع کی بنا پر کامیاب ہو سکتے ہیں اور دوسری طرف وہ اپنے پژمردہ دل کو اس امید پر محظوظ کرنے کی کوشش کرتا تھا کہ انگریزوں کو اس مہم میں بے طرح مات کھانی پڑے گی (4) اور واقعی ایسا ہوا۔

رنجیت سنگھ کی شمال مغربی فتوحات کو دو درجوں میں رکھا جا سکتا ہے۔ اول تو اس نے اپنے کو اس قدر مضبوط نہیں پایا کہ دریائے سندھ کے پار کے علاقوں پر براہ راست حکومت کر سکے۔ اس نے اس اقدام کو مناسب نہیں سمجھا۔ جب شہر درہ میں

اس نے پشاور، ڈیرہ غازی خان، ڈیرہ اسمٰعیل خان، کوہاٹ، ٹونک اور بنوں کو فتح کیا تو ان مقبوضہ علاقوں پر اس نے مقامی سرداروں کے ذریعہ ہی حکومت کی۔ ان سرداروں نے اسے اپنا حاکم اعلا تسلیم کیا اور خراج بھی ادا کیا۔ پشاور فتح کر کے جہاں داد خان کے حوالے کر دیا۔ بعد میں یار محمد خان اور بالآخر 1830ء میں پشاور کی جاگیر سلطان محمد خان کی تحویل میں دے دی۔ ڈیرہ غازی خان کو سر کیا اور نواب بھاولپور کو بطور جاگیر عطا کر دیا۔ سندھ کے امیروں میں سے بھی ایک کو اس جاگیر کی واقعی یا نمائشی پیش کش کی گئی تھی۔ پشاور کے سلطان محمد خان سے رنجیت سنگھ کچھ گھوڑے اور چاول بطور خراج سالانہ حاصل کرتا تھا اور اس کے بیٹوں میں سے ایک کو اپنے دربار میں بطور یرغمال رکھا تھا۔ ڈیرہ اسمٰعیل خان پر قابض ہونے کے بعد رنجیت سنگھ نے اسے بھی بطور جاگیر شکست خوردہ حافظ محمد خان حاکم منکیرہ کی تحویل میں دے دیا۔ ٹانک اور نزدیکی اضلاع کو 1833ء میں اطاعت گزار بنایا لیکن انہیں اپنی سلطنت میں مدغم نہیں کیا۔ پشاور میں سید احمد کی شورش کو دبانے کے فوراً بعد سے ہی رنجیت سنگھ کی پالیسی میں تبدیلی نمودار ہوئی۔ 1831ء میں ڈیرہ غازی خان اور 1834ء میں پشاور کو براہ راست تسلط میں لایا گیا۔ ٹانک، بنوں اور ڈیرہ اسمٰعیل خان بھی 1832ء اور 1836ء کے درمیانی عرصہ میں سلطنت میں مدغم کر لیے گئے۔ دریائے سندھ کے دائیں کنارے پر واقع مٹھن کوٹ سے لے کر بار جور کی پہاڑیوں تک اس کے مقبوضات پھیلے ہوئے تھے۔ سندھ کے مغرب میں مہاراجہ کے اقتدار کے بارے میں برنز سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ میدانی علاقوں سے آگے اس کا کوئی حکم نہیں چلتا۔ ڈیرہ جات مکمل طور پر اس کے زیر تسلط ہیں۔ ڈیرہ اسمٰعیل خان کے عوام اس سے نالاں ہیں۔ عیسیٰ خیل کا سردار اب سرکش ہو گیا ہے۔ ٹانک میں رعایا سے الگ الگ شرح پر لگان وصول کیا جاتا ہے۔ بنوں سے فوجی دباؤ کے بغیر کوئی لگان حاصل نہیں ہوتا۔ بنوں کے شمال سے لے کر پشاور کے میدان تک سارا علاقہ پوری طرح رنجیت سنگھ کے زیر تحویل ہے۔ (5)

سرحدی قبائل پر قابو پانے کا جہاں تک تعلق ہے رنجیت سنگھ اس میں جزوی طور پر ہی کامیاب ہوا۔ قبائلی یورشوں کو دبانے میں اس کے بہت سے افسر

مارے گئے ۔ ان میں دیوان رام دیال، امر سنگھ کلاں اور عطر سنگھ بھی تھے ۔ رام دیال رنجیت سنگھ کے سب سے بہادر، قابل ترین اور کامیاب ترین جرنلوں میں سے ایک تھا۔ اس کے مارے جانے پر غمگین مہاراجہ نے کہا "کسی بھی بہادر کی موت یقیناً ایک بدقسمتی ہے لیکن ایک معمولی جھڑپ میں اگر کوئی ایسا عظیم حادثہ ہو جائے تو درحقیقت بہت دکھ ہوتا ہے۔ اگر رام دیال کسی بڑی لڑائی (6) میں کام آتا تو اس کی موت کا غم نسبتاً کم ہوتا۔ سید احمد جیسے شورش بپا کرنے والوں نے قبائلی علاقوں کو اپنی سرگرمیوں کا اکھاڑا بنایا۔ سید احمد عرف امیر محمد ہندوستان کے ایک شہر رائے بریلی سے آیا تھا۔ شروع میں اس نے امیر خان کی ملازمت اختیار کی۔ اپنے صلاح کار نمائندے مولوی عبدالحیٔ اور مولوی اسمٰعیل کے ساتھ وہ شکارپور سے ہوتا ہوا شمال مغرب کی طرف گیا اور لوگوں کو جہاد کے لیے بھڑکایا۔ اودھ میں شائع شدہ ایک خبر سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ سکھوں کے خلاف 21 دسمبر 1826ء کو جہاد شروع ہوا تھا۔ پاکھلی، دھمت پور، بانگند، سورت، بنوں اور تیراہ سے لوگ ان کے گرد جمع ہو گئے۔ پشاور کا یار محمد خان بھی بظاہر اس کا مرید بن گیا۔ اس نے اپنی فوجوں کو طلب کیا اور سید (7) کی ہدایتوں کے مطابق آگے بڑھنے کے احکام جاری کئے۔ سیدو کے مقام پر بدھ سنگھ کے ہاتھوں سید احمد اور یار محمد کو شکست ملی، سکھ فوجیں آگے نہ بڑھیں۔ سید نے یوسف زئیوں کے پاس پناہ لی۔ ان کی حمایت سے اس نے اٹک کے قلعہ پر قابض ہونے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ یار محمد اور سید احمد کے درمیان تعلقات کشیدہ ہو گئے۔ اور سید احمد نے اعلان کیا کہ یار محمد سکھ غلبہ سے متاثر ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کے کافر ہونے کا اعلان کیا۔ لڑائی میں اس کی شکست ہوئی اور وہ بری طرح زخمی ہوا۔ رنجیت سنگھ نے لکھا کہ یہ ایک غیبی کرشمہ تھا کہ وینٹورا (Ventura) تھوڑے سے سپاہیوں کو ساتھ لے کر اپنے گھوڑے لیلی (Laily) کو ڈھونڈنے نکلا تو اس علاقہ کے سرکردہ لوگوں کو پناہ ملی۔ (8) اس طرح وہ علاقہ لوٹ مار سے بچ گیا۔ یار محمد کے بعد سلطان محمد بطور جاگیردار پشاور کا حکمران بنا۔ سید احمد اس کو بھی تنگ کرتا رہا اور ایک موقع پر تو وہ سلطان محمد کو ہرا کر پشاور پر قابض ہو گیا۔ پشاور ہاتھ آجانے پر اس نے اپنے خلیفہ ہونے کا

اعلان کیا اور اپنے نام کا سکہ چلایا جس پر کندہ تھا "عادم احمد، حامیٔ دین" جس کے خنجر کی چمک کافروں کے لیے تباہی کا پیغام ہے " (۹) لیکن یوسف زئیوں اور سید احمد کے بیچ ناچاقی کے باعث سید احمد کو پشاور چھوڑ کر پاکھلی اور دھمور کی طرف ہٹنا پڑا۔ ان پہاڑی علاقوں میں سید احمد نے بغاوت کی آگ بھڑکا دی۔ اور یہ خطرہ لاحق ہو گیا کہ کہیں وہ کشمیر کو سر کرنے کی کوشش نہ کرے لیکن جیسے ہی اس نے مظفر آباد میں سکھ چوکی پر حملہ کیا، اسے بھگا دیا گیا۔ سید کے ایک سرکردہ ساتھی زبردست خان نے ہتھیار ڈال دیے۔ اپنے آدمیوں کو دوبارہ یکجا کرنے اور ترتیب دینے کے لیے سید میلہ کوٹ کی طرف بڑھا۔ شیر سنگھ کے ماتحت ڈوبل کے مقام پر سکھ فوجوں کے حملہ کو اس نے ناکام بنا دیا۔ اس کے فوراً بعد شیر سنگھ کی فوج نے اچانک شب خون مارا جس میں بالاکوٹ کے مقام پر سید اپنے پانچ سو ساتھیوں سمیت مارا گیا۔ سید کی موت کے بعد سکھوں کی براہِ راست حکومت کے تحت پشاور میں نسبتاً سکون رہا۔ لیکن 1836ء میں موہن لال نے ویڈ (Wade) کو لکھا کہ ایک مسلمان کٹر پنتھی نصر الدین ڈیرہ جات میں لوگوں کو مذہب کے نام پر اکسانے اور جہاد شروع کرنے کی زبردست کوشش کر رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ مرحوم سید احمد کا رشتہ دار ہے۔ (۱۰) بہر حال یہ خطرہ پیش نہیں آیا۔ سرحدی علاقوں کے الحاق کے بعد رنجیت سنگھ نے جو پالیسی اختیار کی وہ سکھ لڑائیوں کے بعد کی انگریزی حکومت کی پالیسی سے مختلف نہ تھی اس کو "مارو اور بھگاؤ" "Knock and Run Policy" کہا جا سکتا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ جب کوئی قبیلہ بہت زیادہ سرکش ہو جاتا ہے اور بار بار چھاپے مارنے لگتا ہے تو اس کے علاقہ میں ایک فوجی دستہ گھس کر لوٹ مار کر کے فوراً واپس آ جاتا ہے۔ پہاڑوں کی تلہٹی میں ہمیشہ ایک گشتی دستہ کوہستانیوں کو قابو میں رکھنے کے لیے حرکت میں رہتا تھا۔ مئی 1835ء میں میزن (Masson) نے جو پیشین گوئی کی تھی کہ پشاور دوسرا مصر ہے۔ پشاور کے قبائل اسرائیل کی اولاد ہیں۔ رنجیت سنگھ مصر کا حکمران بنے گا اور دریائے اٹک دریائے نیل ہو جائے گا بشرطیکہ اس حاکم مصر کو سرنگوں کرنے کے لیے کوئی موسیٰ مل گیا۔ مگر سکھ تاریخ کے کسی دور میں یہ پیشین گوئی درست ثابت نہ ہوگی۔ (۱۱)

ہزارہ اور پشاور کے گورنر ہری سنگھ نلوہ نے جو تاریخی کردار ادا کیا ہے اس کا

جائزہ لیے بغیر رنجیت سنگھ کی شمال مغربی سرحدی حکومت کی تفصیل ادھوری رہے گی
ہزارہ میں بڑی شورش پھیلی ہوئی تھی۔ 1813ء اور 1820ء کے درمیانی عرصہ میں
رنجیت سنگھ نے اس ضلع کو مکمل طور پر اپنے قبضہ میں لینے کی جو کوششیں کیں وہ ناکام
رہیں۔ یکے بعد دیگرے محکم سنگھ، رام دیال اور امر سنگھ مجیٹھیہ گورنروں کو موت کے گھاٹ
اتار دیا گیا۔ سدا کورا اور شیر سنگھ نے اصلح کل کی پالیسی پر عمل کیا مگر اس سے سکھ حکومت
کمزور ہوتی چلی گئی۔ تب ایک اہم واقعہ ہوا۔ کشمیر کا گورنر ہری سنگھ سات ہزار (7000)
سپاہیوں کے ساتھ خزانہ لے کر مظفر آباد کے راستہ لاہور آرہا تھا۔ ہزارہ کے تقریباً پچاس
ہزار باشندوں نے ان کو راستہ میں روک کر محصول طلب کیا۔ ہری سنگھ نے ان کو
شکست دی۔ جو موت کے گھاٹ اترے ان کا شمار دو ہزار سے کم نہ تھا۔ یہ ایک شاندار
فتح نہ تھی۔ ان سرکشوں کا رہبر تارا ان سردار سری کوٹ پہاڑیوں کی طرف بھاگ کھڑا
ہوا۔ اس نے زوردار فتح کے بعد ہری سنگھ کو ہزارہ کا گورنر مقرر کیا۔ اگلے دو سالوں
میں ہری سنگھ جو میدانی علاقوں میں لگاتار فتح یاب رہا تھا باغیوں کی سرکوبی نہ کر
سکا کیونکہ وہ بار بار سری کوٹ کی پہاڑیوں میں پناہ گزین ہو جاتے تھے۔ اس نے
ہری پور، نواں شہر اور مانسہرہ کئی قلعے تعمیر کرائے۔ سری کوٹ کی پہاڑیوں کو سر کرنے
کی پہلی کوشش میں ہری سنگھ کی جان بڑی مشکل سے بچی۔ مہاراجہ خود کمک لے کر
موقع پر پہنچ گیا اور 1825ء میں اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ سری کوٹ میں
ایک قلعہ تعمیر کیا گیا اس سے گکھڑوں پر بھی خوف طاری ہو گیا۔ انجام کار ہری سنگھ نے
ہزارہ کو مہاراجہ کا مکمل طور پر اطاعت گذار بنا دیا۔ (12)

ہزارہ کے الحاق کے بعد ہری سنگھ کو پشاور کا گورنر بنا دیا گیا۔ اس نے سالانہ
مہموں کے دوران اپنے سپاہیانہ اوصاف کا جو مظاہرہ کیا اس سے پٹھان کافی متاثر
ہوئے اور اس کی تعریف کرنے لگے۔ وہ اپنے پیچھے بہادری اور فن سپاہ گری کی جو روایت
چھوڑ گیا ہے اس کو بھلایا نہیں جا سکتا۔ سرکش پٹھانوں کو راہ راست پر لانے کے لیے
سکھ تاریخ میں وہ عظیم ترین شہرت رکھتا ہے۔ مہاراجہ کی پالیسی نے اس کے کام کو
بہت حد تک آسان کر دیا۔ مہنت نگر، دوآب کا آدھا حصہ، کوہاٹ اور ہنگو کے علاقے
ضلع بھر میں سب سے زیادہ پریشانی کا موجب تھے جو بطور جاگیر بارک زئیوں کو دے دیئے

گئے تھے۔ اس طرح رنجیت سنگھ نے اپنی پریشانی کو بڑی حد تک کم کر لیا۔

پنجاب کو افغانستان کے حملوں سے محفوظ رکھنا، قبائل کے اجتماع کو روکنا، خراج کی وصولی میں سہولیت بہم پہنچانا، بوقتِ ضرورت قبائل کو خوف زدہ کرنا اور ذرائع آمد و رفت کو کھلا رکھنا، ان مقاصد کے پیشِ نظر شمال مغربی سرحد پر فوجی انتظامات کیے جاتے تھے۔ رنجیت سنگھ نے افغانستان سے پرے روس کی طرف کوئی توجہ نہ دی، کیونکہ اسے روسی حملہ کا کوئی خوف نہ تھا۔ دریائے سندھ پر اٹک کے مقام پر رنجیت سنگھ کے پل بنانے کے انتظامات کے بارے میں برنز لکھتا ہے "کہ اٹک کے مقام پر جہاں سندھ کی چوڑائی صرف 260 گز ہے، پل بنانے کے لیے 37 کشتیوں کا ایک بیڑہ تیار رہتا ہے۔ دریا میں کشتیوں کے ایک دوسرے سے تھوڑے فاصلہ پر لنگر ڈالے ہوتے ہیں۔ آمد و رفت کے قابل بنانے کے لیے ان کشتیوں کو ایک دوسرے کے ساتھ لکڑی کے تختوں سے جوڑا جاتا ہے اور ان پر مٹی ڈال دی جاتی ہے۔ دریائے سندھ پر ایسا پل نومبر سے اپریل تک ہی بنایا جا سکتا ہے۔ لکڑی کے ڈھانچوں میں 250 من وزنی پتھر بھر کر اور مضبوط رسوں سے باندھ کر 6/4 کی تعداد میں ان کو ہر کشتی سے نیچے پانی میں گرایا جاتا ہے۔ حالانکہ پانی کی گہرائی ساٹھ گز سے بھی زیادہ ہے۔ کشتیوں میں دو بحر ڈھانچے ڈال کر لگاتار اس پل کو مضبوط رکھا جاتا ہے تاکہ کوئی حادثہ نہ ہو۔ ایسا پل تین دن میں تیار ہو جاتا ہے۔ عام حالت میں (13) اسے تیار کرنے میں چھ دن لگ جاتے ہیں۔ سلطنت میں شامل کرنے کے بعد پشاور کو مضبوط و مستحکم بنایا گیا۔ بکّم و ماچن کے مقامات پر قلعے تعمیر کئے گئے۔ اٹک اور پشاور کے درمیان ہر دو کوس کے فاصلہ پر مینار بنائے گئے۔ یہ قلعے اس علاقے کی حفاظت کرتے تھے۔ ہزارہ کے علاقہ میں سب سے اہم کشتان گڑھ کا قلعہ تھا۔ (14) نارہ، ستبنہ، درما اور مارو کے مقامات پر بھی قلعے تعمیر کئے گئے۔ ہر ستر ہزار یا اسّی ہزار کی وصولی پر سکھوں نے چار ہزار روپے کی مالیت کا قلعہ بنا دیا۔ جنوبی علاقہ میں ترّنی کمرون و دیگر قلعے تھے۔ (15) اٹک، خیر آباد، شب قدور، جہانگیرا اور دوسرے مقامات پر بھی قلعے بنائے گئے۔ ڈھونڈ، کرک اور نواحی پہاڑی علاقوں سے کوئی لگان نہیں آتا تھا۔ وہ علاقے پنجاب کے ڈاکوؤں کے گڑھ تھے۔ ان کو خوفزدہ کرنے کے لیے گرد و نواح میں قلعے بنائے گئے۔ جمرود کا قلعہ

تعمیر کرتے ہوتے افغانوں کے اچانک حملہ میں ہری سنگھ نلوہ مارا گیا۔ اس کی موت کے بعد جمرود کے پاس ہی ایک نیا قلعہ بنایا گیا اور اس کا نام فتح گڑھ رکھا گیا۔ تورنبد اور درنبد کے درمیانی علاقے میں (16) قلعے آمنے سامنے ہیں۔ لیکن رنجیت سنگھ کے دفاعی منصوبہ کا سب سے اہم حصہ ڈیرہ اسمٰعیل خان پر اس لیے قبضہ کیا کہ دریائے سندھ کے کنارے کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پشاور سے سلسلۂ رسل و رسائل قایم کیا جائے لیکن ویڈ کے مطابق اس کا مقصد کچھ اور بھی تھا۔ ڈیرہ اسمٰعیل خان پر قبضہ کرنے کا ایک مدعا یہ بھی تھا کہ ایک نئے مورچہ سے دوست محمد خان کو خائف کر دیا جائے۔(17) اور پشاور کی نسبت اس نئے مورچہ پر پہنچنا رنجیت سنگھ کے لیے کم دشوار نہ تھا۔ ڈیرہ اسمٰعیل خان سے پشاور کے استحکام کے دوران افغان حملہ سے بھی پنجاب کی حفاظت کی جا سکتی تھی۔ پشاور کے گورنر ہری سنگھ نلوہ اور آدتابائل بہت قابل اور جابر حکمران تھے۔

شمال مغربی سرحد کے بندوبست میں رنجیت سنگھ کو اپنے لگان ہی سے زیادہ تر مطلب تھا۔ انصاف وغیرہ کی اسے قدرے فکر نہ تھی۔ حالانکہ یہ کہنا کچھ ناواجب ہوگا کہ جہلم پار کے بہت بڑے علاقے پر حکومت کرنے کی بجائے (18)، رنجیت سنگھ تا دم زیست برسر پیکار اور لوٹ مار کرتا رہا۔ رنجیت سنگھ نے کافی حد تک علاقائی خودمختاری دے رکھی تھی۔ ہر خان (جاگیردار) خالصہ سرکار کی برتری کو تسلیم کرتا تھا۔ گورنر کے مطالبہ پر ہر قسم کا خراج بھی دیتا تھا۔ پھر بھی وہ اپنے علاقہ میں پوری طرح خودمختار تھا وہ اپنے علاقوں کے باشندوں پر حسب خواہش ٹیکس و جرمانے عائد کر سکتا تھا یہاں تک کہ سکھ دربار کو اطلاع دیے بغیر موت کی سزا دینے کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ اُدتابائل کے دیوان لچھمی پرشاد کے کاغذات سے پشاور پر لگان اور اخراجات کی مندرجہ ذیل تفصیل ہم حاصل کر سکتے ہیں۔

پشاور	آنہ	روپیہ
لگان، نانک شاہی	٥٥	118609
گونڈے (روپیہ)	٥٥	174113
میزان		1360822

174113 گونڈرے کا آٹھواں حصہ 5 — 21764

بقایا — 11 — 13,39057

خرچ

مد	آنہ	روپیہ
بصورتِ پنشن	00	9898
خیراتی اراضیات	4	24939
جاگیرداران	00	40590
اُدتا بائل کی تنخواہ	00	50000
دفتر نظم ونسق	00	7087
گاؤں کے سربراہ افسران ضلع وعدالتی اخراجات	8	25849
رنگھول بٹالین	00	286827
پولیس دستہ	00	51155
میزان	12	1076345
گونڈرے (روپیہ) نفی	14	2263
	14	1074081
بقایا نانک شاہی (روپیہ)	14	264975

اس میں کوہستانی لشکر کے چھ ہزار سپاہیوں کا خرچ، سرکاری عمارت کی مرمت قلعوں کی رسد، کمیشن اور مخصوص کاموں وغیرہ پر اخراجات شامل نہیں ہیں۔ (19)

بنوں ٹانک

لگان تقریباً — 00 — 65000

لگان اکثر فوجی دباؤ کے ذریعہ وصول کیاجاتا تھا۔

ڈیرہ اسمٰعیل خان، ماروات وغیرہ

لگان — 00 — 604868 (20)

رنجیت سنگھ اپنی مغربی سرحدی مسئلہ حل کرنے میں بہت حد تک کامیاب رہا۔ جب تک سکھ سلطنت قایم رہی اس سرحد سے افغانستان کے حملوں سے مدافعت

کی گئی۔ بلاشبہ سرحدی قبائل کو براہِ راست تسلط میں نہیں لایا گیا۔ ان حالات میں یہ ممکن بھی نہ تھا۔ مغربی سرحد کے مفتوحہ علاقوں کا جہاں تک تعلق ہے اس نے صورتِ حال اور حقائق کو سمجھنے میں بڑی سوجھ بوجھ دکھائی۔ رنجیت سنگھ پشاور تک ایک ایسی شاہ راہ بنانے کا خواہاں تھا جس پر عوام بے خطر و بحفاظت سفر کر سکیں۔ لہٰذا اس نے حکم جاری کیا کہ رہزنوں کو بندوق کی گولی کا نشانہ بنا دیا جائے یا تلوار کی دھار سے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ ڈبلیو بار (W. Barr) وِیڈ کے ہمراہ 1837ء میں کابل گیا تھا اس نے لکھا ہے کہ کبھی کبھار پہاڑی قبائل کے دھاوں کو چھوڑ کر قتل کی اکا دکا خبریں سننے میں آتی ہیں (21) اس ناہموار پتھریلے علاقہ پر جس میں سلسلۂ رسل و رسائل بہت دشوار تھا، جہاں باہمی جھگڑے برسوں چلتے رہتے تھے اور لوٹ مار عام تھی رنجیت سنگھ کی کامیابی کو مندرجہ ذیل الفاظ میں بہترین طور پر بیان کیا گیا ہے۔

لاہور سرکار کی طاقت کو ہمیشہ تسلیم کیا جاتا ہے اور اکثر یہ حاوی رہتی ہے لیکن پھر بھی عوام اپنے باہمی جھگڑے بزورِ شمشیر نپٹانے میں آزاد ہیں۔ سماج کو متحد رکھنے اور لاقانونیت کے تدارک کے لیے قبائل کی قوت پر انحصار کیا جاتا ہے۔ سرکار کو لگان ہی سب سے زیادہ عزیز ہے۔ (22)

شمال مغربی سرحد پر سکھ حکومت کے انتظام میں اعتدال وِیڈ نے بھی تسلیم کیا ہے۔ اس نے لکھا ہے "ڈیرہ غازی خان اور متھن کوٹ میں سکھ دستہ کی تعداد پانچ سو سپاہیوں سے زاید نہیں۔ نئے مفتوحہ علاقوں پر اس قدر کم سپاہیوں کا تعین اس بات کو صاف طور پر ثابت کرتا ہے کہ سکھوں نے ڈیرہ جات کے سرداروں کی باغیانہ فطرت کو سر کرنے اور امن و آشتی لانے میں ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ (23)

اشارات

1۔ سیاسی کارروائیاں (P.P.)، 31 جولائی 1837ء، نمبر 23
2۔ ایضاً، 9 مئی 1838ء، نمبر 76
3۔ ایضاً 15 اگست 1836ء
4۔ کننگھم صفحہ 221

5. سیاسی کارروائیاں - ۱۱ر ستمبر 1837ء نمبر 29
6 - کلکتہ ریویو 1885ء
7 - ظفر نامہ مصنفہ دیوان امرناتھ 1826ء
8 - سیاسی کارروائیاں۔ 23ر اکتوبر 1822ء نمبر ۱۹، رنجیت سنگھ کا خط لدھیانہ میں ایجنٹ کے نام
۹ - دی انڈین مسلمان مصنفہ ہنٹر صفحہ ۱۹
۱۰ - سیاسی کارروائیاں 6ر جون 1836ء نمبر 86
۱۱ - ایضاً مئی 1835ء
12 - پنجاب ڈسٹرکٹ گزیٹیر، ہزارہ اینڈ پشاور (1883-84ء) (1897-98)
13 - سفر نامہ (Travel) جلد اوّل صفحات 267-68۔ برنیز Burnes
14 - میزن بنام ویڈ مورخہ 26ر جنوری 1836ء
15 - میکسن بنام ویڈ 24ر اکتوبر 1837ء
16 - میکسن بنام ویڈ 25ر نومبر 1837ء
17 - سیاسی کارروائیاں 31ر اگست 1837ء نمبر 69
18 - فارن ڈیپارٹمنٹ متفرق۔ ایچ۔ بی۔ ایڈورڈ بنام ریزیڈنٹ مقیم لاہور۔ 4ر مئی 1847ء
۱۹ - فارن ڈیپارٹمنٹ متفرق نمبر 351۔ باب پنجم میں عام حالات میں لگان واخراجات کا حوالہ دیا گیا ہے۔ خالصہ دربار ریکارڈ کی فہرست جلد اوّل بنڈل نمبر 15-A - بخشی بھگت رام انچارج عہدیدار۔ اس بنڈل میں پشاور میں تعینات باقاعدہ فوج کے ڈویژن کو تنخواہ کے بلوں وغیرہ سے متعلقہ فہرستیں ہیں اس ڈویژن میں سات سے دس بٹالین گھوڑ سوار، پندرہ سے بیس عدد تک توپیں بارود اور کچھ بے قاعدہ فوج جس کی تعداد کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ اس ڈویژن میں سالانہ آٹھ لاکھ روپے خرچ آتا تھا جو اس صوبے کے لگان کے مساوی تھا۔ J.A.S.B.
آغا عباس شیرازی نے لکھا ہے کہ پشاور کا لگان سادر زئی حکمرانوں کے

دور حکومت میں 9 51000 روپیہ تھا جس میں سے 240000 ملاؤں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔

20 - فارن ڈیپارٹمنٹ متفرقات نمبر 351
21 - کابل اینڈ پنجاب مصنفہ ڈبلیو بار صفحہ 168
22 - اٹک ڈسٹرکٹ گزیٹ 1907 ، حصہ الف صفحہ 39
23 - فارن ڈیپارٹمنٹ سیاسی کارروائیاں (P.P.) 20 اکتوبر 1837ء نمبر 69 -

ساتواں باب

بہاولپور، سندھ، نیپال و ہندوستان کی دیگر ریاستوں سے رنجیت سنگھ کے تعلقات

بہاولپور، سندھ اور ستلج کے سنگم کے آگے بائیں کنارے پر واقع ایک راجپوتانہ کا ریگستان، مغرب میں ستلج کے ساتھ پنج ند اور دریائے سندھ اور شمال میں انگریزی مقبوضات واقع تھے۔ ۱۸۰۹ء کے بعد یہ ریاست بھی کسی حد تک انگریزی حکومت کی حفاظت میں آگئی۔ 1833ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی اور بہاولپور کے سردار کے درمیان دائمی دوستی اور اتحاد کا معاہدہ ہوا۔ اس ریاست پر داؤد پتروں کی حکومت تھی۔

1807ء میں رنجیت سنگھ نے ملتان کا محاصرہ کیا۔ بہاولپور کے خان نے ملتان کے حاکم مظفر خان کو مقابلہ کرنے کے لیے بھڑکایا۔ لیکن فروری 1810ء میں جب رنجیت سنگھ نے ملتان پر دوبارہ حملہ کیا اور گھیرا ڈالا تو بہاولپور کے خان نے اسے امداد بھیجنے میں آنا کانی کی کیوں کہ وہ سکھوں سے اچھے تعلقات بنائے رکھنا چاہتا تھا۔ ڈیرہ غازی خان اور ڈیرہ اسماعیل خان کے سرداروں نے مظفر خان کو امداد دینے کے لیے اس پر زور ڈالا۔ پھر بھی نواب ٹس سے مس نہ ہوا (۱) کیوں کہ ستلج کے دائیں کنارے پر واقع ان علاقوں کو رنجیت سنگھ نے نواب کو پٹے پر دے دیے تھے۔ وہ انہیں اپنے ہاتھ سے کھونا نہیں چاہتا تھا۔

1818ء میں رنجیت سنگھ نے ملتان فتح کیا اور 1821ء میں ڈیرہ جات پر قابض ہو گیا۔ بہاول خان اوّل کے انتقال کے بعد رنجیت سنگھ نے اس کے جانشین

صادق محمد خان سے خراج طلب کیا اس نے انکار کر دیا۔ بٹی کے قلعہ کے نزدیک ایک جنگ میں صادق محمد کو شکست ہوئی اور اس نے ایک بھاری نذرانہ دینے کا وعدہ کیا صادق محمد خان کو ملتان کے نواب سے اور ڈیرہ ناظم خان سے جو خراج ملتا تھا وہ اب رنجیت سنگھ کو ملنے لگا کیوں کہ رنجیت سنگھ اب ان پر قابض ہو چکا تھا۔ جنگ کے بعد معاہدہ کے مطابق ڈیرہ جات کو خان کی تحویل میں دے دیا گیا۔ جس نے تین لاکھ روپے سالانہ نذرانہ رنجیت سنگھ کو دینا منظور کیا۔ مگر یہ سالانہ نذرانہ ہمیشہ بزور بازو وصول کیا جاتا تھا۔ رنجیت سنگھ کے فوجی دستوں کو دیکھتے ہی ستلج کے دوسرے کنارے پر خان کے افسر اس علاقہ کو فی الفور چھوڑ کے پیچھے ہٹ جاتے اور اس طرح حملہ آور فوجیں وہاں لوٹ مار کا بازار گرم کر دیتیں۔ بالآخر مطالبہ مبلغات کے نصف پر یا اس سے بھی کم پر بات طے ہو جاتی۔ ہر سکھ حملہ، خان بہاولپور کو سکھوں کے بڑھتے ہوئے مطالبات کو پورا کرنے کے اور بھی ناقابل بنا دیتا تھا (2) ڈیرہ سرحد پر سکھ مقبوضات غالباً فوجی وجوہ پر ہی بہاولپور کے علاقوں کے اندر تک چلے گئے تھے۔

بہاول خان سوم یا رحیم یار خان جو 1825ء میں تخت نشین ہوا، سکھوں کو سالانہ نذرانہ ادا کرتا رہا۔ لگان کا مطالبہ ہر سال بڑھتے بڑھتے پانچ لاکھ روپے سالانہ تک پہنچ گیا۔ 1831ء میں رنجیت سنگھ نے ان علاقوں کو براہ راست اپنی تحویل میں لے لیا جو اس نے پٹے پر نواب بہاولپور کو دیے تھے اور ونٹورا (Ventura) کو ان علاقوں کی دیکھ بھال کے لیے مقرر کیا گیا۔

ستلج اور سندھ کے بائیں کنارے پر واقع مقبوضات کے لیے بہاولپور نے کبھی کوئی خراج سکھوں کو نہیں دیا۔ محصول چنگی کے معاملہ میں جو معاہدہ سکھوں انگریزوں سندھیوں اور داؤد پتروں کے مابین ہوا تھا۔ اس میں بہاولپور کو بھی حصہ ملتا تھا۔ روپڑ سے لے کر سمندر تک ایک کشتی کے کل محصول ۵۷۰ روپے میں سے نواب بہاولپور کا حصہ 106 روپے 12 آنے اور 3 پائی یومیہ تھا (3)

سندھ۔ ملتان کی پہلی مہم کے بعد رنجیت سنگھ کا ایک وکیل سندھ گیا اور امیران سندھ سے بات چیت شروع کی۔ وکیل کو دریا کے راستہ حیدرآباد جانا پڑا۔ سندھ کے دونوں کناروں کے قبائلی باشندوں نے اس پر گولیاں چلائیں لیکن وہ

وسیع پیچھے ہوئے دریائے سندھ نے اس کی حفاظت کی۔ ملتان کی تسخیر کے بعد جیسا کہ کننگھم (Cunningham) لکھتا ہے کہ رنجیت سنگھ اپنا رخ سندھ کی طرف موڑنے کا خواہش مند تھا۔ ملتان پر اس کی فتح امیران سندھ کے لیے اس بات کا اشارہ تھی کہ وہ طاقت ور پڑوسی کی طرف اپنی دوستی کا ہاتھ بڑھائیں۔ (4) سندھ کے سفیر باقاعدہ حاکم لاہور کے دربار میں پیش ہوتے رہے۔ موقع ملتے ہی مہاراجہ نے ان سے اس خراج کا مطالبہ کیا جو قبل ازیں امیران سندھ افغان کو دیا کرتے تھے۔ بہر حال اس نے اس مطالبہ پر اصرار نہیں کیا۔ 1826ء میں اس نے ایران سندھ کے سفیروں سے خراج کا دوبارہ مطالبہ کیا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ کابل کی سلطنت کے بہت بڑے حصہ پر وہ قابض ہو چکا تھا اور اس طرح کابل کے حقوق کا وہ مستحق ہے۔ رنجیت سنگھ یہ (5) دلیل بھی دے سکتا تھا کہ کابل کی حالت زار سے زیادہ اس کی کامیابیوں نے سندھیوں کو اس قدر دلیر بنا دیا تھا کہ انہوں نے کابل کو خراج دینے سے انکار کر دیا۔ اس اصول پر سفیروں کے اختلاف کرنے کی بنا پر مہاراجہ نے بھی اس مطالبہ پر اصرار نہیں کیا۔

1831ء میں سندھ کے ساتھ رنجیت سنگھ کے تعلقات کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ سید احمد جو شمال میں رنجیت سنگھ کے لیے بڑا دردِ سر تھا اب فوت ہو چکا تھا۔ پشاور سے لے کر دریائے سندھ کے بائیں کنارے پر واقع سارا سرحدی علاقہ محفوظ ہو جانے پر حاکم لاہور نے اپنی توجہ اب سندھ کی جانب مبذول کی۔ دوسروں کی نسبت سندھیوں پر غالب فتح پانا اس کے لیے آسان تھا۔ سندھ پیش قدمی اس کی سوجھ بوجھ کا آئینہ دار تھی۔ جب اس نے بہاولپور پر حملہ کیا تو اس کی فوجوں کو سندھ کی ایک چوکی سبزال کوٹ کی طرف دھکیل دیا گیا۔ خوش قسمتی سے اس نے ہرانداور واجل کے بلوچ صوبوں کو اپنی تحویل میں لے لیا اس سے شکارپور کے لیے راستہ صاف ہو گیا۔ تب اس نے ڈیرہ غازی خان کو بھی براہِ راست اپنے قبضہ میں لے لیا جو اس سے پہلے اس نے ڈیرہ غازی خان کو پٹے پر نواب بہاولپور کو دے رکھا تھا۔ وینٹورا کو ان علاقوں کی نگرانی کے لیے تعینات کیا گیا اور اسے ہدایت کی گئی کہ وہاں ایک مضبوط قلعہ تعمیر کرائے۔ بظاہر اس کا ارادہ وہاں ایک چھاؤنی قائم کرنے کا تھا جس کے ذریعہ سندھ پر حملہ کرنے کی تیاریاں کی جا سکتی تھیں۔ وینٹورا نے یہ بھی بتایا کہ مہاراجہ کی حدودِ سلطنت

سے شکارپور صرف تیس کوس کے فاصلہ پر تھا۔ (6)

اس وقت سندھ بلوچی قبیلے کی تین شاخوں تالپور حیدرآباد، خیرپور اور میرپور میں بٹا ہوا تھا۔ پوٹنجر کے اندازے کے مطابق سندھ کی سالانہ آمدنی حسب ذیل پچاس لاکھ سے بھی زائد تھی۔

حیدرآباد — تیس لاکھ روپے سالانہ
خیرپور — پندرہ لاکھ روپے سالانہ
میرپور — سات لاکھ روپے سالانہ (7)

لیکن برنز کا کہنا ہے کہ حیدرآباد کی پندرہ لاکھ، خیرپور کی دس لاکھ اور میرپور کی پانچ لاکھ روپے سالانہ آمدنی تھی۔ اس طرح کل آمدنی صرف تیس لاکھ روپے بنتی تھی۔

پوٹنجر کے بیان کے مطابق امیروں کی فوجی سپاہ کی تعداد بیس ہزار، بارہ ہزار اور آٹھ ہزار یعنی کل چالیس ہزار تھی۔ فوج میں خاص طاقت گھوڑ سواروں کی تھی اور یہ طاقت بے حد حقیر تھی۔ بہرحال برنز لکھتا ہے (8) کہ ان کی فوج کے بارے میں کئی اندازے لگائے گئے ہیں لیکن وہ سب مبہم اور غیر واضح ہیں کیوں کہ تجارتی طبقہ کو چھوڑ کر ہر باشندہ بالغ ہونے پر سرکاری آئین کے مطابق سپاہی بن جاتا ہے۔ لہٰذا یہ باقاعدہ فوج نہ تھی بلکہ بھیڑ میں شمار کی جا سکتی تھی۔

محمد عظیم خان کے انتقال کے بعد سندھی شکارپور پر قابض ہونے میں کامیاب ہو گئے دراصل ان کا یہ قبضہ محض اتفاقی تھا۔ رنجیت سنگھ کا خیال تھا کہ درانی حکومت کا جانشین ہونے کے باعث سلطنت کے اس حصہ پر اس کا حق فائق ہے۔ جنوب میں شکارپور ہی اس کا منتہائے مقصود تھا کیوں کہ اسے خراسان کا دروازہ سمجھا جاتا تھا۔ سندھ اور وسط ایشیا کی تجارت کے اعتبار سے یہ مقام اہم ترین تھا۔ دور دراز منڈیوں سے اس کا تجارتی رابطہ تھا، شکارپور پر قبضہ ہی بلوچستان اور افغانستان کو صحیح معنوں میں اس کے دائرہ اختیار میں لا سکتا تھا۔ سب سے دلچسپ پہلو یہ تھا کہ شکارپور میں نصف سے زیادہ آبادی سکھوں کی تھی اور مسلمان کل آبادی کا دسواں حصہ تھے۔ یہاں کی سالانہ آمدنی ڈھائی لاکھ روپے اور کسٹم کی آمدنی چونسٹھ ہزار روپے سالانہ تھی۔

مہاراجہ نے اس بارے میں انگریزی سرکار کے نظریہ کو جاننا بھی ضروری سمجھا۔

1831ء میں اس نے ویڈ کو بتایا کہ اس نے سر ڈیوڈ آکٹرلونی (Sir David Ochterlony) سے دریافت کیا تھا کہ کیا کمپنی سندھ کی جانب بھی اپنے مقبوضات کو وسیع کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ مسٹر آکٹرلونی نے جواب دیا "کمپنی سیر ہو گئی" یعنی سندھ کی طرف اپنی سلطنت کو وسعت دینے کا وہ کوئی ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ اس بات کا ذکر کرتے ہوئے رنجیت سنگھ نے ویڈ سے یہ معلوم کرنا چاہا کہ کیا اب تک کمپنی کا وہی نظریہ ہے (10)۔ اکتوبر 1831ء میں جب رنجیت سنگھ نے روپڑ کے مقام پر لارڈ ولیم بینٹنک سے ملاقات کی تو گورنر جنرل سے براہ راست سوال کرنے کے بجائے رنجیت سنگھ نے چیف سکریٹری سے یونہی کچھ سوال سندھ کے بارے میں کر لیے تاکہ اس مسئلہ پر حکومت ہند کی پالیسی اس پر واضح ہو سکے۔ لیکن چیف سکریٹری نے اس معاملہ پر خاموشی اختیار کی حالانکہ انہیں دنوں پوٹینجر امیران سندھ کے ساتھ تجارتی معاہدہ طے کرنے کی بات چیت کر رہا تھا۔ انگریزوں کے کیریکٹر اور ان کی پوزیشن کا تقاضا تھا کہ امیران سندھ کے ساتھ کیے گئے معاہدوں کو صیغۂ راز میں نہ رکھتے، خاص طور پر جب کہ رنجیت سنگھ کو بھی (11) دریائے سندھ کے استعمال کے معاملہ میں فریق بنانا منظور تھا۔ بہر حال رنجیت سنگھ نے اس مسئلہ پر انگریزی سرکار کی مخالفت مناسب نہیں سمجھی اور نہ ہی شکارپور پر اپنے حقوق کے لیے اس نے زور دیا بلکہ وقتی طور پر امیروں کے خلاف اپنے منصوبوں کو بھی بالائے طاق رکھ دیا لیکن اس تجارتی معاہدہ کی بنا پر انگریز امیران سندھ کے خلاف کی گئی کسی بھی کارروائی پر اعتراض کر سکتے تھے اور اس طرح عملی طور پر انگریزی حکومت نے ان سندھی امیروں کو اپنی جزوی حفاظت میں لے لیا تھا۔ رنجیت سنگھ نے سندھ کے بارے میں اپنے منصوبوں کو قطعی طور پر ترک نہیں کیا تھا۔ برنز کے بیان سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ حیدرآباد کے تالپوری شہزادوں میں سے ایک شہزادہ نور محمد سکھوں کا قریبی دوست تھا۔ ایک شخص ملک بدر کلہوڑا نامی کی پنشن رنجیت سنگھ نے مقرر کر دی اور سندھ پار راز پور میں اس کے ٹھہرنے کا بندوبست کر دیا۔ (12) تاکہ تالپوری کی مزاحمت کا موقع رہے۔

1835ء میں پھر ایک بار رنجیت سنگھ نے سندھ پر حملہ کرنے اور شکارپور کی طرف کوچ کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ 29 دسمبر 1831ء کو مہاراجہ نے

دربار میں اپنے پوتے نونہال سنگھ کو خلعت سے سرفراز کرتے ہوئے حکم دیا کہ وہ براستہ ملتان پٹھان کوٹ جاکر سندھ کے امیروں پر واضح کر دے کہ جو خراج وہ کابل کو دیتے تھے اگر وہ خراج مہاراجہ کو دینا منظور کرلیں تو بہتر ہے ورنہ شکارپور پر قبضہ کر لیا جائے گا۔ ہری سنگھ نلوہ کو شہزادے کے ساتھ جانے کی ہدایت کی گئی۔ اس پیش قدمی اور حملہ کے لیے وجہ جواز بھی تھی کیوں کہ سوداگروں نے مہاراجہ سے شکایت کی کہ مزاریوں نے جو ایک جنگلی قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے ان کو حبس بے جا میں رکھا تھا۔ مزاری کسی بھی حکومت کے ماتحت نہیں رہے تاہم برائے نام ان کا شمار سندھ کی رعایا میں ہوتا ہے(13)

رنجیت سنگھ کی پیش قدمی کی خبر پاتے ہی سندھ کے امیروں پر دہشت طاری ہوگئی۔ انہوں نے دوست محمد کے پاس ایک وکیل بھیجا اور کوہاٹ کے راستہ ڈیرہ جات کے افغان سرداروں کو بھی لکھا۔ میر نور محمد خان اور نصیر محمد خان دونوں بھائیوں نے ایک طویل ذاتی بات چیت کے بعد فوجوں کو منظم کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ رنجیت سنگھ کی پیش قدمی کو روکا جا سکے۔ انہوں نے ناکامی کی صورت میں انگریز سرکار سے بھی حمایت کی درخواست کرنے کا فیصلہ کیا(14)۔

ملتان کے گورنر دیوان ساون مل نے پانچ توپوں، دو ہزار سپاہیوں اور پچاس کنڈوں کے ساتھ سندھ پر چڑھائی کر دی۔ روجھان شہر کو لوٹا جو اس وقت رستم خان کے تحت تھا اس نے دریائے سندھ پر واقع ایک قلعہ کھیم پر بھی قبضہ کر لیا۔ ہر روز سکھ فوجیں مٹھن کوٹ پہنچ رہی تھیں اور سندھی سپاہ شکارپور میں جمع ہو رہی تھیں۔ امیروں نے دس ہزار گھوڑ سوار اور پیادہ فوج لاڑکانہ بھیجی اور چاروں طرف سپاہیوں کو تعینات کر دیا۔ لاڑکانہ کو پچاس توپیں بھی ارسال کیں توقع تھی کہ اگر امیروں نے مطلوبہ خراج دینا منظور نہ کیا تو جلد ہی دونوں افواج کے مابین ایک زوردار جھڑپ ہو گی۔(15)

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یوٹینجر کی امیران سندھ سے بات چیت رنجیت سنگھ کو سندھ پر حملہ کرنے سے نہیں روک سکتی تھی۔ البتہ ڈر یہ تھا کہ اسی بہانے کہیں انگریز رنجیت سنگھ سے کیے گئے معاہدہ کو فسخ نہ کر دیں۔ بظاہر اپنے دوست انگریزوں کی خواہشات کا احترام کرتے ہوئے رنجیت سنگھ نے امیران سندھ کے ساتھ دہی

تعلقات قایم رکھے جو پہلے سے چلے آ رہے تھے۔ اُس کے سرداروں نے اُسے مجبور کیا کہ وہ انگریزی حکومت کے آگے سر نہ جھکائے۔ کہا جاتا ہے کہ بھرے دربار میں دھیان سنگھ نے رنجیت سنگھ کو "عورت" کہا(16) مگر سرداروں کی سب کوششیں ناکام رہیں۔

یہ سوچنا کہ رنجیت سنگھ نے سندھ پر سے اپنی نظریں ہٹالیں، غلط ہے۔ اس نے سرحدوں کی حدبندی کی آخری تشکل کے مسئلے کو بھی ہاتھ نہیں لگایا۔ میر پور کے تالپوری اور حیدرآباد و خیرپور کے سرداروں کے درمیان موجود کشیدگی کا وہ فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ بظاہر انگریزی حکومت کی یہ پالیسی رہی کہ میرپور کے سردار کو نظر انداز کر کے سندھ پر حکومت چلانے والے اس کے دوسرے بھائیوں سے میل جول بڑھایا جائے۔ انجام کار میرپور کے سرداروں نے انگریزوں کی خوشنودی اور دوستانہ تعلقات کی پرواہ تک نہ کی اور وہ سکھوں کے ہاتھ میں آلہ کار بن گئے(18)۔

ویڈ نے یہ ضروری سمجھا کہ لاہور اور میرپور کے درمیان بڑھتے ہوئے میل جول کو روکا جائے۔ برنز نے جولائی 1837ء میں سکریٹری کو لکھا کہ "میرے ایک خط کے جواب میں مہاراجہ نے میرے آنے پر مجھے مبارکباد دیتے ہوئے اپنی سلطنت کی صحیح حدود کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھا اور لکھا کہ واہ گورو (خدا) کی مہربانی سے لداخ سے لے کر امرکوٹ تک میری ساری رعایا خوش و خرم ہے۔ تعجب ہے کہ اس نے روجہان کے قریب واقع اس سرحدی قصبہ امرکوٹ کا نام اپنے خط میں لکھا۔ 1837ء میں بھی شکارپور کے بارے میں رنجیت سنگھ کے ارادوں سے امیران سندھ خائف تھے لاہور میں ویڈ کے ایجنٹ لالہ کشن چند سے رنجیت سنگھ نے اس بات کا ذکر کیا کہ روپڑ کے مقام پر ہونے والی ملاقات کے دوران گورنر جنرل نے اسے بتایا تھا کہ 1809ء کا معاہدہ آخری (فائنل) ہے۔ اور انگریز اس معاہدہ کی موجودگی میں شکارپور کی سکھ سلطنت میں شمولیت کی مخالفت نہیں کر سکتے (عمدہ جلد دوم صفحہ 533) فقیر عزیزالدین نے ساری پرانی خط و کتابت پڑھ کر سنائی۔ اس سے مہاراجہ نے یہ نتیجہ نکالا کہ انگریزی حکومت کا شکارپور سے کوئی واسطہ نہیں(19)، مگر 26 جون 1838ء کے سہ فریقی سمجھوتہ نے اس کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔

لدّاخ :۔ سطحِ مرتفع لدّاخ بالائی (Upper) سندھ کی وادی میں واقع ہے۔ یہاں کی کل آبادی کا 2/3 حصہ پہاڑی بوٹیوں پر مشتمل تھا۔ اور 1/3 حصہ کشمیری مسلمانوں پر۔ راجہ کا خطاب گیالپو (Geeapo) تھا۔ حکومت کی باگ ڈور خالون (Khalona) یعنی وزیر کے ہاتھ میں تھی۔ گیالپو اکثر تبدیل ہوتے رہتے تھے جو بعد میں پجاری یعنی لالہ بن جاتے تھے (20) راجہ لدّاخ کی فوج عموماً گھوڑ سواروں پر مشتمل تھی جو دیسی بندوقیں، تیر کمان استعمال کرتے تھے۔ ان کی تعداد تقریباً آٹھ ہزار تھی۔ اندازاً بارہ سو سپاہیوں کے قریب پیدل فوج تھی جو مندرجہ بالا ہتھیاروں سے ہی کام لیتی تھی۔ راجہ لدّاخ کی سالانہ آمدنی تقریباً پانچ لاکھ روپے تھی لیکن عام طور پر آمدنی جنس میں ہی ادا کی جاتی تھی۔

لدّاخ میں تجارت اور کاروبار کم نہ تھا۔ شال بنانے کی اون وہاں کی خاص تجارت تھی۔ مورکرافٹ نے لکھا ہے کہ اس بات کا اندازہ لگانا آسان نہیں کہ یہاں میں کتنے سرمایہ کا کاروبار ہوتا ہے لیکن مجھے پتہ چلا ہے کہ (22) امرتسر کے ایک ساہوکار کوٹھی مل نے رسول جو، عظیم جو اور اسی شہر کے دیگر کشمیریوں کی معرفت دو یا تین لاکھ روپیہ لدّاخ میں کاروبار پر لگا رکھا تھا۔ چین سے لداخ کا کوئی سیاسی رشتہ نہ تھا۔ مذہب، زبان اور علاقائی نزدیکی کا لاہسہ کے ساتھ بھی اس کا کوئی تعلق نہ تھا (23)۔

اندریں حالات لدّاخ کو فتح کرنا کسی طرح بھی غیر منافع بخش نہ تھا۔ کشمیر کی تسخیر کے بعد رنجیت سنگھ کا اگلا قدم قدرتی طور پر لداخ کو سر کرنا تھا۔ میجر ہیئر سے (Hearsay) لکھتا ہے کہ "لداخ کی طرف ہی سے کوئی دشمن کشمیر پر حملہ کر سکتا تھا۔ سردیوں میں منجمد دریا اور ندیاں عبور کر کے اس راستہ سے کشمیر پر بڑی آسانی سے دھاوا بولا جا سکتا تھا لیکن سکھ سپاہ سردیوں میں وہاں نہیں لڑ سکتی تھی۔ گھوڑے اور گھوڑ سوار دونوں کشمیر میں کڑاکے کی سردی کو برداشت نہیں کر سکتے تھے (24) لداخ کے بارے میں اگر فوجی اہمیت کا یہ نظریہ درست ہے تو کشمیر کو سر کرنے کے بعد رنجیت سنگھ کے لیے یہ ضروری ہو گیا کہ لداخ کو فتح کر کے اسے بفر سٹیٹ (Buffer State) فاصل ریاست بنا دیا جائے۔ لداخ کو سر کرنے کی کوشش کے پیچھے کوئی اور وجوہ بھی ہو سکتی تھیں جو

بہر کیف اس سے کسی طرح کم اہم نہ تھیں۔

اس میں حیرت نہیں کہ 1820ء کی سردیوں میں جب مور کرافٹ لداخ میں انگریزی تجارتی تعلقات قایم کرنے اور گھوڑوں کی خرید کے سلسلے میں آیا تو لداخ سرکار رنجیت سنگھ کے منصوبوں سے بہت خوفزدہ دکھائی دی۔ مور کرافٹ 1820ء کے بقایا حصے اور پورے سال یعنی 1821ء لداخ میں مقیم رہا۔ شروع شروع میں وہ شال بنانے کی اون اور گھوڑے کے کاروبار کی بات چیت کرتا رہا۔ لیکن جلد ہی باہمی اعتماد قایم ہو گیا۔ اور مور کرافٹ کے ذریعہ لداخ سرکار نے انگریزی حکومت کو اپنی وفاداری کا یقین دلایا۔ مور کرافٹ نے اپنے ایک دوست کو لکھا کہ لداخ کے علاقہ کا ایک خاکہ اور اس صوبے کے اندرونی اور بیرونی تعلقات کی تفصیل سیاسی محکمہ کو ارسال کر دی گئی ہے تاکہ اسے تسخیر کرنے کی اہمیت اور اس کی دفاع پر ہونے والے اخراجات کا (25) اندازہ لگایا جا سکے۔ انگریزی حکومت کی طرف سے لداخ میں تجارت کے لیے مور کرافٹ کی سیاحت فقط ایک بہانہ تھی۔ بہت جلد انگریزی سلطنت کو وسعت دینے کا وہی عمل شروع ہونے والا تھا جو بعد ازاں سندھ میں دوہرایا گیا۔ لیکن 1821ء میں انگریزی حکومت رنجیت سنگھ کی بڑھتی ہوئی طاقت اور دولت سے اتنی خوفزدہ نہ تھی لہٰذا اس نے مور کرافٹ کی تجویز کو نامنظور کر دیا اور اس طرح رنجیت سنگھ کے خوف و خطر (26) کو بھی ہر ممکن طریقہ سے دور کرنے کی کوشش کی بعد ازاں جب انگریزی حکومت کو رنجیت سنگھ کی طاقت کا خدشہ لاحق ہوا تو انہوں نے لداخ کے مقابلے میں سندھ کی حدود کو زیادہ اہمیت دی۔ آخر لداخ کو راجہ گلاب سنگھ والئ جموں نے 1834ء میں آسانی سے فتح کر لیا (27)۔

وِیڈ کے بیان کے مطابق گلاب سنگھ نے لداخ کو اس لیے فتح کیا کہ وقت آنے پر اُس کے ذریعہ وہ کشمیر پر قبضہ کر سکے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کو لداخ کی تسخیر کے اس منصوبہ کا کوئی علم نہ تھا اور نہ اس سے اس مہم کی منظوری لی گئی تھی۔ پھر بھی وہ اس کارکردگی کو الٹنے یا اسے زیر و زبر کرنے کے حق میں نہ تھا (28) لیکن ویڈ کا یہ بیان کہ مہاراجہ لداخ کی تسخیر کو ناپسند کرتے تھے۔ اس حقیقت کے پیش نظر کچھ غلط معلوم ہوتا ہے کیونکہ لداخ پر مہاراجہ کے حملہ کا منصوبہ ایک کھلا راز تھا۔ اس

کے علاوہ زورآور سنگھ نے جب لداخ پر چڑھائی کی تھی تو اتفاق سے ڈاکٹر ہنڈرسن اس وقت لداخ میں تھے۔ لداخ کے سردار نے اس کی موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے زورآور سنگھ کو بتایا کہ وہ انگریزی سفیر ہے جو اس کے اور مورکرافٹ کے مابین طے شدہ معاہدہ پر مہر تصدیق ثبت کرنے آیا ہے۔ اسے علم تھا کہ ڈاکٹر ہنڈرسن واقعی ایک محقق ہے پھر بھی تین ماہ تک زورآور سنگھ نے جنگ کو ملتوی رکھا۔ زورآور سنگھ نے گلاب سنگھ کو اطلاع دی اور گلاب سنگھ نے مہاراجہ کی خدمت میں عرضی پیش کی۔ اس پر مہاراجہ نے لدھیانہ میں انگریزی ریزیڈنٹ سے پوچھ تاچھ کی۔ ریزیڈنٹ نے اسے یقین دلایا کہ انگریزی (29) حکومت کا ڈاکٹر ہنڈرسن سے کوئی تعلق نہیں اگر رنجیت سنگھ کو لداخ کی تسخیر منظور نہ تھی تو یہ سب کچھ نہ کیا جاتا اور آسانی سے مہاراجہ زورآور سنگھ کو مہم سر کرنے سے پہلے ہی واپس بلا لیتا۔

لداخ پر تیس ہزار روپے کا خراج مقرر کیا گیا۔ اس بات پر بھی غور کیا جانا چاہیئے کہ فطری طور پر گلاب سنگھ انگریزوں کا مخالف تھا اور غالباً اسی لیے وہ سپتھ کے زیریں علاقوں کو تحویل میں لے کر شمال مشرقی سرحد تک اپنی حدود وسیع کرنا چاہتا تھا۔ تاکہ مستقبل قریب میں نیپال کے ساتھ براہِ راست رابطہ قایم کر کے دوستانہ تعلقات قایم کیے جاسکیں۔ جو ہر دو طاقتوں کے لیے مفید ہو سکتے تھے۔ انگریزوں کے مخالف اس ڈوگرہ سردار کے اس منصوبہ کو غالباً اس ایک آنکھ والے حاکم مہاراجہ نے کچھ ایسی ہی وجوہ کی بنا پر منظور کیا ہوگا کم از کم یہ نظریہ بعید از قیاس نہیں۔

اسکار ڈو :۔ لداخ کے بعد اسکارڈو کی باری تھی جو لداخ کے مغرب میں واقع ہے۔ سیاح مورکرافٹ نے اسے حاکم احمد شاہ کو مبہم خط لکھا جس میں اسے انگریزوں کی امداد کا یقین دلایا گیا تھا۔ یہ مراسلہ رنجیت سنگھ کے ہاتھ پڑ گیا اور اس نے بغیر کسی شکوہ و شکایت یا رائے زنی کے وہی خط انگریزی حکومت کے پاس بھیج دیا۔ بہر حال اس کی ایک نقل احمد شاہ والیٔ اسکارڈو کو مل گئی۔ وہ انگریزی امداد کا انتظار کرتا رہا۔ 1831ء میں اس نے جیک مونٹ کو مورکرافٹ کا جانشین سمجھا۔ جب جیک مونٹ کشمیر میں تھا تو اس چھوٹے تبت (اسکارڈو) کے حاکم کی طرف سے ایک پیامبر نے اپنے ملک کو جیک مونٹ کے اختیار میں دینے کی تجویز پیش کی

تھی لیکن موخر الذکر نے یہ بہانہ بنا کر کہ وہ اس کی زبان سمجھنے سے قاصر ہے، رنجیت سنگھ کے ایک جاسوس کو بُلا بھیجا۔

1831ء میں رنجیت سنگھ اور جیک مونٹ کے درمیان کچھ اس طرح کی بات چیت ہوئی جس سے یہ صاف ظاہر ہوتا تھا کہ سکھ حکمران اپنی سلطنت کو شمال اور جنوب دونوں سمتوں میں توسیع دینے کا خواہاں تھا۔

مہاراجہ : اب میں کون سا علاقہ فتح کر سکتا ہوں ؟

جیک مونٹ : ایشیا کے کسی بھی ملک کو جس پر انگریزوں کا قبضہ نہ ہو۔

مہاراجہ : لیکن سب سے پہلے مجھے کس صوبہ کو سر کرنا ہوگا، تبت ؟ تم وہاں جا چکے ہو۔

جیک مونٹ : اعلیٰ حضرت کو صرف اپنا ایک گورکھا دستہ بھیجنا ہوگا۔ لیکن وہ ملک بُری طرح غریب ہے۔

مہاراجہ : ایسے ملک کو فتح کرنے سے کیا فائدہ ؟ میں ایسے علاقے اپنے تسلّط میں لانا چاہتا ہوں جو زرخیز اور خوش حال ہوں۔ کیا میں سندھ کو سر نہیں کر سکتا ؟ (30)

لیکن اسے ڈر تھا کہ اگر جنوب کی طرف پیش قدمی کی گئی تو انگریز عملاً اس کی مخالفت کریں گے۔ اسی لیے اس نے شمال ہی کی جانب پیش قدمی کی۔

حکمران شہزادہ احمد شاہ نے ایسٹ انڈیا کمپنی سے اتحاد کی کوشش کی۔ پہلے پہل مور کرافٹ پھر وِگنے (Vigne) اور اس کے بعد ڈاکٹر فیلکونر (Falconer) اسکارڈو گئے اور اس طرح وہ منحوس دن ٹلتا ہی رہا۔ احمد شاہ کے ساتھ انگریزی حکومت کا رویہ حوصلہ افزا نہیں تھا۔ سکریٹری نے ویڈ کو لکھا کہ اس سردار کے ساتھ دوستی بنائے رکھنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانا چاہیئے۔ لیکن تمہیں اس بات کو مدِّنظر رکھ کر بات چیت کرنی ہوگی کہ تمہارے کسی لفظ یا فقرہ سے وہ ہم سے یہ امید نہ کرنے لگیں کہ ہم اس کی جانب سے کسی بھی پڑوسی کے خلاف (31) دخل اندازی کریں گے۔ لیکن حکمران اسکارڈو کی طرف سے ویڈ کی وکالت اور ساتھ ہی وِگنے اور فیلکونر یورپین سیاحوں کا سفر اسکارڈو۔ یہ چند ایسی وجوہ ہیں جن کے باعث وقتی طور پر گلاب سنگھ نے

اس ریاست پر حملہ کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ گمانِ غالب یہ ہے کہ گلاب سنگھ نے ویڈ، کنائے، وگنے اور فیلکونر کی سیاحت کو ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں سمجھ لیا۔ مگر اسے معلوم نہ تھا کہ حکومت ہند اور اس کے ایجنٹ کے نظریات میں اختلاف ہے لہذا اس نے اپنے منصوبہ کو کچھ عرصہ کے لیے معرضِ التوا میں ڈال کر حالات کا جائزہ لینا ہی مناسب سمجھا۔

کشتواڑ میں تعینات جموں کے گورنر اور فاتحِ لدّاخ زور آور سنگھ 1836ء میں قصبہ جنڈیالہ کے مقام پر مہاراجہ رنجیت سنگھ کے حضور میں حاضر ہوئے۔ اور اس طرف اشارہ کیا کہ چھوٹا تبت (اسکارڈو) جس کی سرحد سلطنتِ چین سے ملحق ہے، حضور کے مقبوضات سے بہت دور ہیں۔ رنجیت سنگھ نے جواب دیا کہ بادشاہِ چین کی ایک لاکھ بیس ہزار سپاہ اس سے برسرِ پیکار ہونے کے لیے ہر وقت منتظر کھڑی تھی۔ اس پر زور آور سنگھ کا جواب یہ تھا کہ مہاراجہ کے اقبال سے ہم کامیاب و سرخ رو ہوں گے۔ (33)

رنجیت سنگھ کے سامنے محض فتح کی خواہش نہیں تھی اس لیے لدّاخ پر دھاوا کرنے کی اجازت نہیں دی۔ وہ حاکمِ نیپال کا پڑوسی بننے کا تو خواہاں تھا لیکن اس سے آگے پیش قدمی کرنے کا خیال اسے ناپسند تھا۔ ایسا کرنے سے وہ ایشیا کے قوی ہیکل دیو چین سے ٹکرا سکتا تھا لہذا اس نے اپنے نائب، سرداروں اور جرنیلوں کی ہوسِ ملک گیری کو حد سے تجاوز نہ ہونے دیا۔ رنجیت سنگھ کے انتقال کے بعد 1841ء میں جب زور آور سنگھ نے اسکارڈو سر کر لیا اور 1841ء میں گارو کو لے لیا تو رنجیت سنگھ کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی، چینیوں سے ایک جھڑپ میں ہی سکھ ہار گئے۔ اور انجام کار انگریزوں کی مداخلت سے اِس علاقہ میں امن قائم ہوا۔ اور قبل از جنگ کی سرحدوں کی توثیق بحال کر دی گئی۔

رنجیت سنگھ کو خدا نے ایک بہت بلند پایہ اور نادر عطیہ سیاستدانی کا عطا کیا تھا جس کی بدولت اسے اپنی "حدود" کا احساس تھا۔ افغانوں اور پنجاب کے باہر شمال میں واقع پہاڑی ریاستوں کے ساتھ اس کے تعلقات سے صاف ظاہر ہے کہ کس طرح اس نے اپنی ہوسِ ملک گیری کو قابو میں رکھا اور حد سے تجاوز نہ ہونے دیا۔

نیپال:۔ 1771ء میں نیپال کے پہلے گورکھا راجہ پرتھوی نارائن کی موت ہو گئی

اس وقت سے لے کر 1850-1846ء تک جب کہ جنگ بہادر نے راج گدی غصب کر لی نیپال سیاسی سازشوں کا ایک بڑا مرکز بنا رہا۔ 16-1814ء کی انگریز۔ نیپال جنگ کے بعد سے نیپال دربار اپنے دوستوں میں اضافہ کر رہا تھا۔ رنجیت سنگھ کی زندگی کے آخری دور میں انگریزوں کے خلاف نیپال سے ایک معاہدہ کرنے کی خاص کوشش کی گئی۔ گورکھا سپاہیوں کی دلیری، اس کوشش کا باعث بن گئی تھی۔ دوسرے انگریزوں کے طے شدہ معاہدہ سے رنجیت سنگھ قدرے ناخوش تھا۔ علاوہ ازیں لداخ کو فتح کرنے کے بعد سکھ گورکھاؤں کے پڑوسی بن گئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی لاہور دربار میں انگریزوں کے خلاف ایک باقاعدہ گروہ ڈوگرا برادران کی سربراہی میں مصروف کار تھا۔ ان حالات نے نیپال کو رنجیت سنگھ کے ساتھ تعلقات بڑھانے پر آمادہ کیا۔

1834ء میں ایک نیپالی ایجنٹ براستہ امرتسر لدھیانہ پہنچا۔ اس کی سیاحت کے ظاہری مقصد سے اس کی ملاقات کا مقصد مختلف تھا۔ ویڈ کا خیال ہے کہ زندگی کے دور میں رنجیت سنگھ اپنی سیاسی سوجھ بوجھ کے پیش نظر انگریزوں کے خلاف کسی ایسے سیاسی منصوبہ کو جو ہندوستان کے کئی ناسمجھ سردار اس وقت بنا رہے تھے تب تک معاہدہ کی شکل نہ دے گا جب تک وہ بالکل مجبور نہ ہو جائے اور اس کے پاس دوسرا کوئی چارہ کار نہ رہے۔ (33) لیکن ویڈ کو اپنی رائے پر نظر ثانی کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔

مئی 1837ء میں نیپال سے کالو سنگھ اور کرتار سنگھ پر مشتمل ایک وفد امرتسر پہنچا۔ انہوں نے کشمیر جانے کی بات بھی کی۔ انگریزی حکومت نے اپنا ایک آدمی ان کے ہمراہ کر دیا۔ (34) اس سے تقریباً ایک سال پہلے بنارس سے ایکو شاہ پنڈت نامی ایک شخص لاہور آیا تھا۔ وہ نیپال سرکار کی طرف سے حاکم لاہور کے لیے دو ہاتھی بطور تحفہ لایا تھا لیکن تعجب ہے کہ ان تحائف کے ساتھ کوئی خط نہیں تھا جس پر مہاراجہ کو بڑی حیرت ہوئی۔ وہ دو گھوڑے اور کچھ اشیاء جیسے فرنیچر وغیرہ بطور تحفہ لے کر ستمبر میں لوٹ گیا تھا۔ ویڈ (36) کا خیال تھا کہ بیچ کے لوگوں نے اسے وفد کا پیش خیمہ بنا لایا تھا اور اس کا یہ خیال بالکل صحیح تھا۔ باقاعدہ وفد 1837ء میں آیا۔ آنجہانی

امرسنگھ تھا یا کا بیٹا بھوپال سنگھ تھا یا سکھوں کے ماتحت فرانسیسی کمپنی کی ایک بٹالین میں افسر تھا۔ نیپال دربار اور لاہور دربار کے کچھ لوگ باہم سرکاری رابطہ کے خواہاں تھے۔ غالباً بھوپال سنگھ تھا یا ہی فریقین کے درمیان ذریعہ رسل و رسائل تھا۔ سکھ فوج میں اس کی موجودگی سے مہاراجہ کو اپنی فوج میں گورکھا سپاہی بھرتی کرنے میں مدد ملی۔

مئی 1837ء کے نیپالی وفد کے ممبران کا پہلے تو محض رسمی طور پر خاطر تواضع سے استقبال کیا گیا لیکن جلد ہی مہاراجہ کا رویہ بدل گیا۔ وفد کے ممبران نے بھی اس کو خوش کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی تھی۔ انہوں نے بہت مبالغہ آمیز الفاظ میں اسے 'ہندوؤں کا چراغ'، اور 'ایک اوتار'، یعنی پیغمبر وغیرہ کہہ کر اس کی خوشامد کی۔ سکھ سردار نے بھی متکبرانہ انداز میں جواب دیا کہ دونوں سلطنتوں کے مفاد یکساں ہیں۔ اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ خط و کتابت اور ہاتھیوں کے تحائف کا سلسلہ جاری رکھا جانا چاہیے۔ مہاراجہ نے حاکم نیپال کے نام ایک خط میں کپتان کاربار سنگھ کی معرفت بھیجے گئے، تحفہ کے لیے شکریہ ادا کیا اور دوستانہ جذبات کے لیے مسرت کا اظہار کیا۔ یہ خواہش بھی ظاہر کی کہ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ کہا نہیں جا سکتا کہ یہ مراسلہ مہاراجہ کے دلی جذبات کا حامل تھا۔ یا فقط ریاکاری پر مبنی تھا۔ بہرحال کپتان کاربار سنگھ کی سیاحت سے پہلے اور بعد میں نیپالی مراسلوں کا جو خیر مقدم ہوا اس کی نوعیت میں فرق تھا۔ قبل ازیں نیپال دربار کی طرف سے کوئی بھی کھلے عام لاہور دربار میں رسائی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ اگر ایسا ہو بھی جاتا تو اسے عموماً ملاقات کے بغیر ہی دفع کر دیا جاتا۔ (37)

ویڈ کو ڈر تھا کہ اگر لاہور اور نیپال کے درمیان یہ رابطہ بنا رہا تو دوسری حکومتیں بھی اس کی مثال پر عمل کر کے حکمران کی حلیف بننے کی کوشش کریں گے۔ جس سے انگریزوں کے خلاف توازنِ اقتدار قائم (38) کرنے میں رنجیت سنگھ فائدہ اٹھا سکتا ہے لیکن اس سلسلہ میں ایک نیپالی مہاجر معتبر سنگھ کے ساتھ ایک دلچسپ ترین واقعہ جوڑ دیا گیا۔ معتبر سنگھ نیپال کے وزیر اعظم بھیم سین کا جس کا اقتدار 1837ء میں ختم ہو گیا تھا، بھتیجہ تھا۔ اس نے 1837ء میں رنجیت سنگھ کے دربار میں عرضی گذاری

کہ نیپال سرکار نے اسے برخواست کر دیا ہے اور اب وہ لدھیانہ آچکا ہے اور پنجاب آنا چاہتا ہے۔ کپتان ویڈ نے اسے روک لیا ہے۔ عزیزالدین اور گوبندرام کو ہدایت کی گئی کہ وہ کپتان ویڈ سے معتبر سنگھ کے بارے میں استفسار کریں۔ ویڈ نے جواب میں بتایا کہ گورنر جنرل کو معتبر سنگھ کی رازداری پر اعتراض تھا پھر بھی وہ اسے اس شرط پر پنجاب جانے کی اجازت دے سکتا ہے کہ انگریز ایجنٹ کو وہ اپنے ہمراہ لے جائے۔ رنجیت سنگھ نے عزیزالدین کی معرفت ویڈ سے کہلوایا کہ مجھے معتبر سنگھ کے منصوبوں سے کوئی سروکار نہیں، میں تو فقط معتبر سنگھ کے جنگ وجدل کے قاعدے ملاحظہ کرنا چاہتا تھا تاکہ اس طرز پر اپنی مہم کو منظم اور ناقابل تسخیر کر سکوں اس پر اگر گورنر جنرل (39) راضی ہوں گے تو میں معتبر سنگھ کو اپنے ہاں ملازم رکھ لوں گا۔ ان دنوں انگریزی حکومت ہند کے ساتھ نیپالیوں کے تعلقات اچھے نہ تھے اور 1840ء میں جب نیپال سے جنگ کے آثار دکھائی دئے تو انگریزی حکومت نے معتبر سنگھ جو اس وقت لاہور دربار میں اور فوج میں کافی بارسوخ تھا، اپنے زیر اثر لانا چاہا۔ انگریزی حکومت اسے تخت نیپال کا حقدار سمجھ کر یا ایک فریق کا لیڈر مان کر اس کی حمایت کرنا چاہتی تھی لیکن جیسے ہی جنگ کے بادل چھٹ گئے اس سے کنارہ کشی اختیار کر لی گئی۔ اس لیے معتبر سنگھ کے خیر مقدم کے لیے رنجیت سنگھ کی یہ سرگرمی کافی سیاسی اہمیت کی حامل تھی۔

نیپال کا پڑوسی بننے کے مقصد سے بلاشبہ رنجیت سنگھ نے لداخ کو فتح کرنے کی منظوری دی تھی۔ سیاست کے میدان میں وہ کوئی طفل مکتب نہ تھا اور محض خوشامد سے اسے بے وقوف نہیں بنایا جا سکتا تھا۔ اس لیے نیپالی وفد کی جانب اس کے رویہ میں تبدیلی کو اس کے نظریے ہی کی تبدیلی سمجھنا چاہیئے۔ (40)

1814ء میں انگریز گورکھا جنگ کے دوران گورکھا جرنیل امر سنگھ تھاپا نے رنجیت سنگھ کو ایک مراسلہ بھیجا جس میں لکھا تھا کہ انگریز ملتان فتح کرنے کے بارے میں غور کر رہے ہیں اور اس کے دشمن شاہ محمود والئ کابل کے ساتھ سازباز میں مصروف ہیں۔ ان حالات میں گورکھوں کو فوجی امداد دینا رنجیت سنگھ کے لیے مناسب ہے (41) سکھ سردار نے، اس میں شک نہیں کہ اس کی یہ درخواست ٹھکرا دی لیکن

بھائی گور بخش سنگھ، دھنا سنگھ مالوائی اور دوسروں کے ساتھ بھی بات چیت کے دوران اس نے مندرجہ ذیل بہت ہی اہم الفاظ کہے۔

"حالانکہ بظاہر میرے اور انگریزوں کے درمیان بڑے مخلصانہ تعلقات ہیں تاہم یہ تعلقات محض رسمی ہیں۔ میں نے یہ سوچ رکھا ہے کہ میرے ساتھ جب کبھی انگریزوں کا رویہ مختلف ہوا میں گورکھوں کو اپنا دوست بنا کر ان کی امداد طلب کروں گا اور اگر انہوں نے امداد دینے میں تامل کیا تو ان کی دوستی حاصل کرنے کے لیے کانگڑہ کا قلعہ ان کے حوالے کر دوں گا مگر اب پہاڑوں سے ان کو نکال دیا گیا ہے اور یہ نہیں کہا جا سکتا کہ کب وہ ان علاقوں کو حاصل کرنے کی پھر کوشش کریں گے۔ مجھے یہ توقع کبھی نہ تھی کہ پہاڑی علاقوں میں سے انہیں اچانک اس طرح باہر نکال دیا جائے گا۔ (42)

ساگولی کے معاہدہ کے مطابق دریائے کالی کے مغرب میں واقع گڑھوال اور کماؤں کا علاقہ اور ترائی کا بہت سا علاقہ نیپالیوں نے انگریزوں کو دے دیا۔ اس سے نیپال سے براہ راست رابطہ قائم کرنے کی رنجیت سنگھ کی امیدوں پر پانی پھر گیا شاید انہیں وجوہ کی بنا پر رنجیت سنگھ نے 1834ء میں گلاب سنگھ کو لداخ فتح کرنے کی منظوری دے دی تھی۔ 1837ء میں کھلے عام نیپال دربار کی جانب سے ایک وفد لاہور آیا، اس کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ ان دنوں نیپال اور انگریزی حکومت ہند کے تعلقات بہت دوستانہ نہ تھے۔ لداخ پر سکھوں کی فتح سے نیپال کے ساتھ براہ راست رابطہ کا امکان بڑھ گیا تھا۔ مگر اس کے لیے دریائے ستلج کے زیریں علاقہ پر بھی سکھوں کا قابض ہونا ضروری تھا۔ 1814ء میں جو الفاظ رنجیت سنگھ نے کہے تھے اگر ان پر پوری طرح سے غور کریں تو ہم سکھ گورکھا تعلقات کی اس اچانک اہمیت کو صحیح نقطۂ نظر سے دیکھ سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں چیف سکریٹری کے نام ایک مراسلہ میں ویڈ کا مندرجہ ذیل پیراگراف کافی اہمیت رکھتا ہے۔

"لاہور کے حالیہ دورہ میں میں نے یہ اطلاع فراہم کی کہ لداخ کو تسخیر کرنے کے مقاصد میں سے بظاہر ایک مقصد یہ بھی تھا کہ دریائے ستلج کے ساتھ ساتھ آگے تک کے علاقہ کو قبضہ میں لے کر راجہ گلاب سنگھ نیپال کی شمال مغربی سرحد تک

سکھ سلطنت کو وسیع کرے تاکہ نیپال کے ساتھ رابطہ قایم کرکے لاہسہ اور لدّاخ کے درمیان تجارت کو فروغ دیا جائے۔ جو حالیہ شورش کے باعث معطل ہوگئی تھی، لیکن دراصل وہ اس طاقت کے ساتھ براہِ راست تعلق قایم کرکے اور اپنے حلقۂ رسوخ کو بڑھا کر ایک ایسا اتحاد قایم کرنا چاہتا تھا جو مستقبل میں باہمی طور پر دونوں حکومتوں کے لیے اہم ہوسکتا ہو"۔ (43).

جب 1837ء میں نیپال کا سرکاری وفد پنجاب آیا تو ویڈ نے لکھا کہ سکھوں کے ساتھ سلسلہ رسل و رسائل قایم کرنے کے لیے نیپالیوں کے نظریات کچھ بھی رہے ہوں لیکن اس علاقہ کے ساتھ جو ان کی سرحد سے ملحق نہیں۔ رابطہ قایم کرنے کا جو بیڑہ انہوں نے اٹھایا ہے اس سے ظاہر ہے کہ اس کے پیچھے کوئی خاص مقصد ہے۔ صرف باہمی خیرسگالی ان دونوں کا منتہائے مقصود نہیں ہوسکتا۔ یہ سوچنا کہ رنجیت سنگھ ماسوائے جذبۂ خود غرضی کے کسی اور اصول کی بنا پر ہم سے وابستہ ہے، اپنے آپ کو دھوکا دینے کے مترادف ہے۔ میں اور میرے قابل دوست جو مجھ سے پہلے اس عہدہ پر فائز رہے ہیں یعنی سر ڈیوڈ آکٹرلونی اور کپتان مرّے کبھی اس دھوکہ میں مبتلا نہیں ہوئے" (44) رنجیت سنگھ انگریزوں کے رویہ سے مجبور اور بے بس ہونے کی صورت میں غالباً ان کے خلاف جنگ جو گورکھوں کے ساتھ معاہدہ کرنا چاہتا تھا۔ عـــہ

عـــہ رنجیت سنگھ برما کے معاملات میں بھی دلچسپی رکھتا تھا حالانکہ وہ ملک کافی دور تھا۔ وہاں کے واقعات کی اطلاعات فراہم کرنے کی کوشش میں لگا رہتا تھا۔ 1838ء میں برٹش مشن کے ایک ممبر کو رنجیت سنگھ نے بتایا "میں نے سنا ہے کہ برما کے سپاہیوں نے تمہارا سخت مقابلہ کیا اور تمہارے سپاہیوں کو ہرا دیا۔

1834ء میں چٹاگانگ کے ایک مجسٹریٹ نے رپورٹ کی کہ وہاں برما کے لوگوں کا ایک گروہ پہنچا تھا۔ راجہ آوا کا خاص آدمی اس پارٹی کا سردار تھا۔ یہ پارٹی سکھوں کے ملک سے تجارتی رابطہ قایم کرنے کے بہانے آئی تھی۔ کلکٹر نے لکھا "جو معلومات میں نے فراہم کیں ان کے پیشِ نظر میں نے سوچا کہ یہ رنجیت سنگھ ہی ہوگا۔"

1818ء میں برما کے راجہ کے ایک وزیر نے گورنر جنرل کی خدمت میں ایک عریضہ بھیج کر کہ

اشارات

1- ہسٹری آف بہاول پور، مصنفہ شہامت علی
2- ایضاً
3- لاہور دربار، مصنفہ سیٹھی - ویڈ بنام میکسن - 17ر جولائی 1834ء
4- پولیٹیکل پروسیڈنگس - 20ر اکتوبر 1831ء نمبر 70
5- ایضاً 17ر جولائی 1831ء نمبر 41
6- ٹریولز، مصنفہ میزن جلد اوّل، صفحہ 430
7- سندھ پر لیفٹیننٹ پوٹینجر کی یادگاری سرگزشت (Memaries)
8- ٹریولز مصنفہ برنز جلد اوّل صفحات 26-224
9- پولیٹیکل پروسیڈنگس یکم جولائی 1831ء نمبر 43
10- ایضاً نمبر 43
11- ہسٹری آف سکھس، مصنفہ کننگھم صفحہ

لوگوں کو پنجاب بھیجنے کی اجازت طلب کی تھی تاکہ وہ وہاں جاکر اصلی مذہبی کتبے فراہم کریں۔

1823ء میں کچھ سکھ جو رنجیت سنگھ کے ایجنٹ ہونے کا دعویٰ کرتے تھے برما کے دارالخلافہ امرپور آئے۔ انہوں نے بتایا کہ جہاز ڈوب جانے کے باعث ان کے کاغذات اور تحائف ضائع ہوگئے اور وہ انگریزوں کو ملک سے باہر نکالنے کی غرض سے ان پر حملہ کرنے اور دفاعی معاہدہ طے کرنا چاہتے تھے۔ بڑی عزت سے ان کا خیر مقدم کیا گیا لیکن دوران جنگ ان پر شبہ کیا گیا۔ اور ان کو کچھ رقم اور خط وغیرہ دے کر واپس بھیج دیا گیا۔

برما کا راجہ رنجیت سنگھ کے بارے میں اڑائی گئی افواہوں پر یقین رکھتا تھا۔ رنجیت سنگھ کو کبھی کبھی انگریزوں کے خلاف فاتح جنگ بتایا جاتا تھا یا پھر ترکوں اور ایرانیوں کے ساتھ مل کر انگریزوں کے خلاف ایک متحد محاذ کھڑا کرنے والا ہیرو کہا جاتا تھا۔ سرکاری طور پر برٹش ریذیڈنٹ کو ان افواہوں کا سدّباب کرنا پڑتا تھا (کورٹ اینڈ کیمپ مصنفہ آسبورن صفحہ 125، سیاسی کارروائیاں مورخہ 23ر جون 1814ء نمبر 24 - بنگال کی خفیہ اور سیاسی کارروائی جلد 36، اگست 1831ء)

مُکاف کی یادداشت میں سے ..... "یہ ایک ایسی چال ہے جو ہماری سرکار کے لیے زیبا نہیں۔ یہ ایک ایسی چال ہے جس کے لیے اکثر غلط طور پر ہم پر شک کیا جاتا ہے اور ہندوستان کی ملکی طاقتیں ہمیں ملزم ٹھہراتی ہیں۔"

12 - ٹریولز مصنفہ برنز جلد اوّل صفحہ 231
13 - پولیٹیکل پروسیڈنگس 12 اکتوبر 1835ء
14 - ایضاً 3 اکتوبر 1836ء نمبر 31
15 - ایضاً 28 نومبر 1836ء نمبر 16
16 - ہسٹری آف سکھ صفحہ 205 مصنفہ کننگھم۔
17 - ایک ذاتی تذکرہ (A personal narratine) مصنفہ وِگنے۔
18 - پولیٹیکل پروسیڈنگس۔ 21 جولائی 1837ء نمبر 18
19 - عمدۃ التواریخ جلد سوم صفحات 536-533
20 - ہیرسی کا نوٹ جلد 17، 1835ء ایشیاٹک جرنل۔
21 - جرنل آف غلام حیدر خان۔ 25-1819ء ایشیاٹک جرنل صفحہ 17
22 - مورکرافٹ کے خطوط نمبر 1، ایشیاٹک جرنل جلد 21، 1836ء صفحہ 232
23 - ایضاً نمبر 3، 11 جون 1822ء
24 - ہیرسی کا نوٹ جلد 18، 1835ء ایشیاٹک جرنل
25 - مورکرافٹ کے خطوط نمبر 1
26 - پولیٹیکل پروسیڈنگس، 27 اکتوبر 1821ء نمبر 23
27 - ایشیاٹک جرنل 1828ء ماہ فروری صفحہ 157، لیہہ مورخہ یکم اگست 1821ء میں مورکرافٹ کے ایک بدقسمت ساتھی گھتری کا ایک خط جس میں آغا مہدی اور اس کے ایک مسلمان نوکر کی لاہسہ اور لداخ کے علاقوں میں اس کے حق میں کارروائیوں کا حوالہ دیا گیا ہے۔

گھتری کے خیال کے مطابق آغا مہدی ایک بار پہلے بھی لدّاخ آیا تھا۔ روس میں بڑے پیمانے پر شالیں تیار کرنے کے لیے لدّاخ سے شالوں کی اون دینے والی بھیڑوں کو حاصل کرنا اس کا مقصد تھا۔ یہ آغا پہلے یہودی تھا پھر عیسائی ہو گیا۔ یہ

شخص دانشمند اور بڑی سوجھ بوجھ کا مالک تھا۔ یہ اپنے پہلے ہی مشن میں اتنا کامیاب ہوا کہ اسے حاکم لاہسہ کے نام خط اور دیگر ہندوستانی سرحدی ریاستوں کے لیے قیمتی تحائف دے کر دوبارہ بھیجا گیا۔ یارقند پہنچنے پر یہ مسلمان ہو گیا اور اس طرح اس نے مورکرافٹ اور اس کے ساتھیوں کی یارقند کی سیاحت کے ارادوں پر وقتی طور پر بڑی کامیابی کے ساتھ پانی پھیر دیا۔ تب لاہسہ کی طرف اس نے رُخ کیا مگر راستے میں اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کا نائب لداخ پہنچا لیکن وہ آغا مہدی کی طرح ہوشیار نہ تھا۔ عیاشی میں اس نے ساری دولت گنوا دی اور واپس روس جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

گھتری کے بیان کے مطابق آغا مہدی کے پاس لداخ کے راجہ اور مہاراجہ رنجیت سنگھ کے نام شاہی خط تھے۔ اس کا خیال تھا کہ زار الیگزینڈر چین فتح کرنے کا ارادہ رکھتا تھا اور چونکہ لداخ اور کشمیر اس مقصد کے لیے کافی موزوں تھے اس لیے مہاراجہ رنجیت سنگھ اور راجہ لداخ کی دوستی حاصل کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے کہ اگر کوئی ایسا منصوبہ تھا تو وہ کبھی پورا نہیں ہو سکا۔ یہ کہانی دلچسپ تو ضرور ہے تاہم آغا مہدی کے سیاسی مقاصد کے بارے میں جو اندازے لگائے گئے ہیں، ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ کہاں تک درست ہیں۔

28 - 3 جنوری 1838ء نمبر 26

29 - ٹریولز مصنفہ ہیوجل، صفحات 101-102

30 - ماڈرن ریویو 1931ء مترجمہ بی۔ آر۔ چیٹرجی وڈاکٹر جیک مونٹ کی لاہور میں مہاراجہ رنجیت سنگھ سے ملاقات۔

31 - پولیٹیکل پروسیڈنگس، 23 مئی 1836ء

32 - عمدۃ التواریخ جلد سوم صفحہ 206

33 - پولیٹیکل پروسیڈنگس 21 نومبر 1834ء نمبر 154

34 - ایضاً 12 جون 1837ء نمبر 41

35 - ایضاً 12 جون 1837ء نمبر 41

17 جنوری 1838ء نمبر 39 * گوبند جنس کو میں نے بتایا کہ بظاہر نیپالی ایجنٹوں کی سیاحت کا مقصد یہ تھا کہ وہ پنجاب میں جا کر جوالا مکھی کے مندر پر پوتر گھنٹی چڑھائیں

گے حالانکہ دراصل ان کا صحیح مقصد مہاراجہ رنجیت سنگھ سے تحالف کا لین دین معلوم ہوتا ہے اور نیپال حکومت سے تعلقات کے پیشِ نظر اس کے لیے ہماری سرکار کی قبل از وقت منظوری لازمی ہے۔

36 - عمدۃ التواریخ جلد سوم، صفحہ 405

37 - ایضاً

38 - ایضاً 20 اکتوبر 1837ء

39 - عمدۃ التواریخ جلد سوم، حصہ سوم صفحات 87-486

40 - عمدۃ التواریخ - گوبند گڑھ کا قلعہ نیپالی وکیلوں کو دکھایا گیا۔

41 - پنجاب گورنمنٹ ریکارڈ آفس مونوگراف 17، 1814ء (40) صفحہ 182۔

42 - ایضاً 1815ء (4) صفحہ 192

43 - پولیٹیکل پروسیڈنگس 12 جون 1837ء نمبر 41

44 - ایضاً 20 اکتوبر 1837ء نمبر 6

آٹھواں باب

رنجیت سنگھ کی حکومت، ارادے اور حکمت عملی

خالصہ دربار کے مسودات کی جلد دوم عملی طور پر رنجیت سنگھ کے طرز حکومت کے بارے میں ہمیں بہت کچھ بتاتی ہے۔ معاصرین کی تحریروں سے بھی ہمیں کافی معلومات حاصل ہوتی ہیں اور پنجاب کے انگریزی سلطنت میں الحاق کے بعد انگریز افسران کی رپورٹوں سے بھی رنجیت سنگھ کی طرز حکومت کا پتہ چلتا ہے جو اس علاقہ کے بندوبست کے لیے مامور کیے گئے تھے۔ اس کے علاوہ ریکارڈ میں معاصرین کے ایسے مسودے موجود ہیں جن میں پنجاب کے بارے میں وہ اطلاعات ہیں جو لدھیانہ میں پولیٹکل ایجنٹ کو دی جاتی تھیں یا جو معلومات ایجنٹ گورنر جنرل کی خدمت میں ارسال کرتا تھا۔ اگرچہ مسودات میں سول بندوبست کا براہِ راست حوالہ نہیں ملتا پھر بھی بہت سی ایسی اہم معلومات ڈھونڈی جا سکتی ہیں جو رنجیت سنگھ کے بندوبست اور طرز حکومت پر کافی روشنی ڈالتی ہیں۔

1799ء سے 1839ء تک کے درمیانی عرصہ میں پنجاب کے آئین کی تصویر کارلائل (Carlyle) نے مندرجہ ذیل الفاظ میں کھینچی ہے:

"آپ کسی ملک کے قابل ترین آدمی کو اس ملک کے بلند ترین مقام پر بٹھا دیں یعنی اس ملک کی باگ ڈور اسے سونپ دیں اور پوری وفاداری سے اس کا احترام کریں تو یقیناً اس ملک کی سرکار اور حکومت ہر طرح سے مکمل ہو گی۔ پارلیمانی طور و طریقے، بیلٹ بکس، رائے دہندگی اور آئین سازی وغیرہ اس میں رتی برابر اصلاح نہیں کر سکتے"۔ لیکن نظری طور پر اور کسی حد تک عملی طور پر بھی رنجیت سنگھ مالی اور سیاسی

طاقت کا مجسمۂ عظیم تھا۔ کامن ویلتھ کے زندہ اصول میں یعنی پنتھ میں ایک بڑی کمی یہ تھی کہ اکالی جتھہ بندی اور فوجی افسران رنجیت سنگھ کی راہ میں روڑے اٹکا رہے تھے۔ اگرچہ رنجیت سنگھ نے بھی ان پر کسی حد تک پابندی لگا رکھی تھی پھر وہاں ہتھیار بند عوام بھی تھے۔ مذہبی دولتِ مشترکہ یعنی خالصہ ایک طاقت ور جماعت تھی۔ ہر سکھ اپنے آپ کو اس کا ممبر تصور کرتا تھا۔ رنجیت سنگھ پنتھ کی بڑی عزت کرتا تھا۔ گورو گوبند سنگھ نے خالصہ کو "گورو ڈم" کا درجہ دیا تھا۔ سکھوں کی مذہبی زندگی، واہگورو کے لیے پیار، گورو کے لیے احترام، دولت مشترکہ یعنی خالصہ پنتھ پر اعتماد، ان تینوں اصولوں پر مبنی تھی۔ ایک نقارہ (ڈھول) کو رنجیت سنگھ کے نام سے موسوم کیا گیا۔ جیسے حکمران بھی بلا حیل و حجت تسلیم کرتے تھے کہ خالصہ پنتھ کی سیاسی طاقت کے حصول کے لیے وہ پنتھ کے ڈھول سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ اگرچہ وہ ایک مطلق العنان حاکم تھا تاہم خالصہ کے نام پر حکومت چلاتا تھا۔ اس نے اپنے لیے بادشاہ کا لقب اختیار نہیں کیا بلکہ احکام جاری کرنے کے لیے صرف 'سرکار' کا رتبہ ہی اپنایا۔ اپنی حکومت کے لیے وہ 'خالصہ جی' یا 'خالصہ سرکار' کے الفاظ استعمال کرتا تھا۔ اپنی مہروں پر بھی اس نے 'خدا رنجیت کا مددگار' کندہ کرایا تھا۔ جولیس اور آگسٹس سیزر نے رومن جمہوریت کے نام پر قیصریت کی بنیاد رکھی۔ اس کے برعکس خالصہ پنتھ پر رنجیت سنگھ کا ایمان رسمی نہیں تھا۔ سیزر کی حکومت میں سینٹ یعنی کونسل کی اہمیت مفقود ہو چکی تھی، جب کہ رنجیت سنگھ کے زمانے میں حکومت میں سکھ مذہب پوری طرح زندہ تھا اور خالصہ پنتھ ایک حقیقت تھی۔

اکالی گورو گوبند سنگھ کی اسی انتہا پسند تعلیم کی پیداوار تھے جس میں انہوں نے 'سمرت ناش'، 'کل ناش'، 'دھرم ناش اور کرم ناش' پر زور دیا تھا (1)، وہ کسی ارضی قوت کو برتر نہیں مانتے تھے۔ اکالی سکھ مذہب میں ایک خاص مذہبی جزو کی نمائندگی کرتے تھے۔ دیگر فوجی کارروائیوں کے علاوہ وہ امرتسر کے ہتھیار بند محافظ سمجھے جاتے تھے۔ مذہبی رسوم کی ادائیگی میں وہ پیش پیش تھے۔ وہ عوام کے ذاتی چال چلن کے بھی نگراں تھے۔ غیر ملکیوں سے ان کی نفرت کی کوئی حد نہ تھی۔ رنجیت سنگھ کے لیے اکالی ہمیشہ دردِ سر بنے رہتے تھے۔ انہوں نے اسے صوبوں (2) کے درمیان الجھنوں میں

پھنسائے رکھا۔ اس سلسلے میں مشکاف کے گارڈ (محافظوں)، پر ان کا حملہ قابل ذکر ہے
برنز کہتا ہے کہ ستلج پار کر کے انگریزی علاقہ میں داخل ہونے سے روکتے تھے۔ اکالی قانون
اپنے ہاتھ میں لے کر ملزموں کو کڑی سزائیں دیتے تھے۔ برنز ایک گاؤں کا ذکر کرتا ہے
جسے ان کٹر پنتھیوں نے نذر آتش کر دیا (3)، کئی موقعوں پر انہوں نے رنجیت سنگھ کی
جان لینے کی کوشش کی پھر بھی رنجیت سنگھ انہیں نیست و نابود کرنے کا حوصلہ نہ کر سکا
حالانکہ ایسا کرنے کے لیے اس کے پاس وسیع ذرائع تھے۔ رنجیت سنگھ صرف ان کے کٹر پن
میں کسی حد تک اعتدال پیدا کر سکا۔ اپنے خاص ہتھیاروں سے لیس اور خاص لباس میں
ملبوس ان اکالیوں کو بے قاعدہ فوج کے دستے بھیجنے پڑتے تھے۔ خطرناک مہموں کو سر
کرنے کے لیے بھی اکالی دستوں کو تعینات کیا جاتا تھا۔ سکھ اکالیوں کا احترام کرتے تھے
کچھ اس بنا پر اور کچھ اپنے ذاتی یقین اور عوام کے مذہبی توہمات کے پیش نظر اکالیوں پر
رنجیت سنگھ ہاتھ نہ ڈال سکا۔ اور نہ ان کو مٹانے کا حوصلہ کر سکا۔ جیسا کہ کہا گیا ہے اس
نے ان شوریدہ سروں کو کافی معتدل تو بنا دیا لیکن ان کا قلع قمع نہ کر سکا۔

پنجاب کا تنہا اور اعلیٰ حکمران بنتے ہی رنجیت سنگھ نے علاقہ کے بڑے بڑے سرداروں
کو پورے طور پر اپنے قابو میں رکھنے کا مقصد بنایا۔ اس نے طاقت ور سرداروں کو
جرمانے، قرقی اور ضبطی بحق سرکار کر کے انہیں کمزور بنا دیا۔ وہ خاندانی جائیداد کے
اصول وراثت کو تسلیم کرتا تھا۔ اس کا کوئی عہدیدار مر جاتا تو رنجیت سنگھ اس کے خاندان
کے گذارہ کے لایق جائیداد اور مال کو چھوڑ کر باقی ضبط کر لیا کرتا تھا۔ سیاسی نقطۂ نگاہ
سے ہمیں اس معمول میں کوئی خامی دکھائی نہیں دیتی کیوں کہ ہمیشہ ہی سے جاگیرداری
حکومتوں کی راہ کا کانٹا بنی رہی ہے۔ اس کی عظیم فوج سرداروں کو خائف رکھتی تھی۔
دسہرہ کے موقع پر جاگیرداروں کے فوجی دستوں کا جائزہ اور خراج کی وصولی کے کڑے
قوانین کی بدولت جاگیرداروں کے ملازم فوجیوں پر بھی اس کا قابو رہا۔ دسہرہ کے موقع
پر فوجوں کا سالانہ جائزہ ایک طرح سے سالانہ حلف وفاداری تھا۔ قدیم سکھ سرداروں
کے دل میں شہنشاہیت کے خلاف کنبض بھرا ہوا تھا اس لیے رنجیت سنگھ نے نئے
جاگیردار بنائے لیکن اپنی عمر کے آخری حصہ میں وہ جاگیرداروں پر مضبوطی سے اپنا اثر قایم
نہ رکھ سکا۔ اسی باعث جموں برادران نے پہاڑی علاقوں میں اپنا اقتدار مستحکم کر لیا۔

گلاب سنگھ، دھیان سنگھ اور سچیت سنگھ اس قدر ذی اقتدار بن گئے کہ پنجاب میں وسیع جاگیروں کے علاوہ جنوب مشرق میں اٹک سے نور پور تک اور شمال میں لداخ اور جموں وکشمیر کا سارا علاقہ ان کی تحویل میں تھا۔ (4)

علاوہ ازیں پنجاب کا ہر سکھ جنگ جو تھا۔ رنجیت سنگھ نے ان کی ہتھیار بندی پر کوئی پابندی عاید نہیں کی۔ بلاشبہ یہ اس کی طاقت سے باہر تھا مگر اس سے فوجی شہنشاہیت کے ہر دلعزیز کریکٹر کا پتہ چلتا ہے جیسا کہ ایکٹن ([illegible]) کہتا ہے "ذاتی تحفظ کے جذبہ کا اس حد تک ارتقا کہ وہ اخلاقی فرض بن جائے جب الوطنی کہلاتا ہے"۔ سکھ پوری طرح ہتھیار بند تھے، وہ باقاعدہ فوج کا اہم حصہ تھے اس لیے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ ملکی سیاست کو قطعی طور پر بھول کر اپنی ذاتی زندگی میں کھو جاتے۔ فوجی ولولوں کو مذہبی رنگ دینے کی صورت میں جیسا کہ پنجاب میں ہوا۔ حکومت رائے عامہ کو نظر انداز نہیں کر سکتی البتہ جب فوجی طاقت کسی ایک با اقتدار خاندان یا کسی جاگیر دار کے ہاتھ میں ہو تو اس صورت میں حکومت عوام کو نظر انداز کر سکتی ہے جیسا کہ سپارٹنوں نے کسان علاقوں کو نظر انداز کر دیا تھا یا جیسا کہ یورپ کے عہد وسطیٰ میں جاگیر دار عوام کی کوئی پرواہ نہ کرتے تھے۔

مرکزی حکومت:۔ سارے طرز حکومت کا مرکز اور سارے سرکاری ڈھانچہ کا محور بلاشبہ مہاراجہ ہی کی ذات تھی۔ سارے معاملات قطعی طور پر اس کے زیر ہدایت سرانجام پاتے تھے۔ شروع شروع میں لاہور میں حساب کتاب رکھنے کا کوئی باقاعدہ طریقہ نہ تھا۔ امرتسر کا ایک ساہوکار رامانند جو امرتسر کا محصول چنگی وصول کرتا تھا اور پنڈ دادخان کی نمک کی کانوں کا پٹہ بھی اس کے پاس تھا۔ سرکاری آمدنی کا بندوبست کرتا تھا۔ بھوانی داس جو شاہ شجاع کے تحت ایک اعلیٰ ریونیو افسر تھا۔ 1806ء میں وہ رنجیت سنگھ کی ملازمت میں آ گیا (5) اس نے بندوبست مال میں کئی فوری تبدیلیاں کیں۔ فوجوں کے لیے ایک الگ تنخواہ کا دفتر قایم کیا اور آمدنی وخرچ کے حساب کے لیے ایک الگ دفتر مال (Financial Office) کی تشکیل کی۔ اسے ہر دو دفاتر کا افسر اعلیٰ بنا دیا گیا۔ آہستہ آہستہ بھوانی داس نے سرکار کے سول اور فوجی کاروبار کے لیے بارہ صیغے بنائے۔ گنگا رام نے بھوانی داس کے اس کام میں

بڑی امداد کی۔ یہ شخص قبل ازیں مہاراجہ گوالیار کے تحت کام کرچکا تھا۔ رنجیت سنگھ نے اسے فوجی دفتر کا حاکمِ اعلیٰ بنایا اور شاہی مہر بھی اس کے قبضہ میں دے دی۔ قدیم سرکاری ریکارڈ یا مسوّدوں کے اوپر جو تاریخ دی جاتی تھی وہ ترکی سن اور مہینوں میں ہوتی تھی لیکن 1815ء کے بعد ترکی کے بجائے ہندوستانی ماہ وسال کا اندراج ہونے لگا۔ دیوان گنگا رام نے (6)، ریکارڈ کو ٹھیک رکھنے کے لیے کئی سیدھے سادے طریقے جاری کئے۔ جب گنگا رام فوت ہوگیا تو دینا ناتھ کو شاہی مہر کا چارج دیا گیا۔ 1834ء میں بھوانی داس کے انتقال کے بعد اسے سول اور دفترِ مال کا حاکمِ اعلیٰ مقرر کیا گیا۔ بھائی رام سنگھ، گوبند رام اور فقیر عزیزالدّین نے بھی سول معاملات میں رنجیت سنگھ کی امداد کی۔ فقیر معاملاتِ خارجہ کے سکریٹری کی حیثیت سے بھی کام کرتا تھا۔ کاروباری خط وکتابت عموماً فقیر عزیزالدّین کیا کرتا تھا حالانکہ رنجیت سنگھ ان پڑھ تھا تاہم سکریٹری کے خطوط کا لب ولہجہ اور زبان میں ردّوبدل کرتا تھا اور ان کو ٹھیک کرایا کرتا تھا۔ بیلی رام خزانہ اور شاہی اخراجات کا انچارج تھا۔ خوش حال سنگھ ڈیوڑھی کا انچارج تھا بعد میں اس کی جگہ دھیان سنگھ نے لے لی تھی۔ (7)

مالی نقطۂ نگاہ سے پنجاب کو ضلعوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ایک تو وہ اضلاع جو پٹے پر یا بطورِ عطیہ دئے گئے تھے۔ دوسرے وہ اضلاع جن کا بندوبست براہِ راست سرکار کے ہاتھوں میں تھا۔ یہ بیان دینا ناتھ سے منسوب ہے کہ شروع میں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے ہر گاؤں کا مطالبہ منظور کیا تھا لیکن جب مہاراجہ عمر رسیدہ ہوگیا تو طریقِ کار میں بھی ردّوبدل کیا گیا اور بہت برسوں تک اس کی سلطنت حسبِ ذیل اضلاع میں منقسم رہی۔ 1۔ کشمیر، 2۔ پشاور، 3۔ وزیرآباد، 4۔ ملتان، 5۔ پنڈ دادخان، انمک کی کانوں سمیت، 6۔ ماجھ کے کچھ علاقوں سمیت کانگڑہ اور 7۔ دوآب جالندھر۔ ان اضلاع کے گورنر خودمختار تھے۔ ملکی معاملات کو سرانجام دینے کے لیے تین طرح کے عہدیدار تھے۔ (8)

1۔ وہ دولت مند اور بارسوخ اشخاص جن کو دور دراز کے صوبے بعوض پٹہ دئے گئے تھے جیسے ہری سنگھ، ساون مل، دلشیا سنگھ، لہنا سنگھ اور تا بائل وغیرہ۔ یہ عہدیداران اپنے مقبوضات سے متعلقہ سارا کاروبار خود ہی کرتے تھے اور شاذ ونادر ہی دربار

میں کسی معاملہ کی رپورٹ بھیجتے تھے۔ جب دربار سے کوئی امر دریافت طلب ہوا تو مہاراجہ کا حکم بذریعہ پروانہ جاری کیا جاتا تھا۔

2۔ وہ فوجی سردار جن کو جاگیریں اس شرط پر دی جاتی تھیں کہ بوقت ضرورت اپنے فوجی دستے مہاراجہ کے حوالے کر دیں وہ اپنے علاقوں میں لامحدود اختیارات رکھتے تھے۔

3۔ وہ کارکنندگان یا سرکاری نمائندے جن کے اختیارات اتنے ہی وسیع ہوتے تھے جتنا دربار میں ان کا رسوخ ہوتا تھا۔ ان مقامی ٹیکس جمع کرنے والوں اور دیگر دوسرے درجہ کے عہدیداروں کی تنخواہیں الگ الگ ہوتی تھیں۔ اوران کی ادائیگی اکثر غیر یقینی ہوتی تھی۔ عملاً یہ سمجھ لیا جاتا تھا کہ ان کے اپنے عہدہ کی مراعات ہی پران کو اپنی گذر بسر کرنی ہے۔ (9)

مقامی حکومت :۔ جہاں تک لاہور کا تعلق تھا۔ ملاّ داری سسٹم کو دوبارہ رائج کیا گیا۔ ہر ملاّ یا کوارٹر (مکان) اسی ملاّ کے ایک بارسوخ ممبر کی تحویل میں ہوتا تھا کوتوال یا اعلیٰ پولیس افسر کا عہدہ کسی مسلمان ہی کو دیا جاتا تھا۔ گاؤں کے مختلف فرقوں کے موروثی حقوق میں کسی قسم کا دخل نہ دیا گیا۔

مالی بندوبست :۔ حساب کتاب کی جانچ پڑتال کے کام میں کئی سال تک خامیاں رہیں۔ مہاراجہ کے آخری دورِ حکومت میں یہ خامیاں دور کی جا سکیں، مہاراجہ بذاتِ خود اخراجات کے پیچیدہ حساب وکتاب کو زبانی یاد رکھتا تھا۔ وقتاً فوقتاً کئی سالوں تک وہ ان عہدیداران کے اخراجات کے مسودے جلا دیا کرتا تھا جو براہ راست اس کو جواب دہ تھے۔ (10) ان حالات میں غبن کرنا بہت آسان تھا۔ رنجیت سنگھ اس سے بخوبی واقف تھا۔ اس لیے وہ گاہ بگاہ اپنے ملازمین سے فیس یا امداد طلب کرتا تھا اور اگر وہ انکار کرتے تو ان کا مال واسباب چھین لیا جاتا۔ اس کا یہ اقدام بہت سے معاملات میں جائز تھا۔ عہدیداران کی موت کے بعد ان کی جائیدادیں ضبط کر کے وہ اپنا حساب پورا کر لیا کرتا تھا۔ سردار ہری سنگھ نلوہ سرحدی صوبہ کی آمدنی اپنی جیب میں ڈال لیا کرتا تھا اور مہاراجہ کو یہ رپورٹ بھیجتا۔ یہ آمدنی کا روپیہ یوسف زئیوں کی یورش کو سر کرنے میں صرف ہو گیا۔ انجام کار اس کے انتقال کے بعد رنجیت سنگھ نے

اسی لاکھ روپے اس کی جمع کردہ رقم (۱۱۱) ضبط کرلی۔ اسی طرح ساون مل نے تقریباً بیس سال کے عرصہ میں نوّے لاکھ روپے جمع کرلیے حالانکہ اس نے کوئی ایسا تجارتی کاروبار نہیں کیا جس سے وہ اس قدر تھوڑے عرصہ میں اتنی کثیر رقم حاصل کرسکتا۔

اراضی کا لگان :۔ سکھ بندوبست اراضی کے مطابق کل پیداوار کا کم از کم نصف سرکاری حصہ تصور ہوتا تھا۔ کئی ایسی مثالیں ہیں جن میں چوّن فیصدی تک لگان طلب کیا گیا۔ جب کبھی لگان جنس میں جمع کی جاتی تو ہر جہ خرچہ اور نقصان کو پورا کرنے کے لیے دس سے پندرہ فی صد کٹوتی کی جاتی تھی۔ بہرکیف عموماً سرکاری مطالبہ کل پیداوار کا 2/5 سے 1/3 تک ہوتا تھا۔ مالیہ کے تعین کے کئی مختلف طریقے تھے۔ کنکوت بٹائی یعنی کھڑی فصل یا پیداوار کا اندازہ اور تقسیم کبھی کبھی لگان فی کنواں بھی مقرر کیا جاتا تھا۔

1847ء میں مسٹر ایلیٹ (Elliot) نے پنجاب کے ذرائع آمدنی اور لگان پر ایک نوٹ لکھا۔ اگرچہ یہ اعداد و شمار رنجیت سنگھ کے دورِ حکومت کے بعد سے تعلق رکھتے تھے۔ پھر بھی ان سے رنجیت سنگھ کے دوران حکومت میں مال گذاری کی وصولی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

دوآب باری	1781800 روپے
رچنا	4012300 "
چج	1239400 "
سندھ ساگر	1985700 "
ہزارہ	300000 "
پشاور	1532500 "
بنوں ٹانک	65000 "
ڈیرہ اسمٰعیل خان	6.4700 "
ملتان	1971500 "
میزان	1,34,92,900 "

ٹیمپل (Temple) کے بیان کے مطابق جالندھر دوآب سے جو قبل ازیں رنجیت سنگھ کی سلطنت کا حصہ تھا 1320034 روپے کی مال گزاری وصول ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ کشمیر کا بھی نو لاکھ روپیہ کا لگان ہے۔ اس طرح رنجیت سنگھ کے دوران حکومت مال گزاری کی کل میزان 1571394 روپے بنتے ہیں۔ ستلج علاقہ سے سترہ لاکھ روپے [13] اور پہاڑی علاقوں کی آمدنی جمع کی جاتی تو کل مالیہ اراضی تخمیناً 17500000 بنے گا [14] مسٹر ایلیٹ کا یہ اندازہ راجہ دینا ناتھ کے تخمینہ سے جو اس نے ستمبر 1847ء میں بورڈ آف ایڈمنسٹریشن (بندوبستی بورڈ) کے روبرو پیش کیا تھا بہت حد تک میل کھاتا ہے۔

تعداد اضلاع	مال گزاری جمع کرنے کا طریقہ	آمدنی
8	بذریعہ کارکنندگان	25,49,873
8	گاؤں مکھیاؤں کی معرفت	18,33,556
43	بٹائی اور کنکوت کے ذریعہ	89,44,658
	کل میزان	1,33,18,097

ایکسائز اور کسٹم (سرکاری محصول اور محصول درآمد) سارے ملک میں چنگیوں اور ناکوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ ان چوکیوں پر ایکسائز ڈیوٹی، شہری ٹیکس، کسٹم اور سامان درآمد برآمد پر محصول چنگی وصول کیا جاتا تھا۔ اس بات کا کوئی لحاظ نہ تھا کہ سامان متعلقہ ملکی یا غیر ملکی ہے اشیاء ضروریہ اور عیاشی کے سامان پر بھی محصول لگانے کے لیے کوئی تفریق نہ تھی۔ [16] سارے ملک کے طول و عرض میں ایسی چوکیاں بنی ہوئی تھیں۔ یہاں تک کہ اکثر زرعی اجناس پر جس کا مالیہ سرکار کو دیا جاتا تھا محصول لگتا تھا۔ رنجیت سنگھ نے ہر مقام، ہر سڑک، ہر شہر، ہر گاؤں اور ہر چیز پر چاہے وہ کہیں بھی فروخت ہو، کہیں سے بھی درآمد یا برآمد ہو ملکی ہو یا غیر ملکی، ٹیکس لگا دیا تھا۔ کم از کم اس کا ایک بڑا فائدہ یہ تھا کہ کوئی غیر یکسانیت نہ تھی اور محصول کی درز زیادہ نہ تھی پھر بھی اس کی وصولی میں تاخیر اور پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ سوداگر اکثر کسی تیسرے فریق سے سامان کو منزل تک پہنچانے کا ٹھیکہ کر لیا کرتے تھے۔ سردار اور جاگیردار ضرورت سے زیادہ اور حسب مرضی

محصول چنگی عائد نہیں کر سکتے تھے کیونکہ اس حالت میں سامان ان کے علاقہ کے بجائے کسی دوسرے ایسے علاقوں سے بھیج دیا جاتا تھا جہاں محصول کم ہوتے تھے۔ مذکورہ بالا رکاوٹوں کے باوجود تجارت کو فروغ حاصل ہو رہا تھا۔

نمک کی کانیں کل آٹھ تھیں جن میں سے صرف چار کام میں آتی تھیں۔ ان کے نام یہ تھے۔ کھوجوٹانہ، کورا با، کھیڑہ، اور نکراج۔ نمک کی کانوں کا ٹھیکہ گلاب سنگھ کے پاس تھا۔ 1837ء میں آغا عباس شیراز نے لکھا کہ "قبل ازیں نمک سے چار لاکھ ٹیکس ملتا تھا لیکن کیپٹن وینڈ کی سیاحت کے بعد یہ آمدنی 9/8 لاکھ روپے ہو گئی۔ بعد ازاں بارہ لاکھ، اور جب میں (آغا شیراز) وہاں گیا تو یہ چودہ لاکھ روپے تک پہنچ چکی تھی (17)۔ محکمۂ خارجہ کے متفرق سیکشن کے ریکارڈ نمبر 357 کے مطابق رنجیت سنگھ کے دور حکومت میں ایکسائز اور کسٹم (محصولات) کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔

	تعداد اشیاء	آمدنی
درآمد	7	3,62,697
برآمد	19	9,74,861
درآمد و برآمد	14	1,37,739
متفرق	19	1,61,817
میزان		16,36,114 (18)

اس میں اندازاً آٹھ لاکھ روپے نمک ٹیکس جوڑ دیں تو کل آمدنی محصولات چوبیس لاکھ روپے بن جائے گی۔ کشمیر سے بھی اٹھارہ لاکھ روپے ایکسائز و کسٹم وصول ہوتا تھا رنجیت سنگھ بلاشبہ اندرونی چونگیوں کے مفاد سے بے خبر تھا۔ لیکن جب ہم اس ماحول کو پیش نظر رکھیں جس میں اس کی پرورش ہوئی تھی اور اس کی تعلیم و تربیت ہوئی، نیز سیاسی اقتصادیات کے اصولوں سے اس کی ناواقفیت سامنے رکھیں تو اس کے لیے رنجیت سنگھ کو قصور وار نہیں گردانا جا سکتا۔ مندرجہ ذیل اقتباسات سے ظاہر ہے کہ اس کی حکومت عوام کی اقتصادی بہبودی کے لیے کوشاں تھی۔

قحط کے باعث گذشتہ سال زمینداروں میں دوسروں کی بوائی اور خوراک کے لیے اناج بانٹا گیا (19)، کھڑک سنگھ کو ملتان کی طرف کوچ کرنے کا حکم دیا گیا اور ہدایت

کی گئی کہ راستہ میں کھیتی باڑی کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچے" (20)

"روہتاس میں مہاراجہ کے کیمپ کے باعث فصلوں کے نقصان کو پورا کرنے کے لیے پانچ ہزار روپے مالیہ معاف کر دیا گیا:

"فوجوں کو راستہ دینے پر گجرات کے زمینداروں کو پندرہ ہزار روپے مالیہ کی چھوٹ دی گئی۔ گھوڑ سوار سب گھوڑوں پر سے اتر کر چلتے تھے۔ اعلیٰ حضرت نے بتایا کہ انہوں نے گھوڑ سواروں کو یہ حکم دیا تھا تاکہ ان کی وجہ سے کھڑی فصلوں کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ اس پر میں نے ان سے پوچھا کہ کیا فوج کے کوچ کے راستہ میں آنے والے کھیتوں کے نقصان کو روکنے کے لیے کوئی قانون بنا رکھا تھا۔ اس پر مہاراجہ نے بتایا کہ اس کے لیے زبردست حکم امتناعی جاری کر رکھا تھا اور اس قانون کی خلاف ورزی کی صورت میں بہت جلد کڑی کارروائی کی جاتی ہے۔ لوٹ مار سے فصلوں کے تحفظ میں اس کی ہوشیاری قابل تعریف ہے۔ اپنی فوج پر بہت کم حکمران اتنی کڑی نگاہ رکھتے ہیں جتنا کہ رنجیت سنگھ (21)

دیوان امرناتھ کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب خوش حال سنگھ 1833ء میں کشمیر سے کچھ رقم لایا تو رنجیت سنگھ کو حیرانی ہوئی اور اس نے بتایا کہ اس عظیم قحط کے پیش نظر اگر وہ نذرانہ کی رقم نہ لاتا تو اسے فرض کی کوتاہی نہ سمجھا جاتا۔ اس نے تب گیہوں سے لدے ہزاروں گدھے کشمیر بھیجے۔ مندروں اور مسجدوں میں اناج کی تقسیم کا بندوبست کیا۔ (22) وہ اس سے باخبر تھا کہ خوش حال سنگھ کی بے راہ روی اس کی حکومت پر ہمیشہ ایک داغ بنی رہے گی۔ اس لیے رنجیت سنگھ نے حالات کو سدھارنے کی ہر طرح کوشش کی۔ اس نے سپاہیوں کے چار دستوں کو ہدایت کی کہ وہ سب کشمیریوں کو شہر سے باہر ایک میدان میں جمع کریں اور ہر ایک کو دو سیر آٹا تا حکم ثانی دیا جائے۔ اور ملحقہ دیہاتی علاقوں سے جب لوگ جمع ہو جائیں تو ان میں کمبل اور روپے تقسیم کئے جائیں اور انہیں ان کے گھروں تک بحفاظت پہنچایا جائے۔ (23)

مسٹر وینٹورا کو حکم دیا گیا کہ وہ جلد از جلد لیشاور پہنچے اور ایم۔ اوتابائل کو ہدایت کرے کہ مقامی کھتریوں سے جو اس نے دو سو روپے جرمانہ وصول کئے ہیں، واپس کر دے اور ان لوگوں کے گھروں کو، جو اس نے خاکستر کر دئے ہیں اپنی جیب سے پندرہ ہزار روپے

لگا کر دوبارہ تعمیر کرائے "(24)

ملتان کی تسخیر کے بعد رنجیت سنگھ نے اس شہر کی ریشم کی صنعت کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ اس نے ملتان کے ریشمی تحفے درباریوں کو دئے۔ اس طرح اس کے استعمال کا رواج ہوا۔(25) سرداروں میں فیشن ہوگیا تھا کہ ملتان ریشم کے پٹکے اور رومال کام میں لائیں۔ رنجیت سنگھ نے تیس پینتیس کشتیاں ملتانی ریشم اور پنجاب کی دوسری پیداوار سے بھر کر بمبئی کے راستے برآمد کرنے کی تجویز رکھی تاکہ وہ غیر ملکی منڈیوں میں قسمت آزمائی کریں۔ رنجیت سنگھ رعایا کو خوش حال بنانے کا خواہاں تھا۔ اس مقصد کے لیے سندھ میں جہاز رانی کا معاہدہ کیا۔(26) اور اپنی رعایا کو ترغیب دی کہ تجارت کو زیادہ سے زیادہ فروغ دے۔ ویڈ اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ وہ سوداگروں کے مفاد کو ہر ممکن طور پر محفوظ رکھتے ہوئے صنعتی اور تجارتی ترقی کے لیے کوشاں تھا(27) آخر کار رنجیت سنگھ کے اس مالی بندوبست کے پیش نظر مال گذاری اور ٹیکسوں کی بھرمار نے عوام کی حالت پر برا اثر ڈالا ہوگا لیکن کئی پہلو سے سرکار ایک ہاتھ سے جو کچھ لیتی تھی وہ دوسرے ہاتھ سے عوام کو لٹا دیتی تھی۔ لوگوں کے روزگار کی بہت سی صورتیں تھیں۔ گاؤں کے ہر جاٹ فوج میں رنگروٹ بھرتی ہوتے تھے۔ جو اپنی بچت اپنے گھروں کو بھیجتے تھے۔ گاؤں کی زندگی پرکشش تھی اور بہت سے وہ لوگ جو کاروبار کے سلسلے میں لاہور یا امرتسر چلے آتے تھے ان کے کنبہ کے دیگر افراد گاؤں ہی میں اقامت رکھتے تھے۔ بہت سے گاؤں اپنا آدھا لگان فوجیوں کی بچت ہی سے ادا کرتے تھے۔ فوجیوں کی تعداد میں اضافہ ہونے کی وجہ سے صنعتی اشیاء کی ضرورت بڑھ گئی لہذا بھاری ٹیکسوں کے باوجود بھی تجارتی کاروبار عروج پر رہا۔ امرتسر کے تجارتی شہر کا کاروبار اس بات کا زندہ ثبوت ہے۔

عدالتی نظم و نسق :۔ دیوانی یا فوج داری مقدمات کی سنوائی کے لیے کوئی خاص افسر مقرر نہ تھے۔ عموماً جاگیردار یا سردار ہی دیوانی یا فوج داری مقدمات کا فیصلہ کرتے تھے۔ اور اس طرح باقاعدہ عدالتوں کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

تحریری شکل میں کوئی قانون مرتب نہ تھا۔ پھر بھی عوام کو انصاف دیا جاتا تھا اراضی پر حقوق مالکانہ، زمینداروں اور کسانوں کے حقوق اور مختلف فرقوں کے

موروثی حقوق کو تسلیم کیا جاتا تھا۔ مقامی عہدیداران کی زیر سرپرستی باہمی جھگڑوں کا فیصلہ کسی پنچایت (Arbitration) کے ذریعہ کرانے پر زور دیا جاتا تھا۔ قاضی اور قانون گو نجی طور پر اور بلا واسطہ وہی فرائض سرانجام دیتے تھے جو مغل شاہی کے دور حکومت میں پشت در پشت سے وہ دیتے چلے آئے تھے۔ قاضی شادی کی رسومات ادا کرتے تھے رجسٹر میں اندراج بھی کرتے تھے اور اقرار نامہ تصدیق کرتے تھے اور مندرجہ بالا حقیقتوں سے عوام کو روشناس کراتے اور مقامی رواجوں کی تشریح کرتے تھے (28)

مہاراجہ بذات خود اپنی سلطنت کا دور دور تک دورہ کرتا تھا اور مظلموں کی اپیلیں اور فریادیں سنتا تھا۔ جن علاقوں سے فریادی بکثرت اس کے حضور میں آتے وہاں کے گورنروں کو رنجیت سنگھ برا بھلا کہتا تھا۔ وہ دربار میں بھی اپیلوں پر غور کرتا تھا۔ انصاف دینے کے لیے کوئی قومی پالیسی نہیں تھی بلکہ مقامی حالت اور رواجوں کے مطابق انصاف ہوتا تھا۔ انصاف دینے کا کام جاگیردار حسب منشا اور رواج کے مطابق کرتے تھے۔ عموماً سب مقدمات میں جرمانوں کی سزا دی جاتی تھی۔ قید کی سزا مروج نہ تھی اور سزائے موت نہ ہونے کے برابر تھی۔ البتہ پشاور اور ہزارہ جیسے دور دراز اور یورش زدہ اضلاع میں حالت مختلف تھی۔ (29)

بلاشبہ رنجیت سنگھ کے عدالتی بندوبست اور پولیس سسٹم میں بہت سی خامیاں تھیں لیکن جو کچھ 1826ء میں میسن (Masson) نے لکھا ہے۔ اگر اس پر یقین کیا جائے تو واقعی رنجیت سنگھ کے لیے یہ امر باعث فخر ہے کہ اس نے سکھوں میں غارت گری کے رجحان کو قابو میں رکھا۔ ایک وقت تھا کہ سکھ اور ڈاکو ہم معنی سمجھے جاتے تھے لیکن اب چوری کی وارداتیں بہت کم سننے میں آتی ہیں اور شاید ہی کبھی ایسا واقعہ ہوتا کہ کوئی جاگیردار (30) اجتماعی طور پر لوٹ مار یا قتل و غارت کرے جس کا یہ طبقہ مدت سے عادی تھا۔ ہیوجل (Huegel) کے بیان کے مطابق ہم یہ دعوی کر سکتے ہیں کہ پنجاب اس ہندوستان سے زیادہ محفوظ تھا جو اس وقت انگریزی سلطنت میں تھا۔ جس مقام پر ڈاکہ پڑتا تھا مہاراجہ آس پاس کے سارے مواقعات پر کڑی نگاہ رکھتا تھا اور وہاں کے باشندوں کو لوٹے ہوئے مال کی قیمت دینی پڑتی تھی

سفارتی خدمات :- لاہور سرکار کی رضامندی سے لاہور میں لالہ کشن چند

نامی ایک محرّر تھا جو خبریں لکھ کر ویڈ کے پاس بھیجتا تھا۔ لدھیانہ میں رائے گوبند جس نامی ایک سکھ ایجنٹ تھا۔ رنجیت سنگھ کو افغانستان اور سندھ سے بھی سیاسی اطلاعات ملتی رہتی تھیں۔ اپنی سلطنت کے مشہور و معروف مقامات پر اس نے خبر رسانی کے لیے محرّر تعینات کر رکھے تھے۔ یہ کارداروں، جاگیرداروں یا گورنروں کی دخل اندازی کے بغیر اطلاعات بھیجتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی تو یہ خبر نویس ان عہدیداروں کے خلاف بھی مہاراجہ کو خبریں ارسال کرتے تھے۔ ان کی بدولت مقامی ایجنٹ من مانی نہیں کر سکتے تھے۔ لاہور دربار کے سفیروں میں سے سب سے اہم فقیر عزیزالدین کے فرزند فقیر شاہ دین کو بھی کبھی کبھی چھوٹے موٹے سفارتی نوعیت کے کام سونپے جاتے تھے۔ ایلفنسٹون کے مطابق احمد شاہ ابدالی کے دور حکومت میں افغان سرکار کی خامیوں میں سے ایک خامی یہ تھی کہ اسے آس پاس کی حکومتوں کے بارے میں معلومات نہ تھیں لیکن سکھ حکمران بذات خود روزمرّہ کے حالات اطلاعات اور معلومات سے پوری طرح باخبر رہتا تھا اس طرح اس کی سرکاران ملکوں کے معاملات سے بخوبی واقف تھی جن میں اس کی دلچسپی تھی۔ ایک غیر ملکی مشاہد نے لکھا ہے کہ جس قدر رنجیت سنگھ کو تحقیق و تفتیش کا شوق تھا اسی قدر عوام بےخبر اور بےچین تھے۔

رنجیت سنگھ کے دیوانی بندوبست کا اندازہ لگانے کے لیے ہمیں خاص طور پر اس کی سرکار اور مسلم رعایا کے درمیان تعلقات پر غور کرنا ہوگا۔ شروع شروع میں ۱۸۰۱ء میں رنجیت سنگھ نے قاضی ناظم الدین کو ان مسلمانوں کا سربراہ مقرر کیا جو اس کی سرکار کو تسلیم کرتے تھے۔ مفتی محمد شاہ کو رہن، بیع اور ٹھیکہ وغیرہ کے معاملات کا مشیر بنایا۔ امام بخش کو سٹی پولیس کا افسر اعلیٰ مقرر کیا۔ عزیزالدین، نورالدین، چودھری قادر بخش اور دیگر کئی مسلمان عہدیدار رنجیت سنگھ کے معتبر ملازموں میں شمار ہوتے تھے۔ رنجیت سنگھ کے دور حکومت کے بیشتر حصہ میں امرتسر میں سکھوں کے مشہور قلعہ گوبندا گڑھ کا قلعہ دار امام الدین تھا۔ جب رنجیت سنگھ نے نورالدین کو گجرات کا گورنر مقرر کیا تو مقدس دھاگہ (جنیو) پہننے والے اونچی ذات کے ہندوؤں نے اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی مگر بیکار (31) وہ عظیم سکھ حکمران فرقہ پرستی سے بالاتر تھا۔ یہاں تک کہ کھلے عام وہ مسلمان صوفیوں کا احترام کرتا تھا۔ سید اس کے منظور نظر تھے۔

کبھی کبھی (32) قرآن شریف کے حافظوں کو مدعو کیا جاتا تھا جو متواتر کئی دن تک زبانی قرآن شریف کا دور کیا کرتے تھے اور مہاراجہ ان کو دل کھول کر روپے دیتا (33) حکومت کی طرف سے علماء اور صوفیوں کو عطیات دینے کی روایت برقرار رہی۔ ایک ڈائری جس میں رنجیت سنگھ کے درباری خبریں مورخہ 25 اگست 1825ء کے تحت اہم اندراج ہے "جب مہاراجہ نے پشاور کو سلطنت میں شامل کیا تو اس نے اس موقع پر پشاور کے قاضیوں سیدوں، عالموں، اور فقیروں کو بیش بہا خلعت عطا کیے اور ہر ایک کو گذر بسر کے لیے جاگیر بھی دی" (34)

اس سلسلہ میں مندرجہ ذیل واقعہ پر نظر ڈالنی چاہیئے۔ 20 اگست 1825ء کو مرزا اگتن بیگ، کمیدان توپ خانہ، و دیگر کچھ لوگ رنجیت سنگھ کے پاس گئے اور مسلمان افسروں کی جانب سے رنجیت سنگھ کے اس حکم کے خلاف آواز اٹھائی کہ محرم کے سلسلہ میں بازاروں اور گلیوں میں تعزیے نہ نکالے جائیں۔ مرزا اگتن بیگ نے مسلمانوں کی نمائندگی کرتے ہوئے کہا کہ مدت مدید اور عرصہ طویل سے تعزیے بازاروں میں سے نکلتے رہے ہیں۔ اس نے یہ بھی عرض کیا کہ اگر مہاراجہ کے دل میں مسلمانوں کے لیے کوئی جذبۂ منافرت ہے تو انہیں سب مسلمانوں کو ملازمت سے سبکدوش کر دینا چاہیے مہاراجہ نے ان کو صلاح دی کہ وہ اپنے گھروں میں تعزیے بنائیں اور کھلے عام ان کی نمائش نہ کریں۔ رنجیت سنگھ نے تب عزیزالدین سے دریافت کیا کہ کیا وہ بھی ان کی طرح محرم کے موقع پر غم کا اظہار کرتا ہے۔ فقیر عزیزالدین نے نفی میں جواب دیا۔

دو دن بعد رنجیت سنگھ کو کھڑک سنگھ نے بھرے دربار میں بتایا کہ شہر کے مسلمان اور مہاراجہ کی فوج کے مسلمان سپاہی اس بات سے بہت ناراض ہیں کہ ان کو بازار میں سے تعزیے نکالنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ مہاراجہ نے تب کوتوال کے نام حکم صادر کر دیا کہ وہ اعلان کر دے کہ جو لوگ تعزیے نکالنے چاہیں ان پر کوئی پابندی نہیں اور نہ اسے اس میں کوئی اعتراض ہے۔ بلاشبہ مسلمانوں کی رائے عامہ نے رنجیت سنگھ کو جھکنے پر مجبور کر دیا لیکن اگر مہاراجہ ہٹ دھرم اور ضدی ہوتا تو وہ اپنے حکم پر ڈٹا رہتا۔ شاید اس کی اس مذہبی رواداری کا نتیجہ تھا کہ 1826ء میں جب مہاراجہ بیمار پڑا تو مسلمانوں نے مسجدوں میں جا جا کر اس کی تندرستی کے لیے دعائیں مانگیں (34)

برنز نے اپنی رپورٹ میں قلمبند کیا ہے کہ "میں نے ہمیشہ یہ دیکھا ہے کہ مذہبی معاملات میں سکھ زیادہ روادار ہیں" مٹکاف نے بھی رنجیت سنگھ کی تعریف کی کہ بلا امتیاز مذہب و ملت رنجیت سنگھ نے سب کی قابلیت سے فائدہ اٹھایا (37)

رنجیت سنگھ کے طرز حکومت میں بلاشبہ بہت سی خامیاں تھیں حالانکہ اس نے کئی اداروں اور روایتوں کو قایم کیا تاہم سب ابتدائی نوعیت کی تھیں۔ بہت حد تک من مانی حکومت ہی چلتی تھی۔ سلطنت کو نہ قانونی طور پر متحد کیا گیا اور نہ فنون لطیفہ سے مزین کیا گیا۔ کسی قومی آئین کی داغ بیل نہیں ڈالی گئی جو سارے ملک پر یکساں لاگو ہو۔ ان حالات کے تحت اختیارات کا جزوی طور پر ناجائز استعمال بھی ہوا ہوگا اس کے علاوہ اس کا دل وسیع نظریات کا حامل نہ تھا وہ صرف دیوانی معاملات کی گہرائی تک ہی جا سکتا تھا۔ اس کے طرز حکومت کی سب سے بڑی خامی یہ تھی کہ فوج کی امداد ہی سے سرکاری خزانہ بھرا جاتا تھا اور دور دراز صوبوں پر بھی فوجوں کی امداد ہی سے کنٹرول رکھا جاتا تھا۔ حکمران کا فقط اپنا ذاتی رسوخ ہی تھا جس پر فوجی جان چھڑکتے تھے اور ضبط و نظم میں رہتے تھے۔ رنجیت سنگھ کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ جانتا تھا کہ کہاں اور کب لوگوں کو اور حالات کو ڈھیل دینی چاہئیے دوسرے مطلق العنان حکمرانوں کے برعکس وہ سارے اختیارات اپنی ذات میں یکجا کرنے کا مخالف تھا۔ اس کی حکومت میں عموماً مالی معاملات ہی کو ایک مرکز پر لانے کی کوشش کی گئی۔ سکھ سرکار رعایا کو نہ صرف حقوق دیتی تھی بلکہ ان کی حفاظت بھی کرتی تھی۔ جالندھر ضلع کے بندوبست کے بارے میں ٹیمپل (Temple) نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے "جیسا کہ حالات تھے، جائیدادوں اور حقوق کے بارے میں کسی قسم کی گڑبڑ اور شور و شر نہ تھا۔ سماج کے سپرنگ (Springs) شاید بہت کسے ہوئے تھے اس لیے صرف دباؤ ہٹانے کی ضرورت تھی، کسی خاص دوستی کی چنداں ضرورت نہ تھی " یہاں ان دو انگریزی تحریروں کا ذکر کرنا بے جا نہ ہوگا جن میں رنجیت سنگھ کے مالی بندوبست کو قابل تحسین قرار دیا گیا ہے " ایک ایسے علاقہ میں جو یکجا اور ملحق ہے اس نے ایسے سدھار کئے ہیں جو اعلیٰ دل و دماغ کا مالک ہی کر سکتا ہے۔ یہ ایسی خود مختار اور مطلق العنان حکومت ہے جو ظلم اور سنگین قوانین سے

مبرّا ہے۔ اس طرح مشرق کے روایتی اداروں سے اس کا طرزِ حکومت نرالا ہے۔ یہ سچ ہے کہ یورپ کے تمدن سے اس کا کوئی مقابلہ نہیں (38) ۔ سب کو اس سے امیدیں وابستہ تھیں سب میں وطن کا جذبہ تھا۔ رعایا بخوشی حکومت کے احکام کی تعمیل کرتی تھی۔ ملازمین خوشامدی اور نمک حرام نہ تھے۔ تہ دل سے اپنے فرائض انجام دیتے تھے۔ فوجی مطلق العنان حکومت ہوتے ہوئے بھی رعیت سے نرم دلی کا برتاؤ کرتے تھے۔ جلدی جلدی جوڑ توڑ کرکے بنائی گئی یہ حکومت بطور فیڈرل یونین مضبوط اور کامیاب تھی (39) جان و مال محفوظ تھا۔ لاہور اور امرتسر جیسے شہر مالا مال ہو گئے تھے صنعت اور تجارت کو فروغ حاصل تھا اور عوام اپنے گھر چھوڑ کر انگریزی مقبوضات کو ہجرت کرنے کے چنداں خواہاں نہ تھے۔

رنجیت سنگھ کے طرزِ حکومت کی جو تصویر ٹیمپل نے پیش کی ہے اسے چند لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ "سخت گیر مگر پائیدار" حکومت تھی۔ اس کا جوا حالانکہ پرمشقت تھا لیکن جاں کاہ نہ تھا۔ انصاف حاصل کرنا آسان نہ تھا پھر بھی عوام قوت ارادی سے حکومت کی طرف سے کی گئی کسی بھی بے انصافی کے خلاف جدوجہد کر سکتے تھے خود سر امراء اور جاگیردار اکثر من مانی کرتے تھے۔ معافی دار طبقہ اثیار پسند تھا لیکن اپنے ضروری حقوق کا بڑا خیال رکھتا تھا۔ کسان جی جان سے کام کرنے کے عادی تھے۔ اپنے کھیتوں اور گھروں سے مضبوطی کے ساتھ چپکے رہتے۔ حکومت میں تغیر و تبدل کے باوجود اراضی پر حقوق مالکانہ برقرار رہتے۔ اور اس طرح گاؤں کے سب فرقوں کے حقوق محفوظ رہتے۔ (40)

رنجیت سنگھ کے تحت بندوبست پر ضمنی نوٹ :۔ کشمیر بیس پرگنوں میں منقسم تھا۔ ہر پرگنہ کا ایک کلکٹر تھا۔ اس میں کل دس تھانے اور چار سو آباد گاؤں تھے۔ اس میں مختلف قسم کے سکے چلتے تھے (41) پہلا پرانا روپیہ جس کی قیمت ہندوستانی درمے دس آنے بنتی تھی۔ یہ کشمیر کی ٹکسال میں تیار ہوتا تھا اور اس پر دہلی کے شہنشاہ کا نام کندہ تھا۔ شالوں کا کاروبار اسی سکہ سے ہوتا۔ دوسرے قسم کا روپیہ ہری سنگھ کے نام پر، ہری سنگھ کا روپیہ کہلاتا تھا۔ اس کے ایک طرف دوسری لکال جنیوؔ، اور دوسری طرف ہری سنگھ کندہ تھا۔ اس کی قیمت بارہ آنے تھی۔ کرایہ، ٹیکس

محصول، چنگی کی ادائیگی اسی سکہ میں ہوتی تھی۔ تیسرا نانک شاہی روپیہ تھا۔ اس کی قیمت
رنجیت سنگھ کی سلطنت میں پورے سولہ آنے تھی۔ مگر دہلی میں اس کا لین دین 14½
آنے میں ہوتا تھا۔ فوجیوں کو تنخواہ کی ادائیگی اسی سکہ میں ہوتی تھی۔

مورکرافٹ کے بیان کے مطابق کشمیر کی کل آمدنی چھتیس لاکھ روپے سالانہ تھی۔
لگان اناج وکیسر سے بارہ لاکھ اور تجارتی اشیاء اور شال کے کاروبار پر ٹیکس سے
چوبیس لاکھ روپے محصول آتا تھا۔ ہندوستانی در کے مطابق کل آمدنی ستائیس لاکھ
روپے بنتی تھی۔ رنجیت سنگھ نے 1827ء میں ویڈ کو بتایا کہ دوسرے صوبوں کی
نسبت کشمیر سے اسے زیادہ آمدنی ہے۔ سب اخراجات وضع کرکے پچیس لاکھ روپے
سالانہ کی بچت تھی۔

1822ء میں سارے کشمیر میں چار ہزار فوجی سپاہی تھے جن میں سے ایک ہزار
گھوڑ سوار تھے۔ اس سے پہلے وہاں سولہ ہزار سے بیس ہزار تک افغان سپاہ رہتی
تھی۔ (42)

مورکرافٹ کا بیان ہے کہ شالوں پر قیمت کا پندرہ فی صدی ٹیکس کسٹم ڈیوٹی لگتا
تھا۔ دوسرے کئی ذرائع سے بھی محکمہ شال کی تنظیم کی تفصیل ملتی ہے۔ 1833ء سے
(43)، قبل جتنی شالیں بنتی تھیں ان پر سرکاری مہر لگتی تھی۔ ان پر فی عدد ٹیکس لگتا تھا
جو ایک روپیہ پر تین آنے ہوتا تھا۔ 1835ء میں [illegible] میاں سنگھ نے ہر دکان پر
"باج" ٹیکس مقرر کر رکھا تھا۔ شیخ غلام محی الدین نے بھی یہی طریقہ جاری رکھا۔
لیکن اس نے اسے ایک سو بیس روپے سالانہ تک بڑھا دیا۔ (44)

مورکرافٹ نے عموماً رنجیت سنگھ اور اس کے بندوبست پر کڑی نقطہ چینی کی
ہے۔ اس کی رائے میں رنجیت سنگھ نے غریب کشمیریوں پر بہت زیادہ ٹیکس عائد کر
رکھے تھے۔ یہ الزام جزوی طور پر صحیح ہے تاہم کشمیریوں کی بہبودی میں بھی رنجیت سنگھ
کی دلچسپی کی واضح مثال ملتی ہے۔ اس کے کچھ ڈپٹی نائب جمعدار اور خوش حال
سنگھ اور غلام محی الدین کچھ ضرورت سے زیادہ حریص تھے۔ سکھ حکمران بذات خود
اتنا سمجھ دار تو ضرور تھا کہ سونے کے انڈے دینے والی مرغی کو حلال کرنا اس کے لیے
مفید نہ ہوگا۔ لیکن دیوانی بندوبست اور متعلقہ مسائل کو حل کرنے کا کوئی سائنٹفک۔

طریقہ نکالنے کی اس نے کبھی کوشش نہیں کی اگر وہ ایسا کرتا تو اسے معلوم ہوجاتا کہ حفظ ماتقدم کے طور پر چاول کی تجارت مکمل طور پر اپنے ہاتھوں میں لینا قحط سے بچنے کے لیے کتنا ضروری ہے۔ کشمیر میں ذرائع نقل و حمل محدود تھے۔ فصل کی خرابی کی صورت میں قحط کا مقابلہ کرنے کے لیے عوام تک اناج آسانی سے نہیں پہنچ سکتا تھا۔ ناممکن نہ تھا۔ رنجیت سنگھ کے دور حکومت میں بہت قحط پڑے مگر ایسے حالات میں بھی رعایا کو آسانیاں فراہم کرنے میں رنجیت سنگھ کے اقدام ناکافی رہے۔

اشارات

1- گلوسری (Glossary) آف دی پنجاب ٹرائبس اینڈ کاسٹس جلد اوّل صفحہ 698

2- پولیٹیکل پروسیڈنگس 13 جولائی 1823ء مرے بنام ویڈ۔

پیرا 3 : ایک اکالی نے سر ڈیوڈ آکٹرلونی کا کام تمام کرنے کی کوشش کی۔ بدنام اکالی پھولا سنگھ کی سرکردگی میں امرتسر کے مقام پر مسٹر مٹکاف پر حملہ کیا گیا۔ ستلج پار کئی بار انتشار پھیلانے کی کوشش کی گئی۔

(1) 1809ء میں اس نے لیفٹیننٹ وہائٹ پر حملہ کیا جو لدھیانہ کے مغرب میں سرکاری طور پر کوئی سروے کرنے گیا تھا۔

(2) 15-1814ء میں وہ مغربی اضلاع میں لوٹ مار کر رہا تھا اور اپنے آپ کو ایک قلعہ میں محصور کر دیا تھا جہاں سے راجہ رنجیت سنگھ کی فوجوں نے نکال دیا۔

(3) 1817ء میں کئی سو رفیقوں کے ساتھ پھولا سنگھ نے مغربی اضلاع کو تاخت و تاراج کیا اور وہاں کے باشندوں سے جبراً روپیہ لیا مگر آخر کار لاہور کی فوج کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ رنجیت سنگھ نے پھولا سنگھ کو آنندپور میں رہنے پر مجبور کر دیا۔ آنندپور انگریزوں کی زیر حفاظت ریاستوں کے شمال مشرق میں واقع تھا۔ یہاں سے بھی ریزیڈینٹ کے حکم کے مطابق اسے ستلج کے پار نکال

دیا گیا اور حاکم لاہور نے اسے جاگیر عطا کی۔
نارائن سنگھ اور اس کے معاون خوش حال سنگھ نے اس قسم کے کئی حملے اور
واقعات تشدد دہرائے۔

3۔ ٹریویز مصنفہ برنز جلد دوم صفحہ 91، رنجیت سنگھ کا اپنے عہدیداروں کے نام
پروانہ "اس امر کا خاص خیال رکھا جائے کہ نہنگ اور دیگر ایسے سر پھرے
لوگ دور رکھے جائیں۔
4۔ ٹریویز مصنفہ ہیوجل صفحہ 288
5۔ پنجاب چیفس متعلقہ بھوانی داس مصنفہ لیپل گرفن۔
6۔ سکھ اور افغان مصنفہ شہامت علی صفحہ 16
7۔ پارلیمنٹری پیپرز ایکٹنگ ریزیڈینٹ بنام سکریٹری 25 ستمبر 1847ء
8۔ فارن ڈیپارٹمنٹ متفرق نمبر 356۔ بورڈ آف ایڈمنسٹریشن کی رپورٹ
لاہور صفحہ 17۔
9۔ پارلیمنٹری پیپرز ایکٹنگ ریزیڈینٹ بنام سکریٹری 25 ستمبر 1884ء
10۔ کلکتہ ریویو 1844ء
11۔ پارلیمنٹری پیپرز ایکٹنگ ریزیڈینٹ بنام سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا لاہور
27 دسمبر 1847ء
12۔ فارن ڈیپارٹمنٹ متفرق نمبر 157، صفحہ 165
13۔ انگریزی حکومت و مقامی ریاستوں کے 1840ء میں سیاسی تعلقات مصنفہ
اینڈ پلوڈی کرز
14۔ فارن ڈیپارٹمنٹ متفرق نمبر 351
15۔ ایضاً 357، صفحہ 165
16۔ پنجاب مصنفہ سیٹن بیچ،
17۔ جرنل اوراق نور۔ مصنفہ آغا عباس شیرازی
18۔ فارن ڈیپارٹمنٹ متفرق نمبر 357، صفحہ 219
19۔ پولیٹیکل پروسیڈنگس 31 مئی 1836ء نمبر 57

20۔ ایضاً 29 اگست 1836ء نمبر 57
21۔ ایضاً 7 اگست 1837ء نمبر 94
22۔ ظفر نامہ
23۔ دی انگلش مین 25 دسمبر 1833ء
24۔ پنجاب اخبار 10 مارچ 1839ء
25۔ ٹریولز مصنفہ برنز جلد اوّل صفحہ 96
26۔ پولیٹیکل پروسیڈنگس 9 نومبر 1837ء
27۔ ایضاً 21 نومبر 1836ء نمبر 30
28۔ فارن ڈیپارٹمنٹ متفرق نمبر 156، صفحہ 21
29۔ ایضاً
30۔ ٹریولز مصنفہ میزن جلد اوّل صفحہ 426
31۔ ظفر نامہ 1819ء صفحہ 54
32۔ ریزیڈینٹ بنام لیفٹیننٹ ایڈورز 13 نومبر 1847ء
33۔ رنجیت سنگھ کے دربار کی خبریں 20، 22 اگست
34۔ رنجیت سنگھ کے مسلمانوں کے ساتھ تعلقات کے بارے میں شاہ ایوب کی شکایت ایک دلچسپ واقعہ تھی۔ اس نے مہاراجہ سے شکایت کی کہ سلطان محمد خان نے شہزادہ اشرف کی بیٹی سے شادی کر لی۔ رنجیت سنگھ نے بتایا کہ لاہور عدالت مقدمہ کی سنوائی کرے گی تب اس نے یہ تجویز پیش کی کہ معاملہ کیپٹن ویڈ کے سپرد کیا جائے۔ احمد شاہ ابدالی کی اولاد اپنی کمتری کی حالت میں بھی اپنی جھوٹی شان و شوکت کو نہیں چھوڑتے تھے۔ لیکن تعجب یہ ہے کہ اپنے گھریلو جھگڑے وہ ایک غیر ملکی حاکم کے روبرو رکھتے ہیں جو دوسرے مذہب کا ماننے والا تھا۔ اس میں وہ ذرا بھی نہیں شرمائے۔
(عمدۃ التواریخ جلد دوم، صفحات 94-293)
35۔ ظفر نامہ 1826ء صفحہ 172
36۔ فارن ڈیپارٹمنٹ متفرق نمبر 305 تھامسن مٹکاف کا خط مورخہ 9 مئی 1831ء

37 - ٹریولز مصنفہ برنز جلد اوّل صفحہ 285
38 - (Adventure of an officer) ایک افسر کی مہمات، مصنفہ لارنس۔
39 - Man and events of my time (میرے زمانے کے آدمی اور واقعات) مصنفہ ٹیمپل
40 - ایشیاٹک جرنل جلد 18، 1836ء مورکرافٹ کا بلخ و بخارا کو سفر
41 - ایضاً ٹریولز مصنفہ ہیوجل، صفحہ 123
42 - ایضاً
43 - گلاب سنگھ، پنجاب کی پولیٹیکل ڈائریاں، جلد ششم، صفحات 45-44
(پانی کار) Panikkar

نواں باب
رنجیت سنگھ کی فوج

ایک وقت تھا کہ جاگیردار خراج کے طور پر لوٹ مار کرنے والے گھوڑ سواروں کو کچھ عرصہ کے لیے حکمرانوں کے حوالے کرتے تھے۔ لیکن رنجیت سنگھ نے ایسی بے قاعدہ افواج کے بجائے ایک باقاعدہ منضبط اور پیشہ ور سکھ فوج تیار کی۔ 1811ء میں اس کی باقاعدہ فوج 4051 تھی جس میں 2652 پیادہ، اور 1209 توپچی تھے۔ 1838ء میں اس باقاعدہ فوج کی تعداد 38242 ہوگئی۔ جو 29617 پیادہ، 4095 گھوڑسوار اور 4535 توپ خانہ پر مشتمل تھی، اور اس باقاعدہ فوج کا کل خرچ 3,74,101 روپے ماہانہ تھا۔ عہ

عہ

	اوسطاً ماہانہ تنخواہ
1۔ کمیدان کمانڈنٹ	60 سے 150 روپے ماہوار
2۔ میجر	30 سے 60 " "
3۔ صوبے دار	20 سے 30 " "
4۔ جمعدار	15 سے 22 " "
5۔ حولدار	13 سے 15 " "
6۔ نائک	10 سے 12 " "
7۔ سرجان	8 سے 12 " "
8۔ پھوریا	7 سے 10 روپے 8 آنے ماہوار
9۔ سپاہی	7 سے 8 روپے 8 آنے ماہوار

فوج کا ماہانہ نقدی تنخواہ دینے کا سسٹم ایسٹ انڈیا کمپنی سے لیا گیا۔ اس سے پہلے جاگیرداری یعنی تنخواہ کے عوض زمین یا فصلانہ داری یعنی فصل کے موقع پر ادائیگی تنخواہ کا عام رواج تھا۔ فصل کے موقع پر ادائیگی کا رواج آہستہ آہستہ ختم ہو گیا۔ لیکن ماہانہ ادائیگی باقاعدہ طور پر نہیں کی جاتی تھی۔ عام طور پر فوجیوں کی پانچ پانچ چھ چھ مہینے کی تنخواہ بقایا بذمہ سرکار رہتی تھی۔ عموماً پانچ بار سال میں تنخواہ دی جاتی تھی۔ سپاہی جب تک جسمانی طور پر تندرست رہتے تھے ان کی ملازمت جاری رہتی تھی۔ باقاعدہ پنشن کا رواج نہ تھا۔ البتہ فوج میں کل خالی اسامیوں کا تیس فی صدی ریٹائر ہونے والے فوجی کنبوں کے افراد سے پورا کیا جاتا تھا۔ وقتاً فوقتاً جنگ میں کام آئے یا زخمی سپاہیوں کے خاندانوں کو کچھ رقم بطور الاؤنس دی جاتی تھی۔ تنخواہ کی فردوں پر "دھرم ارتھ" کا خانہ بنا ہوا تھا جس میں ان ادائیگیوں کا اندراج ہوتا تھا جو مرے ہوئے یا زخمی سپاہیوں کی ماں، بیوی، بیوہ، بیٹے یا بھائی کو دی جاتی تھیں۔

1839ء میں ڈبلیو بارنس (W. Barnes) کی ملاقات ایک سکھ سے ہوئی جو رنجیت سنگھ کی فوج میں ایک افسر تھا۔ اس کے تحت ۷۰ گھوڑ سوار تھے۔ اس کو تنخواہ اور گزارے کے لیے دو روپے یومیہ ملتے تھے۔ جمرود کی لڑائی میں اسے تلوار کا ایک کاری زخم لگا۔ اسے اس موقع پر بڑا عطیہ دیا۔ اس نے بتلایا کہ مہاراجہ ان سپاہیوں کی بڑی فراخ دلی سے امداد کرتا ہے۔ جو اس کی ملازمت میں زخمی ہو جائیں اور اگر اسے پتہ چل جائے کہ کسی سردار نے کسی زخمی سپاہی کو انعام نہیں دیا تو وہ سردار فوراً مہاراجہ کی نظر میں معتوب ہو جاتا ہے۔

باقاعدہ فوج کے علاوہ اس کے پاس کچھ بے قاعدہ گھوڑ سوار فوج بھی تھی جو تنخواہ دار "گھوڑ چڑھا" کے نام سے موسوم تھی۔ 1838ء میں ان کی تعداد 1795 تھی۔ یہ دستے اپنے گھوڑوں کی ضروریات کا بندوبست خود کرتے تھے۔ یہ دو ڈیروں میں منقسم تھے اور ہر ڈیرا کئی مسلوں میں بٹا ہوا تھا۔ ایک مسل پندرہ سے لے کر ۷۰ گھوڑ سواروں پر مشتمل ہوتی تھی۔ ایک مسل میں عموماً ایک ہی کنبہ (گوتر) کے افراد ہوتے تھے۔ یہ دستے ہوجل ([illegible]) کو اس وقت کی یاد دلاتے تھے جب سلطنتوں کی قسمت نیزوں کی نوک سے وابستہ تھی۔ تفصیلی فردوں کے مطابق گھوڑوں کا اکثر

معائنہ لیا جاتا تھا۔ ایک گھوڑ سوار کی تنخواہ اور الاؤنس کا دارومدار اس کے گھوڑے کی حالت پر منحصر تھا۔ گھوڑے کے مر جانے کی صورت میں سوار کو اس وقت تک پیادہ کی تنخواہ ملتی تھی جب تک وہ کوئی اور گھوڑا مہیا نہ کرے۔ اس سلسلے میں کسی غلطی یا خامی پائے جانے پر عالی رتبہ عہدیداران کو بھی نہیں بخشا جاتا تھا۔ اس قسم کی تنظیم نے کنبوں کے اتحاد کی سپرٹ کو قائم رکھا اور لیڈر کے زیر کمان جنگ کرنے کا قدیمی رجحان بھی برقرار رہا۔ اس طرح مسل دار بھی تعاون کا سبق حاصل کرتا رہا۔ باقاعدہ فوج اور بے قاعدہ گھوڑ سوار سپاہیوں کے علاوہ جاگیرداروں سے بھی فوجی دستے طلب کئے جاتے تھے۔ ان جاگیرداری دستوں کو مقابلتاً کم اہم یعنی سزا دینے والی مہموں میں لگایا جاتا تھا۔ (1)

1830ء سے 1840ء تک کے درمیان کچھ انگریزوں نے پنجاب کا دورہ کیا۔ انہوں نے رنجیت سنگھ کے فوجی بندوبست پر نکتہ چینی کی۔ برعکس اس کے کچھ انگریزوں نے اس کے بندوبست کی تعریف کی۔ لاؤنس نے کہا "عمارت پوری ہو چکی ہے لیکن مہاراجہ اس کے تحفظ پر اتنی توجہ نہیں دے رہا ہے جتنی اس نے اس کی تعمیر پر دی۔ باقاعدہ تنخواہ کا کوئی یقینی ثبوت نہیں ہے۔ اس کی حکومت کے آخری دور میں رنجیت سنگھ کے فوجی ڈھانچہ کی اہلیت کو آسبورن نے سراہا ہے۔ اس نے لکھا ہے "سکھ فوج ایک جگہ سے دوسری جگہ فوری طور پر نقل و حرکت کر سکتی ہے۔ کوچ کے لیے گاڑیوں کا استعمال ممنوع ہے ضرورت کا سب سامان ان کے اپنے بازار اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ ستلج کے دوسری طرف تین کمپنیوں کی نقل و حرکت کی بہ نسبت رنجیت سنگھ کی تیس ہزار سپاہ زیادہ آسانی سے کم خرچ اور تھوڑے وقت میں ایک جگہ سے دوسری جگہ جا سکتی ہے۔

1811ء میں توپ خانہ کی اور پیادہ سپاہیوں کی اوسطاً ماہانہ تنخواہ 7 روپے 8 آنے تھی جب کہ باقاعدہ فوج کی ملازمت بالکل ناپسندیدہ تھی اس لیے رنگروٹ بھرتی کرنے میں مشکل پیش آتی تھی۔ اس کے مقابلہ میں 1838ء میں جب باقاعدہ فوج کی ملازمت ہر دلعزیز ہو گئی اور رنگروٹ آسانی سے ملنے لگے تو پیادہ سپاہیوں کی تنخواہ 7 روپے 7 آنے اور توپچی کی تنخواہ 7 روپے 2 آنے ماہوار تھی۔ رنجیت سنگھ نے فوجی ملازمت کی مقبولیت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے تنخواہوں میں بہت زیادہ کمی نہیں کی۔ رنجیت سنگھ کے تحت فوجی عہدیداروں کی تنخواہوں کی شرح کمانڈنٹ سے نے کر سپاہی تک تقریباً دی تھی

جو ایسٹ انڈیا کمپنی اپنے فوجی ملازموں کو دیتی تھی۔ مقتول اور زخمی فوجیوں کے خاندانوں پر کافی توجہ دی جاتی تھی۔

یہ بات بہرحال ماننی پڑے گی کہ تنخواہ کی ماہانہ ادائیگی میں بے قاعدگی رنجیت سنگھ کے فوجی نظم و نسق کی ایک بہت بڑی خامی تھی۔ برنز نے لکھا ہے "گزشتہ چند برسوں میں فوج کی تنخواہ کی ادائیگی میں بڑی بے قاعدگی رہی۔ اس کا سبب انگریزوں کے ساتھ روز بروز بڑھنے والی دوستی یا اس زمانے کی طمع تھی۔ اس نے انگریزوں کی دیکھا دیکھی اپنے یہاں بھی تنخواہ کی ماہانہ ادائیگی کا طریقہ جاری کیا لیکن یہ بالکل ایک نئی بات تھی۔ اس لیے آمدنی کے حصول میں ایسی بے قاعدگی کی ضرورت تھی جو سکھ قوم کو اس وقت تک حاصل نہیں ہوئی تھی۔ 1835ء میں ویڈ نے کسی اور سلسلے میں یہ بات ظاہر کی ہے کہ انگریزی ضابطوں کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ حکومت کے کسی شعبہ کے انتظام میں ان کا عام استعمال ہے۔ یہ ضابطے منصفانہ طور پر اختیار کیے جاتے ہیں۔ جہاں ضابطے کے اجزا اس قدر مختلف ہوں جیسے کہ انگریزی حکومت اور مہاراجہ کی حکومت میں ہیں تو ایک کی چند شقیں دوسرے کی چند شقوں پر ٹھیک طور سے منطبق نہیں ہو سکتیں۔ (3) تنخواہ کے طریق کار کی جزوی ناکامی کی یہ بہترین تشریح ہے۔ عملی طور پر قدیم فصلانہ سسٹم اور انگریزی حکومت کے ماہانہ ادائیگی کے سسٹم میں ایک درمیانی طریقہ ثابت ہوا۔

یورپین افسر:۔ ہندوستانی فوجوں کی تربیت کے لیے یورپین افسروں کے تقرر کا خیال عرصہ سے چلا آ رہا تھا۔ سترھویں صدی میں بھی ماہر توپ خانہ کے طور پر یورپین افسروں کی مانگ تھی۔ بالاجی باجی راؤ نے یورپین افسروں کی تعیناتی کا سلسلہ شروع کیا۔ مہاراجہ سندھیا نے اسے زیادہ مقبول بنایا۔ 1740ء اور 1750ء کے درمیان پیشوا نے مظفر خان اور ابراہیم خان کا تقرر کیا جنھیں بسی نے تربیت دی تھی اس کے ساتھ ہی ہندوستانی جاگیرداروں کے تحت تربیت یافتہ دستوں کی تاریخ شروع ہوئی۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور حیدر علی، ٹیپو سلطان، جسونت راؤ ہولکر اور سب سے بڑھ کر مہاداجی سیندھیا اور دولت راؤ ہولکر تھے۔

رنجیت سنگھ نے اس روایت کی پیروی کی۔ انگریزی ریکارڈ میں ہمیں ایسے یورپین

اور اینگلو انڈین افسروں کے نام ملتے ہیں جو رنجیت سنگھ کی ملازمت میں تھے۔ کرنل گارڈنر کی فہرست کے مطابق ایسے بیالیس افسران رنجیت سنگھ کے تحت کام کرتے تھے۔ کارمائیکل سمتھ (Carmichael Smyth) کے ضمیمہ میں انتالیس ناموں کی فہرست ہے رنجیت سنگھ کے نامور یورپین افسر وینٹورا اور الارڈ (Allard) 1822ء میں پہلی بار پنجاب آئے تھے۔ ان سے پہلے دو یورپین افسر جیمز اور گارڈن (Gordon) پنجاب کی ملازمت میں تھے۔ (4)

"ان کے آنے کے ساتھ رنجیت سنگھ کی حکومت کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔"

یہ الفاظ لدھیانہ میں انگریزی ریزیڈنٹ ویڈ کے ہیں جس نے الارڈ اور وینٹورا کے پنجاب میں آنے پر کہے تھے لیکن یہ نظریہ غلط ہے کیونکہ ان کی آمد سے بہت پہلے رنجیت سنگھ نے اپنے سپاہیوں کو یورپین طرز کی تربیت دینے کا ارادہ بنا رکھا تھا۔ خالصہ دربار کے ریکارڈ میں پائی گئی تنخواہ کی فردوں کی تفصیلات سے ثابت ہوتا ہے کہ 1807ء ہی سے یورپین طرز سے تربیت یافتہ بٹالین اس کی فوج میں موجود تھی۔ 1807ء میں تین ایسی بٹالین تھیں جو یورپین طور طریقوں سے ڈرل وغیرہ کرتی تھیں (5) رنجیت سنگھ نے بذات خود ویڈ کو بتایا کہ 1827ء میں ہولکر کے پنجاب میں بھاگ کر آنے کے بعد ہی اس نے اپنی باقاعدہ فوج کو تربیت دینے کی ٹھانی۔ اس نے بھیس بدل کر لارڈ لیک کی فوج کا معائنہ کیا۔ اس طرح الارڈ اور وینٹورا اور کورٹ نے پنجاب میں وہی کردار نبھایا جو گارڈن اور لیفارٹ (Lefort) نے روس میں پیٹر اعظم کی زیر نگرانی نبھایا تھا۔ ان کو فقط تفصیلی کارروائیوں پر عمل کرنے کا کام سونپا گیا۔ انہوں نے کسی نئے خیال یا نئی اسکیم سے روشناس نہیں کرایا۔ انہوں نے محض پہلے سے جاری سسٹم کو درست کیا اور کسی حد تک پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ (6)

جب الارڈ اور وینٹورا پہلے پنجاب میں دکھائی دیے تو قدرتی طور پر عوام نے انہیں دخل در معقولات سمجھ کر غیر پسندیدہ نگاہوں سے دیکھا یہاں تک کہ گورکھا بٹالین کے کمانڈر رن سنگھ سے جب کہا گیا کہ وہ ان فرانسیسیوں کے احکام و خواہشات کی تکمیل کرے تو اس نے مہاراجہ کی حکم عدولی کی اور مہاراجہ کے اس حکم کی تعمیل تب تک نہ ہو سکی جب تک کہ گورکھا سپاہیوں کی تنخواہ میں اضافہ نہیں کیا گیا۔ ولی عہد

کھڑک سنگھ نے مہاراجہ سے گذارش کی کہ اس کے کوارٹر سے کافی دور فرانسیسیوں کو کوارٹر دئے جائیں (7) شروع شروع میں مہاراجہ کو بھی ان پر بھروسہ نہ تھا لیکن سیٹن بیچ کے بیان کے مطابق ان دو افسران نے بڑی سوجھ بوجھ اور عاجزی سے لکھے ایک خط میں اسے اپنی وفاداری کا یقین دلایا اور اس کے شبہات کو دور کیا۔ مہاراجہ نے عقلمندی کا ثبوت دیتے ہوئے ان کو اپنی ملازمت میں لے لیا۔ اور ان کے عمدہ چال چلن اور خوش اسلوبی سے بندوبست چلانے کے باعث رنجیت سنگھ کے دل میں یورپینوں کے خلاف جذبہ کافور ہو گیا۔ اور اس نے ان پر ملازمت کے دروازے کھول دئے۔ (8) انجام کار کئی یورپین افسر مہاراجہ کی فوجی ملازمت میں آ گئے۔ رنجیت سنگھ نے فرانسیسیوں پر مکمل اعتماد کیا۔ یہاں تک کہ لاہور کا ایک بڑا دروازہ ان کے حوالے کر دیا تا کہ اس دروازے سے حسب منشا وہ شہر کے اندر باہر جا سکیں۔ تاہم 1826ء میں بھی کچھ ایسے سکھ سردار تھے جنہوں نے الارڈ اور وینٹورا کے تحت کام کرنے سے انکار کر دیا اور بزور بازو (9) ان کا مقابلہ کرنے کی دھمکی دی۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ آہستہ آہستہ ان فرنگی افسران اور پنجاب کے سرداروں میں میل جول بڑھ گیا اور دوستانہ تعلقات قایم ہو گئے لیکن یہ اس وقت تک رہا جب تک کہ مہاراجہ یورپینوں سے فوجی فرائض کی انجام دہی پر زور دیتا رہا لیکن جیسے ہی انہیں جاگیریں ملیں پنجابی سرداران کے مخالف ہو گئے اور ان کے درمیان تنازعات بڑھتے گئے۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ کمار کھڑک سنگھ کی جاگیر کے ملحق مران پور کی بنجر اور غیر آباد جاگیر کے بہت سے باشندے مران پور کو ہجرت کرنے لگے۔ اس سلسلہ کو روکنے کے لیے کھڑک سنگھ کے آدمیوں نے مران پور پر حملہ کیا اور اسے لوٹ لیا۔ یہاں تک کہ وینٹورا کے بیٹے کی قبر بھی حملہ آوروں کی زد سے نہ بچ سکی۔ وینٹورا نے اس ظلم کے خلاف مہاراجہ سے فریاد کی۔ رنجیت سنگھ چاہتا تھا کہ وینٹورا بھی قانون اپنے ہاتھ میں لے کر اینٹ کا جواب پتھر سے دے۔ لیکن ولی عہد کے ساتھ ایک عہدیدار کے تعلقات کے پیش نظر وینٹورا کے لیے ایسا کرنا ممکن نہ تھا۔ اس نے نوکری سے استعفیٰ دے دیا (10) بہر حال بیچ بچاؤ کر کے معاملہ رفع دفع کر دیا گیا۔ جب ایک بار رنجیت سنگھ نے کشمیر کی حکومت وینٹورا کے حوالے کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو درباریوں نے بیک زبان صدائے احتجاج بلند

بلکہ انگریزی ریکارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ رنجیت سنگھ کے آخری دورِ حکومت میں یورپین افسران بھی کچھ اکتا گئے تھے۔ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ ایک بار ونیٹورا نے پہلے تو سیکریٹری (Mac naghten) کی وساطت سے اور بعد میں براہِ راست ویڈ کو انگریزی حکومت کی ملازمت میں آنے کی پیش کش کی تھی۔ اس بے چینی کی محض ایک ہی وجہ تھی کہ پنجاب کی ملازمت بلاشبہ غیر محفوظ تھی کیوں کہ اس کا انحصار ایک ایسی شخص کی زندگی پر تھا جس کی صحت دن بدن گرتی جا رہی تھی۔

رنجیت سنگھ یورپین افسران کو مختلف صلاحیتوں کا ماہر سمجھتا تھا۔ اپنے کام کے علاوہ ان کو باقاعدگی سے کئی دیگر کام بھی سونپے جاتے تھے۔ ونیٹورا اور تابائل توپخانہ میں انسٹرکٹر تھے اور ساتھ ہی صوبوں کے گورنر بھی تھے۔ ہرلان جو دیوانی معاملات کی دیکھ بھال کے لیے مقرر تھا کچھ فوجی دستے بھی اس کی نگرانی میں تھے۔ ہونگ برجر (Honigberger) ایک ڈاکٹر تو تھا ہی، بارود بنانے والی فیکٹری کا نگراں بھی تھا۔ یہاں تک کہ ونیٹورا کو ایک موقع پر اسٹیم بوٹ (دخانی کشتی) بنانے کو کہا گیا بہر حال مقدم طور پر ان کی ضرورت ان کی فوجی معاملات کی مخصوص واقفیت اور صلاحیت پر مبنی تھی۔

رنجیت سنگھ کے تحت یورپین افسران فتوحات کی پالیسی کے حق میں تھے۔ انگریز ریکارڈ سے لیے گئے مندرجہ ذیل الفاظ ان کے جوش اور فطرت کے آئینہ دار ہیں "ہمیں اور دوسری فوجی بٹالین کو لاہور میں کیوں رکھا جائے؟ ہم یہاں بیکار ہیں، ہمیں اٹک کے پار پشاور بھیجئے تاکہ ہم آپ کے لیے کابل پر قبضہ کریں"، لیکن ہمیشہ ہی رنجیت سنگھ یہ وعدہ کرکے ٹالتا رہا کہ وہ ان کی تجویز پر غور کرے گا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ رنجیت سنگھ سندھ کو فتح کرنے کی کوشش کرے۔ اس طرح وہ رنجیت سنگھ کی سلطنت اوز فرانس کے درمیان براہِ راست تعلقات قائم کرانا چاہتے تھے۔ اس سے ان کی آمد و رفت بھی آسان ہو سکتی تھی۔ انگریزی حکومت بھی غیر ملکیوں خصوصاً فرانسیسی افسران کی پنجاب میں بڑھتی ہوئی آمد کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتی تھی۔

رنجیت سنگھ کے بعد اس کے ورثا کے دورِ حکومت میں غیر ملکیوں نے اپنے

آپ کو خون خرابہ، غدّاری اور شک و شبہ کے پراگندہ ماحول میں پایا۔ ملک کی بدلتی ہوئی سیاست اور گروہ بندی نے ان کو غیر محفوظ بنا دیا۔ سردار انہیں پسند نہیں کرتے تھے۔ حکمران ان پر اعتبار نہیں کرتے تھے اور کچھ انجانے اسباب کی بنا پر سپاہیوں میں بھی (19) وہ ہر دلعزیز نہ رہ سکے۔ کھڑک سنگھ کی تخت نشینی کے بعد باغی سپاہیوں نے جرنل کورٹ کا گھر لوٹ لیا۔ کورٹ اور وینٹورا دونوں بال بال بچے۔ لیفٹیننٹ کرنل فاؤکس (Foulkes) کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اور لیفٹیننٹ کرنل فورڈ لوٹ لیا گیا۔ اس کے ساتھ اتنا بُرا سلوک کیا گیا کہ اس کا دل ٹوٹ گیا اور وہ جاں بحق ہو گیا۔ ایسے بُرے سلوک، قتل و غارت اور یکے بعد دیگرے خوفناک مصائب کا سامنا کرتے ہوئے وینٹورا اور تابائل اور دوسرے افسروں نے پنجاب کو خیر باد کہنا ہی مناسب سمجھا گارڈنر کا یہ الزام کہ اوتابائل اور وینٹورا کا پنجاب چھوڑ کر چلا جانا ایک قابلِ مذمت اور کمینہ کردار تھا۔ سراسر ناجائز ہے۔ ہم مانتے ہیں کہ گارڈنر کو بہت عزت دی جاتی تھی لیکن وینٹورا اور الارڈ کی فوری روانگی کو روکنے کے لیے یہ وجہ جواز کہاں تک کافی ہے؟ رنجیت سنگھ کے دورِ حکومت میں ان کو اعلیٰ مرتبہ حاصل تھا اور نتیجہ کے طور پر گارڈنر کی بنسبت ان کے دشمن بھی زیادہ تھے وہ اس بات کو بھی تسلیم کرتے ہیں کہ انہوں نے پنجاب کا نمک کھایا تھا اور اس نازک موقع پر ان کی روانگی نے ان کی فوج کے حوصلے پست کر دئیے تھے (20) جب کہ فوج کو کڑے ضبط میں رکھنے کی ضرورت تھی لیکن ہر شخص اس علاقہ سے چلے جانے کی کوشش کرتا ہے۔ جہاں اس کی عزت محفوظ نہ ہو اور قتل و غارت اور خون خرابہ کا بازار گرم ہو۔

اس سلسلہ میں اس حقیقت کو نظر انداز نہ کرنا چاہئے کہ یورپین بالخصوص وینٹورا کے زیرِ نگرانی فرانسیسی گروپ کو کھڑک سنگھ کا مخالف سمجھا جاتا تھا۔ جیسا کہ ہیوجل کہتا ہے "سارے ہندوستان میں یہی کہا جاتا ہے کہ ولی عہد شہزادہ کے ساتھ جرنل وینٹورا کے تعلقات اچھے نہیں۔ وینٹورا اور اس کے ساتھی ایک افواہ کے مطابق شیر سنگھ کے حامی تھے۔ سید احمد پر شیر سنگھ کی فتح نے اسے مہاراجہ کا وارث بننے کے لیے کھڑک سنگھ کا مدِ مقابل بنا دیا تھا۔ فرانسیسی افسران خاص طور پر اور عموماً اپنے باپ کے سبھی یورپین افسروں سے شیر سنگھ کے گہرے دوستانہ تعلقات تھے۔ (21)

وہ بھی میز کرسی پر بیٹھ کر کھانا کھایا کرتا تھا۔ مہاراجہ کے انتقال کے بعد اُن کے ساتھ کھڑک سنگھ کی پچھلی مخالفت بھی ان کے پنجاب چھوڑ کر جانے کی وجوہات میں سے ایک موزوں وجہ سمجھی جانی چاہیے۔

شاید اس موضوع پر بحث کرنا بھی ضروری ہے کہ آیا فوجوں کو تربیت دینے کی پالیسی فوجی نقطۂ نگاہ سے روایتی طریقۂ جنگ سے بہتر تھی۔ اس فوجی تربیت کے باعث ہی مرہٹہ فوجی نظام اس قدر درہم برہم ہوگیا کہ بہت حد تک یہی مرہٹوں کے زوال کا سبب مانا گیا۔ لیکن اٹھارہویں صدی کے آخری سالوں میں مرہٹہ فوجی تنظیم کی خامیاں رنجیت سنگھ کی منظم سکھ فوج میں کسی طرح بھی نمایاں نہ تھیں۔

مغربی طرز تربیت کو شروع کرنے کے ساتھ ہی مرہٹہ فوج کو غیر قومی بنا دیا گیا۔ سندھیا اور پیشوا کی تحویل میں جو باقاعدہ افواج تھیں وہ قطعی طور پر غیر مرہٹہ تھیں اور تلنگ، نجیب اور اعلیٰ ذاتوں کے سپاہیوں پر مشتمل تھیں۔ یہ ذاتیں اخلاقی طور پر بہت پست تھیں۔ اس کے برعکس رنجیت سنگھ مغربی تربیت کو سکھوں میں ہر دلعزیز بنانے میں پوری طرح سے کامیاب ہوا۔ 1813ء میں تنخواہ کی فردوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی باقاعدہ فوج کا بیشتر حصہ ہندوستانی گورکھا اور افغانوں پر مشتمل تھا۔ لیکن 1818ء کی فردوں سے ظاہر ہے کہ فوج میں پنجابی عنصر عروج پر تھا۔ حالانکہ رنجیت سنگھ سب فرقوں میں سے سپاہی بھرتی کرتا تھا۔ پھر بھی اکثریت ہمیشہ سکھوں کی رہی۔ (22) رنجیت سنگھ کے انتقال کے بعد خالصہ فوج کی تاریخ سے ظاہر ہے کہ سکھ عوام میں فوجی جذبہ اتنا قوی تھا جو شاید کسی ٹریڈ یونین کی تنظیم سے ہی ابھارا جا سکتا ہے۔

1847ء میں ویڈ نے امرتسر میں کچھ باقاعدہ دستوں کی پریڈ دیکھی۔ پریڈ میں سکھ اور پوربی سپاہی پوری طرح گھل مل گئے تھے۔ اسے یہ بتایا گیا کہ ایسا اس لیے کیا گیا ہے کہ ان میں سے کوئی باغیانہ حرکت نہ کر سکے۔ (23) رنجیت سنگھ نے اپنی فوج کی تشکیل میں اس بات کا دھیان رکھا کہ فوجی جذبہ کو فروغ دینے کی راہ میں مقامیت یا فرقہ پرستی حائل نہ ہونے پائے۔ 1836ء میں کی گئی فوجی تنظیم میں مختلف فرقوں کو یکجا کرنے کے عمل کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا گیا۔ پوربیوں، سکھوں، گورکھوں

مسلمانوں اور ہندوؤں کو ایک ہی تار میں پرو کر 38000 سے بھی زیادہ سپاہیوں کی ایک پیشہ ور متحدہ فوج کو منظم کیا گیا۔

مرہٹہ فوج کے مغربی (یورپین) افسروں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ "اگر سپاہی بُرے تھے تو افسران اس سے بھی گئے گذرے تھے۔ ان کی غیر مستقل مزاجی کو دیکھ کر ڈیوڈرینس Dudrenec اور اس کے ساتھیوں کو لیشونت راؤ ہولکر نے 'دغاباز' کے ناقابل رشک خطاب سے نوازا۔ وہ لوگ پیدائش سے غیر مہذب اور تعلیم و اخلاق سے بے بہرہ تھے۔ انگریزوں کے خلاف جنگ کی صورت میں مرہٹہ سردار فوج کے کپتانوں پر بھروسہ نہیں کر سکتے تھے۔ 1802ء میں جنگ چھڑی تو مرہٹہ فوج کے انگریزی افسروں نے ہی نہیں بلکہ فرانسیسی افسروں نے بھی گورنر جنرل کی پیش کش کا فائدہ اٹھایا۔ وہ لوگ اپنی قسمت بنانے اور پیسہ کمانے آئے تھے، کھونے کے لیے نہیں۔ اگر ہم اس کی کارروائیوں سے اس کے منشا کا جائزہ لیں تو ظاہر ہے کہ رنجیت سنگھ اس بات کو بخوبی جانتا تھا کہ اپنی فوج کو مغرب کے افسروں سے بھر کر ان پر انحصاریت کی بنیاد کے مترادف ہوگا۔

رنجیت سنگھ ایک بار سیر کرنے گیا۔ راستہ میں اتفاقاً تین انگریزوں سے اس کی ملاقات ہو گئی۔ یہ انگریز میکناٹن کے ہمراہ آئے تھے، ان سے بات چیت چھڑ گئی تھوڑی ہی دیر میں یورپین افسروں کے بارے میں باتیں ہونے لگیں۔ رنجیت سنگھ نے بتایا کہ یورپین افسران نے اس کے ساتھ معاہدہ کیا تھا یعنی حلف لے کر یہ عہد کیا تھا کہ وہ اس کے لیے اس کے مخالف سے ٹکر لے سکتے ہیں۔ مہاراجہ نے ان تین انگریزوں سے پوچھا کہ انگریزوں کے خلاف جنگ کی صورت میں کیا یورپین افسر پوری ایمانداری سے لڑائی لڑیں گے۔ ان کا جواب نفی میں تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ فرانسیسی اور فرنگی افسر فرانس اور برطانیہ کو چھوڑ کر باقی کسی بھی دوسری یورپین فوج سے نبرد آزما ہو سکتے تھے رنجیت سنگھ نے جب حلفیہ عہد کا ذکر کیا تو ان کا جواب تھا کہ مہاراجہ کو ان کے عہد پر بھروسہ نہیں رکھنا چاہیے کیوں کہ ذاتی مفاد ہی ان کا اصول ہے اور حلفیہ عہد نامہ کی قیمت ان کے لیے صفر سے زیادہ نہیں۔ اس کے باوجود مہاراجہ اس بات کو مانتا رہا۔ اور یورپین افسران جو تندہی سے خدمات سرانجام دے رہے تھے ان کا حوالہ دیتا رہا۔ (25)

مہاراجہ کو ان انگریزوں کی صاف گوئی سے بڑی اذیت پہنچی۔ قلعہ درس پہنچ کر رنجیت سنگھ نے دھیان سنگھ اور فقیر عزیزالدین پر اپنے شبہات کا اظہار کرتے ہوئے بتایا کہ ان تین انگریزوں نے جو کچھ کہا ہے وہ ٹھیک ہی ہے۔ اس بات چیت سے نمایاں ہے کہ مہاراجہ یہ جانتا تھا کہ اینگلو سکھ جنگ کی صورت میں یورپین افسر نہ دل سے اس کا ساتھ نہ دیں گے۔ حالانکہ ایسی جنگ میں باقاعدہ فوج کا کردار اہم ترین ہوتا ہے۔ لارنس کے اس دعوے کی بھی تشریح ہو جاتی ہے (26) کہ کیوں یورپین افسران فقط ڈرل ماسٹر تھے اور ان کو زیادہ بارسوخ کیوں نہیں ہوتے دیا گیا۔

1836ء میں ویڈ لاہور آیا تو اسے معلوم ہوا کہ سکھ فوج کئی بریگیڈوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ہر بریگیڈ میں تین یا چار پیادہ بٹالین تھیں۔ ساتھ ہی کچھ گھوڑسوار اور توپ خانہ تھا۔ 1836ء کے درباری ریکارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ باقاعدہ فوج کے لیے بہت سے سکھ جرنلوں کو تربیت دی گئی۔ جمعدار خوشحال سنگھ کا بیٹا رام سنگھ، گوجر سنگھ، خوشحال سنگھ کا بھتیجا تیج سنگھ، اجیت سنگھ، وینٹورا، کورٹ اور مصر سنگھ راج اور میاں اودھم سنگھ لاہور کے جرنل تھے (27)۔ اپنی حکومت کے آخری دور میں رنجیت سنگھ کا مزید یورپینوں کو ملازمت دینے سے تامل، یہ ایک ایسا نکتہ ہے کہ جس کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے علاوہ کارمائیکل اسمتھ کے ضمیمہ میں ایسے انتالیس غیر ملکی افسران کے نام آتے ہیں جن میں سے بارہ فرانسیسی، سات اینگلو انڈین، چار اطالوی، چار جرمن، تین امریکن، دو اسپینی، ایک روسی، ایک ڈچ اور صرف تین انگریز تھے۔ رنجیت سنگھ کو فرانسیسیوں پر سب سے زیادہ اعتماد تھا کیونکہ وہ ان کی اور انگریزوں کی روایتی عداوت سے پوری طرح باخبر تھا اور وہ اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتا کہ انگریز جو اس کی ملازمت میں تھے ناقابلِ اعتبار ہیں۔ انگریزی حکومت کی یہ پالیسی تھی کہ انگریزوں کا مفاد محفوظ رکھنے کے لیے وہ انگریزی رعایا کو مرہٹہ ملازمت میں زیادہ بھیجتے تھے جب کہ پنجاب میں غیر ملکی افسروں کی بھاری تعداد میں آمد کو انگریزی حکومت شبہ کی نظروں سے دیکھتی تھی۔ صرف اس لیے کہ رنجیت سنگھ قومیت دیکھ کر ہی فوجی افسروں کا انتخاب کرتا تھا کیوں کہ اکثر غیر ملکی افسر پنجاب کی ملازمت چھوڑ کر جا چکے تھے اس لیے اینگلو

سکھ جنگ کے دوران اُن کی وفاداری کا امتحان نہیں ہو سکا۔ آڑے وقت پر ساتھ چھوڑنے کی اکا دُکی وارداتوں سے ہمیں کوئی رائے قایم نہیں کرنی چاہیے۔ الارڈ، ونیٹورا، کورٹ اوتابائل مرہٹہ فوج کے اکثر یورپین افسران کی طرح مشتبہ اشخاص نہ تھے جیسا کہ جنک مونٹ کہتا ہے، مہاراجہ دوغلے چال چلن کے لوگوں کو پہچان لیتا تھا اور بڑی ہوشیاری اور سوجھ بوجھ سے ان سے نجات حاصل کر لیتا تھا۔ پھر بھی ہم وثوق سے دعویٰ نہیں کر سکتے کہ اگر رنجیت سنگھ کی زندگی میں انگریزوں اور سکھوں کے درمیان جنگ چھڑ جاتی تو وہ رنجیت سنگھ کے وفادار رہتے۔ انگریز، افغان لڑائی میں اوتابائل کا جذبہ کم از کم کسی طرح بھی حوصلہ افزا نہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ 1848ء میں ونیٹورا نے دوسری اینگلو سکھ لڑائی کے دوران سکھ سلطنت کے خلاف لڑنے کی پیش کش کی تھی (28)

سکھوں کا توپ خانہ مرہٹوں کے توپ خانہ کی نسبت بہت بہتر تھا۔ مرہٹوں کا توپ خانہ دوسری حکومتوں کے ناکارہ توپ خانوں پر مشتمل تھا۔ اور قدرتی طور پر مرہٹہ فوج کا یہ کمزور ترین پہلو تھا۔ لیکن رنجیت سنگھ نے قلعہ لاہور کے اندر ہی ایسے کارخانے بنائے تھے جن میں بندوقیں ڈھالنے کا کام ہوتا تھا۔ شہر کے ایک دوسرے حصہ شاہ ڈیرہ میں بھی یہ کام کیا جاتا تھا۔ سکھ فوج کا توپ خانہ اس کی پیادہ یا گھوڑ سوار فوج سے کہیں زیادہ تھا۔ علاوہ ازیں سندھیا اور دوسرے مرہٹہ سرداروں کے برعکس سکھوں کا ساز و سامان جنگ مختلف قسم کا نہیں تھا۔ بہر حال گھوڑ سوار اور جاگیرداری فوج کا سسٹم ایک جیسا تھا۔ مغربی تنظیم اور ضبط کے نتیجہ کے طور پر اور ہوشیار افسران کی تربیت میں سکھ سپاہ دنیا کی ایسی بہترین فوج بن جاتی اور ان پر کوئی بھی فتح نہ پا سکتا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ مغربی طرز تربیت اپنا کر مرہٹہ فوج ایک ایسا عقاب بن گئی جس کے پر کاٹ دیے گئے ہوں۔ اور جو صرف اپنے پنجوں سے انگریزوں سے لڑی تھی۔ اس کی تیزی اور عجلت مفقود ہو گئی۔ مرہٹوں کے لیے تو روایتی طریقہ ہی زیادہ مفید تھا۔ رنجیت سنگھ کی باقاعدہ فوج کے بارے میں بھی یہی رائے قایم کی جاتی ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر کہ اس کی غیر تربیت یافتہ فوج نے اہم فتوحات حاصل کیں اور اس کی باقاعدہ فوج آخر میں سلطنت پر ایسا ناقابل برداشت بوجھ بن گئی کہ اس سے وہ خود

تباہ نہ ہوئیں بلکہ سلطنت کو بھی لے ڈوبیں۔ اس لیے کچھ لوگوں کی رائے میں رنجیت سنگھ کو روایتی دستور ہی قایم رکھنا چاہیے تھا۔ اس سوال پر ہم جب فوجی نقطۂ نگاہ سے غور کرتے ہیں تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ رنجیت سنگھ نے ضرور انگریزوں کے مقابلہ کے پیش نظر تربیت یافتہ دستوں کو تنظیم دی تھی اور اس منظم فوج نے پہلی اور دوسری اینگلو سکھ لڑائیوں کے دوران اپنے وجود کو کافی حد تک مفید ثابت کیا۔ سکھ فوج نے بڑے منضبط طریقہ سے لڑائی لڑی اور انگریزوں کو ایسی بے مثال اور زبردست فوج کا سامنا کرنا پڑا جو ہندوستان میں لڑی گئی۔ اب تک کی جنگوں میں ان کے تجربہ میں یہ بات کبھی نہیں آئی تھی۔ پہلی اینگلو سکھ لڑائی میں جن سرداروں نے سکھ فوجوں کی رہبری کی تھی ان پر نااہلیت کے بھی الزام تھے۔ "پھیرو کا" لڑائی میں اپنے رہنماؤں کی غداری کے باوجود رنجیت سنگھ کے سپاہیوں نے اپنے آقا کی آن پر آنچ نہیں آنے دی۔ ناقابل فتح انگریز فوج کے سپاہی صوبیدار سیتارام نے اس قابلِ یادگار جنگ کا مندرجہ ذیل الفاظ میں بہترین نقشہ کھینچا ہے۔

"صحیح معنوں میں یہ لڑائی تھی، اس سے پہلے ایسی لڑائی کبھی نہیں دیکھی تھی، بالکل نزدیک سے ہم گولہ باری کر رہے تھے اور دشمن لگاتار ہم پر گولے برسا رہے تھے۔ پچھلی سب جنگوں میں جن میں میں نے حصہ لیا تھا، نزدیک سے ایک یا دو گولہ باریاں ہی سرکلد کے دشمن کے لیے کافی رہتی تھیں لیکن یہ سکھ گولے کا جواب گولے سے دے رہے تھے۔ جب تک وہ تقریباً ملیامیٹ نہیں ہوجاتے سپاہی ہار بالکل نہیں مانتے۔ فوجی دستے توپوں کے درمیان اور پیچھے تعینات تھے۔ ان کی گولہ باری اس قدر خوفناک تھی کہ اس سے پہلے کبھی کوئی ان کا سامنا نہیں کرسکا تھا۔ سرکار کی توپوں کو عموماً خاموش کردیا گیا۔ ہتھیاروں سے بھری بکتربند گاڑیوں کو اڑا دیا گیا۔ میں نے دیکھا کہ توپ خانہ کی گولہ باری کے دباؤ سے دو یا تین یورپین دستے پیچھے ہٹ گئے۔ برسات کا موسم تھا، ان میں بھگدڑ مچ گئی۔ ایک یورپین رجمنٹ کا صفایا ہوگیا۔ میں نے اب سوچا کہ انگریز سرکار کی فوج کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ ہم بہت خوفزدہ تھے۔ یہ واقعی بڑی خوفناک رات تھی۔ انگریز بھی میدان میں ڈٹے ہوئے تھے اور سکھوں کو بھی پیچھے دھکیلا نہیں جاسکتا تھا۔ یہ برابر کی لڑائی تھی۔" (29)

"فیروز شہر کی لڑائی کے بعد انگریز فوج کھانا پکانے میں مشغول تھی کہ اچانک رپورٹ ملی کہ سکھوں کی ساری گھوڑ سوار فوج ہم پر حملہ کرنے والی ہے اور ساتھ ہی ایک تازہ دم فوج ہماری طرف بڑھ رہی ہے۔ آخر کار لڑائی دوبارہ شروع ہو گئی۔ ہماری توپیں گولہ باری نہ کر سکیں کیونکہ سارے گولے و بارود ختم ہو چکی تھی۔ بہر حال سرکار انگریزی کا اقبال بلند تھا کہ سکھ فوج بلاوجہ پیچھے ہٹ گئی۔ ان کے پاس کافی گھوڑ سوار تھے جو ہماری فوجوں کو گھیرے میں لے کر تباہ کر سکتے تھے۔ انگریز حیران رہ گئے"۔(30)

سکھوں نے سوبراؤں کی لڑائی لڑی۔ یہ لڑائی کننگھم کے یادگار الفاظ میں "ان کی سوچی سمجھی اور بے شرم غداری پر مبنی تھی"۔ لیکن ان کی ناقابل شکست ثابت قدمی نے فاتح کو بھی حیرت میں ڈال دیا۔ یہ بات بڑے تعجب سے دیکھی گئی کہ اس لڑائی میں ایک سکھ نے بھی ہتھیار ڈال کر اپنی جان بخشی کی التجا نہیں کی۔

گجرات اور چلیانوالہ کی لڑائیوں میں سکھوں کی شکست کا باعث ان کے سپہ سالاروں کی نااہلی تھی لیکن سوبراؤں اور فیروز شہر کی جنگوں میں ان کی شکست کی وجہ جرنلوں کی نااہلیت سے زیادہ ان کی غداری تھی۔ یہ بات چنداں درست نہیں معلوم ہوتی کہ گوریلا طریقۂ جنگ جو سکھ سرداروں اور جاگیرداروں نے احمد شاہ ابدالی کے خلاف کامیابی سے اپنایا تھا، انگریزی حکومت کے خلاف بھی زیادہ موزوں رہتا اور اس کے بیان کے مطابق "یہ مہاراجہ کی دور بینی ہوتی اگر وہ اتنی توجہ اپنے روایتی طریقۂ جنگ پر دے کر فوجوں کو صحیح طور پر مضبوط بناتا جتنی توجہ اس نے یورپین طریقوں کی ترویج پر دی۔ اگر وہ یورپین نمونوں پر لاہور اور امرتسر کے چاروں طرف قلعے بنواتا اور وہاں توپیں نصب کر دیتا اور میدان جنگ میں لڑنے والے سپاہیوں کو توپ خانہ کے ہلکے پھلکے چند ہتھیاروں سے لیس کرتا(31) تو اس سے اس کی دور اندیشی ظاہر ہوتی لیکن رنجیت سنگھ کی تربیت یافتہ بٹالین کسی طرح بھی غلط نتیجہ کا نظریہ نہ تھی، جو نتیجہ لارنس نے اخذ کیا ہے۔ اس سے متفق ہونا مشکل ہے۔ ایک قابل قدر دشمن پر فتح حاصل کرنے پر انگریزی فوج کے لیڈروں کا فرض تھا کہ وہ اس تنظیمی دماغ کی تعریف کرتے جس نے شوریدہ گھوڑ سواروں کی بھیڑ کو ایک بہترین جنگ جو فوج میں بدل دیا تھا۔ فوجوں کو تربیت دینا غلطی نہیں تھی بلکہ رنجیت سنگھ کی غلطی یہ تھی کہ وہ اس جنگ کو

جو انگریزوں کے خلاف ایک نہ ایک دن لازمی طور پر پڑنی تھی، معرضِ التوا میں ڈالتا رہا۔

اشارات

1۔ باقاعدہ فوج کی یہ تفصیل خالصہ دربار ریکارڈ جلد اوّل اور حساب بنام فوج رنجیت سنگھ سے لی گئی ہے۔

2۔ ایضاً

3۔ پولیٹیکل پروسیڈنگس 24 اگست 1835ء نمبر 59

4۔ فارن ڈیپارٹمنٹ متفرق نمبر 128

5۔ خالصہ دربار ریکارڈ جلد دوم صفحہ 145

6۔ رنجیت سنگھ کی فوج (جرنل آف انڈین ہسٹری) مصنفہ سیتا رام کوہلی۔

7۔ پولیٹیکل پروسیڈنگس 22 اگست 1823ء نمبر 19

8۔ ایضاً

9۔ دی پنجاب مصنفہ سٹین بینچ صفحہ 62

10۔ میمائرز (Memoir) اپنڈکس، مصنفہ گارڈنر

11۔ پولیٹیکل پروسیڈنگس 17 دسمبر 1830ء

12۔ ایضاً 7 نومبر 1836ء

13۔ جون ہالمز نے ڈیڑھ سو روپے ماہوار پر کمانڈنٹ کی حیثیت سے ملازمت شروع کی اور بعد میں کرنل بن گیا۔ دو سال تک 1802ء مطابق 1893 میں وہ گجرات کا کلکٹر ریونیو (افسر مال) رہا۔ فہرست خالصہ دربار ریکارڈ جلد اوّل صفحہ 27

14۔ میمائرز آف الیگزینڈر، گارڈنر اپنڈکس مصنفہ پیرز

15۔ پولیٹیکل پروسیڈنگس 20 اپریل 1827ء نمبر 7

16۔ ایضاً 29 نومبر 1827ء نمبر 7

17۔ ایضاً 4 نومبر 1831ء نمبر 19

18۔ ایضاً 17 جولائی 1838ء نمبر 33

19۔ ایک افسر کی مہمات (Adventures of an officer) مصنف لارنیس۔
حالات کچھ ایسے سانچے میں ڈھالے گئے ہیں کہ اثر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یورپین افسروں نے جن دستوں کو بھی تعلیم دی وہ ہٹائے گئے اور ان کی جگہ تعلیم کے لیے دوسرے دستے آ گئے۔ اور پھر اسی طرح وہ بھی ہٹائے گئے۔ اگر یہ بیان درست ہے تو ان افسروں کی مقبولیت میں کمی کا اظہار تو ہوتا ہے مگر اس میں ان کی نامعقولیت نظر نہیں آتی۔ غالباً اس کا سبب یہ تھا کہ یورپین افسر ضابطہ کی پابندی میں زیادہ سخت تھے۔

20۔ میمائرز آف گارڈنر، صفحہ 203
21۔ جیک مونٹ صفحہ 304، کنسلٹیشن (Consultation) 29 جولائی 1831ء نمبر 415
22۔ رنجیت سنگھ کی فوج، مصنف سیتارام کوہلی و فہرست خالصہ دربار ریکارڈ جلد اوّل۔
23۔ لاہور دربار، مصنف سیٹھی۔ لاہور دربار کے بارے میں ویڈ کے تاثرات۔
24۔ ملٹری سسٹم آف مراٹھاز، باب ہفتم، مصنف مین
25۔ عمدۃ التواریخ جلد سوم صفحہ 570
26۔ ایک افسر کی مہمات جلد اوّل صفحہ 227، صفحہ 42، مصنف لارنس
27۔ فہرست خالصہ دربار ریکارڈز صفحہ 33، 38-1837ء کے فرد تنخواہ میں اوتابائل کو جرنل بتایا گیا ہے۔
28۔ ایک افسر کی مہمات مصنف لارنس۔ لارنس کے مطابق سب غیر ملکیوں نے لدھیانہ کے ساتھ خط و کتابت قائم رکھی تھی۔
29۔ From Sepoy to Subadar (سپاہی سے صوبیدار تک) مصنف سیتارام کوہلی، صفحات 98۔ 96
30۔ ایضاً
31۔ ایک افسر کی مہمات مصنف لارنس 1845ء صفحہ 237۔

دسواں باب

سکھ دربار

رنجیت سنگھ کے درباریوں کو "بہم جُولٹیروں" کے نام سے منسوب کیا گیا ہے حالانکہ ان میں سے اکثر قابل آدمی تھے جن کی وفاداری شک و شبہ سے بالاتر تھی۔

محکم چند :۔ شروع میں وہ کوئی سپاہی نہ تھا۔ اس کا باپ ایک سوداگر تھا اور وہ خود گکوں کے ڈال سنگھ اور اس کے بعد صاحب سنگھ بھنگی کے ہاں منشی گیری کرتا تھا (۱)، صاحب سنگھ سے کسی بات پر ناراض ہو کر اس نے اپنی خدمات رنجیت سنگھ کو پیش کر دیں۔ ان دنوں پنجاب میں قابل آدمیوں کے لیے ترقی کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ محکم چند اور پھر دیوان چند کے انتخاب نے اس بات کو بخوبی ثابت کر دیا کہ ایک آنکھ والا یہ سکھ حاکم قابلیت کو فوراً پرکھ لیتا تھا۔ رنجیت سنگھ کو دن رات اپنی سلطنت کو وسعت دینے کی جو دھن تھی اس میں محکم چند اس کا مددگار ثابت ہوا۔

فوجی جرنل کی حیثیت سے وہ کامیاب رہا۔ 1806ء اور 1814ء کے درمیانی عرصہ میں جو اس نے فتوحات حاصل کیں اس میں نہ صرف رنجیت سنگھ کی موقع شناسی اور ہوشیاری بلکہ محکم چند کی فوجی قابلیت کا بڑا ہاتھ تھا۔ ستلج پار کی مہموں، سیالکوٹ اور نکیئی کے علاقوں، تارا سنگھ گھیبا کے مقبوضات، کشمیر اور پنجاب کے درمیان واقع پہاڑی ریاستوں یعنی راجوری، بھمبر، کلو اور آخر میں چھچھ کے میدانوں کو فتح کرنے کا سہرا بھی محکم چند کے سر ہے۔ پھلور کے قلعہ کا انتظام قایم کرنے اور دوآب جالندھر کے اعلیٰ بندوبست کے لیے بھی رنجیت سنگھ اس قابل سپہ سالار کا مرہون منت تھا۔ اس سپہ سالار کے وسیع ذرائع کی امداد کے بغیر رنجیت سنگھ کا شاہ شجاع پر قابو پانا بھی مشکوک ہے۔ یہ بات بھی معنی خیز ہے کہ محکم چند نے کشمیر کی دوسری مہموں کی پرزور

مخالفت کی تھی۔ انجام کار وہ مہم ناکام رہی۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ محکم چند کے پوتے اور اس کی شہرت کے وارث رام دیال نے اس ناکام مہم کشمیر میں جو رائے قایم کی تھی وہ اس مہم کا سب سے زیادہ شاندار واقعہ ثابت ہوئی۔

محکم چند صرف کامیاب سپہ سالار ہی نہ تھا بلکہ وہ ایک اعلیٰ منتظم بھی تھا جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے۔ دوآب جالندھر پر اس کا بندوبست عمدہ اور مقبولِ عام تھا۔ بحیثیت گورنر وہ محکمۂ خزانہ لاہور کو باقاعدگی سے رقوم کی ادائیگی کرتا تھا۔ اس نے رعایا پر کبھی ظلم نہیں کیا۔ 1806ء سے 1814ء تک کے عرصہ میں وہ سلطنت لاہور میں اہمیت کے اعتبار سے مہاراجہ کے بعد دوسری پوزیشن کا مالک تھا۔ ستلج کے علاقوں کے سوال پر جب مہاراجہ تذبذب میں تھا کہ وہ صلح و آشتی کی پالیسی پر عمل کرے یا جنگ کرنے کے لیے ہتھیار اٹھائے تو اس وقت اس نے محکم چند کی خاص پوزیشن کا فائدہ اٹھایا۔ بذاتِ خود وہ امن و آشتی کی باتیں کرتا رہا جب کہ محکم چند لڑائی کی تیاریوں میں مصروف رہا۔ اس وقت اس نے مٹکاف کو بتایا کہ دیوان اوّل تو عمر رسیدہ ہے۔ دوسرے وہ عام طور پر سب معاملات پر حاوی ہے اس لیے اس کی ایک خاص پوزیشن ہے۔ (2) اسے قابو میں رکھنا مشکل ہے۔ بہرحال مٹکاف بخوبی جانتا تھا کہ محکم چند راجہ کے کسی ارادے میں مزاحم نہیں ہو سکتا۔

محکم چند کے بارے میں ویڈ نے بتایا ہے کہ مہاراجہ کے افسروں میں وہ پہلا شخص تھا جس نے سلطنت کو وسعت دینے کے کلّی اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے تھے (3)۔ 1814ء میں جب اس کا ستارہ عروج پر تھا، اس کا انتقال ہو گیا۔ ممنون سکھ دربار پر اداسی چھا گئی۔ وہ اپنے پیچھے اپنا بیٹا موتی رام اور دو پوتے کرپا رام اور رام دیال چھوڑ گیا جو سلطنت کے نہایت عقیدت مند کارکن ثابت ہوئے۔

دیوان چند:۔ دوسرا یہ برہمن مہاراجہ کے ہاتھ آ گیا تھا۔ 1814ء سے 1825ء تک کے درمیانی عرصہ میں فوجی اقدامات کی کامیابی کے لیے اسی افسر پر بہت حد تک انحصار کیا۔ ملتان اور کشمیر کو سر کرنے والی فوجوں کا دراصل سپہ سالار وہی تھا منکیرہ کے محاصرہ کی کامیابی کا سہرا بھی بڑی حد تک اس کے سر ہے۔ ملتان اور کشمیر کی کامیاب مہموں کے بعد اس نے رنجیت سنگھ کو صلاح دی کہ لگے ہاتھوں پشاور پر بھی

ہلہ بول دیا جائے جب سداکور کے مقبوضات کو سلطنت میں شامل کیا جا رہا تھا تو اس کے ایک آدمی نے جو اٹل کا قلعدار تھا مزاحمت کی لیکن دیوان چند نے بزور بازو قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ پاکھی اور دستور پر اس کا بندوبست ذرا کم کامیاب رہا لہٰذا اس کے بجائے ہری سنگھ کو تعینات کیا گیا۔ دیوان چند جموں اور مانگ بھی گیا اور نوشہرہ کی لڑائی میں اس نے کافی شہرت پائی۔ وہ 1814ء سے 1825ء تک صیغۂ اسلحہ کا نگراں افسر بھی رہا۔ ملتان کی فتح کے بعد اسے "ظفر جنگ" کا خطاب دیا گیا۔ فتح کشمیر کے بعد اسے فتح جنگ یا نصرت جنگ کا لقب دیا گیا۔ اسے پچاس ہزار روپے سالانہ کی جاگیر بھی عطا کی گئی (5)

5 ساون 1882ء مطابق 18 جولائی 1825ء کو ہیضہ نے اس کی جان لے لی (6)، وہ ایک قابل جرنل تھا، ایک اچھا ساتھی، فراخدل انسان اور خداداد قابلیت کا مالک تھا۔ جب مہاراجہ کو اس کے انتقال کی خبر ملی تو دربار میں صف ماتم بچھ گئی۔ اور کئی گھنٹوں تک مہاراجہ کھلے دربار میں غمگین رہا۔ اس نے اپنے درباریوں کو بتایا کہ دیوان چند کے پایہ کا کوئی دوسرا آدمی اس کی ملازمت میں نہیں ہے۔"

ہری سنگھ نلوہ :۔ ابتدا میں وہ مہاراجہ کا ذاتی نوکر تھا۔ (7) اس کی بہادری بے باکی اور طور طریق سے متاثر ہو کر اسے گورنر کا اعلیٰ عہدہ عطا کیا گیا اور اس طرح وہ پنجاب کے سب سے بڑے درباریوں میں سے ایک درباری بن گیا۔ اسے نلوہ کا خطاب (8) اس وقت دیا گیا جب اس نے ایک حملہ آور شیر کی گرفت میں ہونے کے باوجود اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ وہ فارسی لکھنا پڑھنا بھی جانتا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی پالیسیوں اور یورپ کے حالات سے بھی بخوبی باخبر رہتا تھا۔ اس لیے مہاراجہ نے انگریزی حکومت سے بات چیت کرنے کے لیے کئی بار اسے وفدوں میں بھیجا۔ لوگ اس سے خوفزدہ تھے اور اس کا احترام کرتے تھے۔ میزن کے قول کے مطابق اس کی شکل و صورت اور بے باک بات چیت رنجیت سنگھ سے ملتی جلتی تھی۔

کوکا اور کمیا باغیوں کے خلاف دیوان چند کے نائب کے طور پر چناب کی حفاظت اور بندوبست میں اور اس کے بعد پاکھی اور دستور کے ناظم کے طور پر ہری سنگھ ہر جگہ کامیاب رہا۔ کشمیر پر اس کا نظم و نسق بہترین تھا۔ اس نے کشمیر پر دو سال تک حکومت کی اور وہاں کے سکھ گورنروں میں سے قابل ترین ثابت ہوا۔ لیکن بحیثیت ڈکٹیٹر کے

مغربی سرحدی صوبہ میں جو کسی بھی سکھ عہدیدار کے لیے مشکل ترین کام تھا، ہری سنگھ نے جو اہم کردار ادا کیا وہ تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ نقش رہے گا۔ ڈاکوؤں کا بری طرح سے قمع کر دیا گیا۔ کابل کا بادشاہ خوفزدہ ہو گیا۔ اس کی فوج کی طوفانی نقل و حرکت نے شورہ پشت افغان قبائل کو دبائے رکھا۔ مغربی سرحدی صوبہ میں ہری سنگھ کا یہ ریکارڈ تھا۔ مہاراجہ اس کی کارکردگی سے بہت خوش تھا۔ ایک موقع پر اس نے کہا کہ "کسی سلطنت پر حکومت کرنے کے لیے تم جیسے آدمیوں کا ہونا ضروری ہے (۹)۔ جب ایران کے عباس مرزا نے موہن لال سے ایک بار پوچھا کہ کیا ضبط اور جرأت میں سکھ فوج کا مقابلہ اس کی فوج سے کیا جا سکتا ہے تو موہن لال نے جواب دیا کہ اگر کہیں ہری سنگھ نلوہ نے سندھ پار کر لیا تو اعلیٰ حضرت اپنی اصلی سلطنت تبریز جلد از جلد واپس لوٹ جانے میں خوشی محسوس کریں گے۔ یہ جواب صاف طور پر ثابت کرتا ہے کہ مغربی سرحد پر ہری سنگھ کی چھاپ پڑ چکی تھی (۱۰)۔

ہری سنگھ کو ایسی جاگیر عطا کی گئی جس کی سالانہ آمدنی تین لاکھ 67 ہزار روپے تھی۔ اس کا بیٹا اتنا قابل نہ تھا اس لیے اس کو ایک معمولی ملازمت دی گئی اور حاکم لاہور نے ہری سنگھ کی جمع کردہ کثیر دولت کو ضبط کر لیا۔ لیکن اس کے لیے ہم رنجیت سنگھ کو احسان فراموش قرار نہیں دے سکتے۔ بیشک ہری سنگھ بہت ہی معتمد اور قابل افسر تھا لیکن مالی معاملات میں وہ ہمیشہ ایماندار نہ تھا۔ معتبر ذرائع سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ وہ دربار کو وقتاً فوقتاً اپنے حملوں کی رپورٹیں بھیجتا رہتا تھا۔ لیکن دراصل ان میں سے کچھ لڑائیاں فرضی ہوتی تھیں اور اس طرح اس نے کئی رقمیں ہڑپ کر لیں۔ ایک موقع پر جب مہاراجہ ہری سنگھ کی فوج کا معائنہ کر رہا تھا تو اس نے سپاہیوں کو مقررہ تعداد سے کم پایا۔ حالانکہ ہری سنگھ پورے سپاہیوں کے حساب سے رقم خزانہ سے وصول کر رہا تھا۔ لہٰذا اس پر بھاری جرمانہ کیا گیا (۱۱) لیکن اس کے ساتھ ہری سنگھ کے حق میں اس کا رویہ اس دور کے طور طریقوں ... کے مطابق ہی تھا۔ اور ان سب خامیوں کے باوجود وہ بہت ہی وفادار اور معتمد ملازم تھا اور ہر لحاظ سے رنجیت سنگھ کے دیگر کارندوں سے وہ بہت ہی آگے تھا۔ جب مہاراجہ نے ہری سنگھ کی وفات کی خبر سنی تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس کے آنسو اس کے پرخلوص جذبات کے مظہر تھے اور جب اس نے اس مرحوم سکھ گورنر کو ایک عظیم "نمک حلال (۱۲)" کہا تو واقعی یہ لقب

ہر لحاظ سے موزوں تھا۔

جمرود میں ہری سنگھ کی موت کی جو تفصیل ویڈ نے دی ہے وہ موت کے وقت بھی اس سپاہی کی مستحکم جرأت کی آئینہ دار ہے۔ اسے چار کاری زخم لگے۔ اس کی چھاتی پر خنجر کے دو زخم آر پار ہو گئے۔ ایک تیر اس کے سینہ میں چبھ گیا تھا جو اس نے خود ہی اپنے ہاتھ سے نکالا۔ جب تک ایک گولہ اسے اس قدر گھائل نہ کر دے کہ وہ بے ہوش ہو جائے، ہری سنگھ فوج کو ہدایتیں دیتا رہا۔ میدانِ جنگ سے اٹھا کر جب وہ قلعہ میں لایا گیا تو اس کی موت واقع ہو گئی۔ مرتے وقت اس نے یہ وصیت کی کہ جب تک مہاراجہ کی طرف سے اطلاع نہ آئے اس کی وفات کی خبر کو صیغۂ راز میں رکھا جائے۔(13)

خوش حال سنگھ :۔ شروع میں وہ بہت معمولی نوکر تھا بعد میں دھونکل سنگھ کے دستہ میں پانچ روپے ماہوار پر سپاہیوں میں بھرتی ہوا۔ اس کے بعد جمعدار اور پھر لیفٹیننٹ ہو گیا۔ اس کے بعد وہ ڈیوڑھی والا یعنی نگران محل کے عہدہ پر مامور ہوا۔(14) لیکن اسے اس عہدۂ جلیلہ سے ہٹا کر دھیان سنگھ کو تعینات کیا گیا۔ اور خوش حال سنگھ مہاراجہ کا مصاحب بنا رہا۔ یہ کہانی اس شخص کی ہے جو یکے بعد دیگرے ترقی کی منزلیں طے کرتا رہا لیکن افسوس وہ اس کا اہل نہ رہا اور صحیح معنوں میں اسے غاصب کہا جا سکتا ہے۔ اس کا اصلی نام خوش حال سنگھ رام تھا۔ وہ ایک گوڑ برہمن تھا۔ مہاراجہ نے اس کو 'پاہول' دیا اور وعدہ کیا کہ وہ اسے اس رتبہ سے کبھی نہیں ہٹائے گا۔ یہ بات قابلِ یقین معلوم ہوتی ہے کہ باوجود ظاہری خامیوں کے بھی مہاراجہ اس پر کیوں مہربان تھا۔ زندگی کے آخری ایام میں اس کے پاس جو جاگیر تھی شہامت علی کے اندازے کے مطابق اس کی چار لاکھ دو ہزار چھ سو ستر روپے کی سالانہ آمدنی تھی۔(16) دیوان چند کی سفارش پر اس کو ڈیوڑھی کی نوکری سے برخواست کر دیا گیا۔ اور دھیان سنگھ کو مامور کیا گیا۔ اور جلد ہی وہ مہاراجہ کے خاص ارکین میں شامل ہو گیا تاہم ڈیوڑھی والا عہدہ اسے پھر نہ مل سکا۔

اکثر فوجی مہموں میں اس نے دوسروں کے ساتھ مل کر لڑائیاں لڑیں۔ اس لیے اس میں سپہ سالار کی خوبیوں کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ ڈیرہ غازی خان کی فتح اس کی ایک بڑی فوجی مہم تھی لیکن بطور ناظم وہ ناکام رہا۔ کشمیر میں اس کے بندوبست

کی کارکردگی تاریک ترین تھی۔ بھائی گورومکھ سنگھ اور شیخ غلام محی الدین کے ساتھ مل کر کشمیر میں بھاری قحط کے دوران بھی وہ لوگوں کی کھال اتارتا رہا۔ اس کے لیے مہاراجہ نے اسے لعنت ملامت کی۔ جمعدار نے خزانہ میں تین لاکھ روپے نقد اور پانچ لاکھ کی قیمت کا پشمینہ داخل کیا۔ اس کے علاوہ خوش حال سنگھ نے اپنی جیبیں بھی خوب بھریں۔ اس سلسلہ میں رنجیت سنگھ نے ایک بار کھلے دربار میں اعلان کیا کہ ایسے قصور وار کی جائیداد ضبط کر لینی چاہیے۔ (۱۷) ایک اور موقع پر ساون مل نے کیپٹن ویڈ کے پاس کئی بار سفارشی خطوط بھیجے تو جمعدار (خوش حال سنگھ) نے ایک غیر ملکی ایجنٹ کے سفارشی خطوط کے خلاف احتجاج کیا۔ رنجیت سنگھ نے بے ساختہ جواب دیا کہ جمعدار سے سفارشی خط حاصل کرنے کے لیے تو رشوت ضروری ہے مگر کیپٹن ویڈ سے نہیں۔ خوش حال سنگھ بات چیت اور تقریروں میں بھی بے پر کی ہانکتا تھا۔ ایک بار وساسنگھ سے اس کا جھگڑا ہو گیا۔ دونوں کے رفیقوں کے درمیان کھلم کھلا لڑائی ہونے لگی۔ جب یہ خبر مہاراجہ کے کانوں تک پہنچی تو اس نے خوش حال سنگھ کو پھٹکارا کہ اس نے اپنی غلط فہمی کے بارے میں اسے (مہاراجہ) پہلے کیوں نہیں بتایا۔ خوش حال سنگھ نے جواب دیا کہ وہ مہاراجہ کو بتائے بغیر بہت سے کام کر لیا کرتا ہے۔ اس پر مہاراجہ کو بہت غصہ آیا اور اس نے کہا کہ ایسا کام کرنے والوں کو ڈوب مرنا چاہیئے (۱۹) اس پر جمعدار معافی کا خواستگار ہوا اور مہاراجہ نے اسے معاف کر دیا۔

ان واقعات سے ظاہر ہے کہ مہاراجہ خوش حال سنگھ کی اصلی قدر و قیمت جانتا تھا۔ اس کے باوجود لاہور دربار میں خوش حال سنگھ بہت ذی اقتدار مانا جاتا تھا۔ 1839ء میں اس کا نام بھی ان سکھ سرداروں میں تھا جن کو پہلی افغان جنگ میں انگریزوں کو تعاون دینے کے لیے منتخب کر لیا گیا تھا۔ اس کا بیٹا اور بھتیجہ دونوں سکھ فوج میں سپہ سالار تھے۔

جموں برادران: ۔ گلاب سنگھ، دھیان سنگھ، اور سُچیت سنگھ تینوں کشور سنگھ کے فرزند اور زور آور سنگھ کے پوتے تھے۔ ان کا دادا بھائی میاں موٹا 1808ء میں جموں کا ناظم تھا۔ وہ زور آور سنگھ کا بڑا بھائی تھا۔ اگر گلاب نامہ پر یقین کیا جائے تو گلاب سنگھ اپنے دادا سے ناراض ہو کر شاہ شجاع سے مل جانے کو تیار ہو گیا تھا۔ لیکن اسے

اپنا یہ ارادہ ترک کرنا پڑا۔ رنجیت سنگھ جس نے گلاب سنگھ کی سوجھ بوجھ اور صلاحیت کے بارے میں سُن رکھا تھا۔ اسے اپنے پاس بلا بھیجا۔ اس طرح گلاب سنگھ سکھ حکمران کی ملازمت میں آگیا۔ بعد ازاں وہ اپنے چھوٹے بھائیوں کو بھی لے آیا۔ 1816ء میں میاں گلاب سنگھ جاموال 'جاموال سواریاں' نامی ایک چھوٹے سے گھوڑ سوار دستے کا کمانڈر بن گیا۔ ستمبر 1871ء کے آخر تک کی فہرستوں میں جاموال گھوڑ سوار دستہ کے ساتھ اس کا نام پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے بھائی دھیان سنگھ کا نام بھی ملتا ہے جس کو تین روپے روزانہ کی ادائیگی (20) دکھائی گئی ہے۔ وہ بہت تیزی سے ترقی کر گئے۔ جموں برادران بڑے سلجھے ہوئے درباری تھے۔ تینوں کا مقصد مشترک تھا۔ دھیان سنگھ مہاراجہ کو ایسا پسند آیا کہ اسے خوش حال کی بجائے 'ڈیوڑھی والا' کے عہدہ پر فائز کر دیا۔ تینوں بھائیوں کو راجہ بنا دیا گیا (21)۔ گلاب سنگھ جموں کا، دھیان سنگھ کو بھمبھر اور کُسال کا اور سچیت سنگھ کو رام نگر کا۔ گلاب سنگھ دربار سے دور اپنی ریاست جموں ہی میں رہتا تھا لہذا وہ خود مختار سا تھا۔ لاہور میں باقی دو بھائیوں کی موجودگی سے ان کے مشترکہ مفاد محفوظ تھے۔ دھیان سنگھ کے بیٹے ہیرا سنگھ کو مہاراجہ بہت چاہتے تھے۔ اس بات نے ان کے حصولِ اقتدار اور رتبہ و دولت کے مقصد کو مزید تقویت پہنچائی۔

مہاراجہ کے دورِ حکومت کے آخری سالوں میں برادرانِ جموں لاہور دربار میں سب سے زیادہ مقتدر اور بارسوخ مانے جاتے تھے۔ درحقیقت دھیان سنگھ کو وزیر اعظم کے نام سے منسوب کیا جاسکتا ہے کیونکہ کسی بھی عرضداشت یا درخواست گزارنے کا وہی ایک ذریعہ ہے۔ یہاں تک کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے گھر میں بھی چھوٹے پیمانے پر دربار لگایا کرتا تھا اور چھوٹے موٹے معاملات کو بذاتِ خود ہی نمٹا دیتا تھا۔ مہاراجہ کے حضور میں صرف ضروری معاملات ہی پیش ہوتے تھے (22)۔ جیک مونٹ نے گلاب سنگھ کے بارے میں بتایا ہے کہ وہ قسمت کا دھنی سپاہی تھا اور میدانِ جنگ میں شیر ببر۔ گلاب سنگھ بہت ہی خوش اطوار تھا (23)۔ کلکتہ ریویو کے ایک پرچہ میں دھیان سنگھ کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ کئی معاملات میں خود سر و خود مختار تھا اور بے باکی کا مظاہرہ کرتا تھا مگر کچھ معاملات میں وہ کھلے طور پر ظالم نہ سہی جابر ضرور تھا۔ (24)

بہر حال یہ تینوں بھائی حیلہ سازی اور گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے میں ماہر تھے اور ان تینوں کا گٹھ جوڑ۔ دھیان سنگھ ناظم دیوانی معاملات، سچیت سنگھ سپاہی اور گلاب سنگھ مجموعۂ ہر دو صفات ۔ واقعی بے مثال تھا۔ رنجیت سنگھ کے آخری دور میں ان کا بول بالا تھا۔ اور کوئی بھی ان سے ٹکر نہیں لے سکتا تھا۔

یہ جموں برادران انگریز دشمن تھے جیسا کہ کین (Cane) لکھتا ہے' یورپین لوگوں سے وہ کھنچے کھنچے رہتے تھے اور ان سے سرد مہری سے پیش آتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ سلطنت میں کسی اور خاندان کا رنجیت سنگھ پر اتنا اثر و رسوخ نہ تھا جتنا کہ ان بھائیوں کا۔ میزن کا یہ دعویٰ ہے کہ باوجود اس بات کے کہ مہاراجہ کو یہ سب کچھ ناپسند تھا وہ اپنی غلطی کو ماننے کو کبھی تیار نہیں ہوا۔ عموماً یہ وثوق سے کہا جاتا ہے کہ مہاراجہ ان تینوں کو گرفتار کر لینا چاہتا تھا مگر وہ بھی چالاک تھے۔ ایک ساتھ ایک ہی وقت میں وہ کبھی دربار میں نہیں آتے تھے (25) عملی طور پر ان جموں برادران نے پہاڑی علاقوں میں اپنی پوزیشن بہت مستحکم بنا رکھی تھی۔ مہاراجہ کے انتقال کے بعد غالباً جموں و دیگر پہاڑی علاقوں پر اپنی مطلق العنان حکومت قائم کرنے کی امید کرتے تھے اور اس کے ساتھ ہی انگریزوں اور دیگر غیر ملکیوں کی مخالف پارٹی کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے تھے۔ یہ امر ناقابلِ یقین ہے کہ موجودہ حالات میں وہ رنجیت سنگھ کے خاندان کو نیست و نابود کرنے کے خواہاں تھے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ سید بھائیوں یا پیشواؤں کی طرح وہ رنجیت سنگھ کے بعد ان راجاؤں کو تخت نشین کرنا چاہیں جو ان کے ہاتھ میں کٹھ پتلی ہوں۔ برنز تو یہاں تک لکھتا ہے کہ دھیان سنگھ نے بھمبر میں اپنے گھر کی قلعہ بندی کی اور لاہور سے توپیں منگوا کر قلعہ بندی کو مضبوط کیا اور یہ بات مہاراجہ کے کان میں ڈالنے کی ہمت کسی کو نہ ہوئی۔ (26)

گلاب سنگھ جو کچھ جموں اور گرد و نواح کے پہاڑی علاقوں میں کر رہا تھا بعینہٖ وہی ملتان میں ساون مل کر رہا تھا۔ شاہی اقتدار کے مرکز سے کافی دور ہونے کے باعث ملتان میں وہ اپنی پوزیشن مستحکم بناتا رہا۔ جہاں ڈوگرا پارٹی قوم پرست تھی اور غیر ملکیوں کے خلاف تھی وہاں ساون مل انگریزوں کا حامی تھا کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ انگریزوں سے معاہدہ کے باعث مہاراجہ ان کی گرفت میں ہوگا۔ لدھیانہ سے

وینڈا ور بھاول پور سے میکیسن (27) ساون مل کے حق میں مہاراجہ کے پاس خط بھیجا کرتے تھے۔ البتہ دربار میں اس کی پوزیشن مقابلتاً کمزور تھی کیوں کہ گلاب سنگھ کی حمایت کرنے کے لیے لاہور دربار میں اس کے چھوٹے بھائی موجود تھے۔ ساون مل اکیلا تھا۔ ان حالات کے تحت جموں کے انگریز دشمن ڈوگرہ گورنر اور ملتان کے انگریز پرست گورنر کے درمیان پیار و الفت کا کوئی رابطہ نہ تھا۔

1830ء سے 1840ء کے درمیانی کچھ عرصہ تک گلاب سنگھ ساون مل اور اُن کے رفیقوں کے درمیان اکثر فساد ہوتے رہے۔ مہاراجہ کے مشورے پر خوش حال سنگھ، رام سنگھ، عزیزالدین اور دوسرے لوگوں نے بیچ میں پڑ کر دونوں کے درمیان بظاہر صلح صفائی کرا دی۔ (28) اگرچہ مہاراجہ پر دھیان سنگھ کا بھاری اثر و رسوخ تھا تاہم ساون مل کے اقتدار میں کمی نہیں آئی اور قدرتی طور پر مہاراجا اسے توازن قایم رکھنے کا مُہرہ سمجھتا تھا جیسا کہ بعد کی پنجاب کی تاریخ سے ظاہر ہے کہ رنجیت سنگھ کے رشتہ دار اور دوسرے درجہ کے جاگیردار سیندھیا نوالان نے ڈوگروں کے خلاف یہ توازن قایم رکھا۔

عزیزالدّین:۔ رنجیت سنگھ کے عہدِ حکومت میں عزیزالدّین نے اپنے برادران امام الدین اور نورالدین کی معیت میں بہت اہم کردار نبھایا۔ ان کا عروج اس بات کا ثبوت ہے کہ رنجیت سنگھ مذہبی رجعت پسندی اور تفریق سے بالاتر تھا۔ یہ برادران انصاری بخاری سیّد تھے۔ (29)

عزیزالدین نے سکھ حکمران کے طبیب کی حیثیت سے کام شروع کیا جن دنوں رنجیت سنگھ نے لاہور پر قبضہ کیا تھا عزیزالدّین لاہور کے بلند مرتبہ طبیب حاکم رائے کا شاگرد تھا۔ رنجیت سنگھ نے اسے بہترین صلاح کار پایا اور اسے ایک ایسے عہدہ پر مامور کیا۔ عملی طور پر وہ وزیر خارجہ کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ باہمی بات چیت کے ذریعہ پیچیدہ مسائل حل کرنے میں اسے کمال حاصل تھا۔ علم و ادب میں اس کی دلچسپی اور مشورے بے مثل تھے۔ وہ مہاراجہ کے سکرٹری کا کام بھی کرتا تھا۔ مہاراجہ کے الفاظ کو سمجھنے میں بڑی مشکل پیش آتی تھی۔ خصوصاً اس کی زبان میں لکنت آ جانے کے باعث عزیزالدین سے بہتر کوئی اور شخص یہ کام نہیں کر سکتا تھا۔

وہ اپنے آپ کو فقیر کہتا تھا اور فقیر کا لباس ہی اس نے اختیار کر لیا۔ حکومت کے آخری دور میں سکھ دربار سازشوں کا اڈہ بن گیا مگر عزیز الدین اپنے فقیرانہ لباس کو زرہ بکتر سمجھتا تھا۔ سیاسیات میں وہ ڈرپوک تھا۔ ڈپلومیٹ یعنی سفیر کی حیثیت سے رنجیت سنگھ نے اسے انگریزی سفارت خانوں پر مامور کیا اور اس طرح وہ برٹش راج کے نمائندوں کے ساتھ بات چیت کرنے میں واسطہ بنتا تھا۔ جب دوست محمد جہاد کا نعرہ لگاتے ہوئے رنجیت سنگھ کے خلاف نبرد آزما ہونے آیا اس وقت عزیز الدین کی بدولت ہی اس کے بھائیوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا اور انجام کار دوست محمد بغیر حملہ کئے واپس بھاگ جانے پر مجبور ہو گیا۔ بطور سفیر عزیز الدین کی یہ عظیم ترین کامیابی تھی۔

رنجیت سنگھ سے اس کو ذاتی طور پر گہرا انس تھا۔ رنجیت سنگھ پر لقوہ کا حملہ ہوا تو فقیر نے اس کی دیکھ بھال میں دن رات ایک کر دیا۔ مگریگر (Megregor M.) کہتا ہے "اگر رنجیت سنگھ اس کا باپ ہوتا تو بھی فقیر مقابلتاً اس سے زیادہ اس کی خدمت نہ کرتا"۔ لیپل گرفن (Lepel Griffin) نے اس کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ رنجیت سنگھ کے سارے دربار کے قابل ترین اشخاص میں سے ایک تھا اور یقیناً سب سے زیادہ ایماندار تھا۔

اس کے بھائی نور الدین اور امام الدین بھی مہاراجہ کے معتبرین میں سے تھے۔ نور الدین رفاہِ عام، توپ خانہ، عام نگرانی کے معاملات پر مقرر تھا۔ (۳۰) امام الدین سکھوں کے اہم ترین قلعہ گوبند گڑھ کا نگران اور گرد و نواح کے علاقوں کا گورنر تھا۔

رنجیت سنگھ کی وفات کے بعد اگر صاحب اقتدار مسلمان افسران چاہتے تو دربار ڈوگرہ، جموں برادران اور سندھیا والان ان تینوں پارٹیوں کے علاوہ اپنی ایک الگ پارٹی قائم کر سکتے تھے۔ اس مسلمان دھڑے کو فقیر برادران کی جماعت، توپ خانہ کے مسلمان افسروں کی امداد اور پنجاب کے مسلمانوں سے کافی تقویت مل سکتی تھی مگر حالات نے ثابت کر دیا کہ عزیز الدین اور اس کے چھوٹے بھائیوں کی ایمانداری اور وفاداری بے لوث تھی۔ اور جو بھروسہ رنجیت سنگھ کو ان کی ذات پر تھا اس کا غلط استعمال انہوں نے کبھی نہیں کیا۔ ہونیگ برجر (Honigberger) کا بیان ہے کہ فقیر عزیز الدین وزیر اعظم دھیان سنگھ اور دینا ناتھ اور وزیر مالیات رنجیت

سنگھ کے دور حکومت کے آخری سالوں میں پریوی کونسل کے رُکن بنے۔

ان لوگوں کے علاوہ جن کا ذکر ہوا، رنجیت سنگھ کے ماتحت کچھ اور اہم ہستیاں بھی تھیں۔ ان میں بھوانی داس، گنگا رام، دینا ناتھ اور بیلی رام تھے۔ مؤخر الذکر توشہ خانہ کا نگران تھا۔ اس نے اپنے بھائیوں، روپ لال، میگھ راج، رام کشن اور سکھ راج کا تقرّر اعلیٰ عہدوں پر کرایا۔ ملکی سیاسیات اور درباری سازشوں میں وہ جموّں برادران کا مخالف تھا۔ بھوانی داس شاہ شجاع کا سابق افسر مال تھا۔ 1808ء میں وہ پنجاب آیا تھا اور اس نے دفتر تنخواہ اور دفتر مالیات کی از سرِ نو تنظیم کی تھی۔ گنگا رام قبل ازیں مہاراجہ گوالیار کے ہاں ایک ملازم تھا۔ اسے فوجی دفتر کا سربراہ مقرّر کیا گیا تھا۔ شاہی مہر (Privy Seal) بھی اس کے قبضہ میں رہتی تھی۔ اس کی وفات کے بعد گنگا رام کے بھتیجے دینا ناتھ کو شاہی مہر کا نگران مقرّر کیا گیا۔ بھوانی داس کے انتقال کے بعد دینا ناتھ کو مالی اور دیوانی دفتروں کا سربراہ بنا دیا گیا۔ جالندھر دوآب کا گورنر دلیسا سنگھ مجیٹھیہ بھی ایک اہم شخصیت تھی۔

کننگھم کہتا ہے کہ دیگر مطلق العنان حاکموں کی طرح رنجیت سنگھ پر بھی یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ اس نے اپنے حواریوں پر ہر جائز و ناجائز طریقے سے مہربانیوں کے خزانے لٹا دیے۔ لیکن اسی لمحہ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ رنجیت سنگھ کبھی کسی دوسرے کے آگے نہ جھکا۔ یہ حقیقت ہے کہ انگریز دشمن ڈوگروں کا رسوخ بھی اس کی انگریز نواز پالیسی پر اثر انداز نہ ہو سکا اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ درباری حکومت کی پالیسی معیّن نہیں کرتا تھا۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ پالیسی معاملات میں کوئی بھی منہ لگا حبیب مخلصہ کام کرنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ ڈوگرہ برادران کی ساون مل کے ساتھ عداوت نے مہاراجہ کے تعلقات پر اثر ڈالا۔

رنجیت سنگھ کے دربار کی مشہور ہستیوں کے ناموں کا یہ سطحی جائزہ پورے طور پر ثابت کرتا ہے کہ مہاراجہ فرقہ وارانہ تنگ نظری سے بالاتر تھا۔ محکم چند، دیوان چند، عزیز الدین اور اس کے بھائی ہری سنگھ، ساون مل سب بہت قابل تھے۔ دونوں بڑے ڈوگرہ بھائی بھی بڑی قابلیت کے مالک تھے۔ البتہ دیوان چند اور محکم چند کی طرح وہ ایماندار نہ تھے۔ جہاں تک ڈوگرہ برادران کا تعلق تھا رنجیت سنگھ ان پر پوری نگرانی

نہ کرسکا جس کا اسے خمیازہ بھگتنا پڑا۔ ان کے بہت زیادہ متعصبانہ رسوخ کی وجہ سے انجام کار مہاراجہ کے بیٹوں کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔

کننگھم کا دعویٰ ہے کہ رنجیت سنگھ کسی حد تک عوام کا مخالف تھا۔ کیونکہ اجنبی لوگوں کو اپنی ملازمت میں لینے کا متمنی رہتا تھا۔ جو مقابلتاً کم ایماندار ہوتے ہوئے بھی مہاراجہ کی تعریف و تحسین کے لیے موقعہ کی تلاش میں رہتے تھے۔ (32) لیکن جیسا کہ پچھلے ابواب میں بتایا جا چکا ہے کہ اس زمانے میں ان حالات کے تحت رنجیت سنگھ کا نظم و نسق حتی الامکان ہر دلعزیز ملوکیت کے قریب ترین تھا۔ اس بات کو بالائے طاق رکھ کر اس نے اپنے ذاتی توہمات کی بنا پر بھی کچھ من پسند درباری بنا رکھے تھے۔ ہمیں اس کی پالیسی سے متعلق ایک بات پر غور کرنا چاہیے کہ رنجیت سنگھ کے برسر اقتدار آنے کے بہت پہلے سے ہی پنجاب میں ہر وہ چیز جو تہذیب و شائستگی کا آئینہ دار تھی ناپید ہو چکی تھی۔ لہٰذا بدنظمی کا قلع قمع کرنے اور باقاعدہ بند و بست قایم کرنے کی کوشش میں باہر کے لوگوں پر نظر ڈالنی پڑی کیونکہ اس وقت پنجاب میں سب کچھ تھا لیکن باصلاحیت اور بالیاقت لوگ نام کو نہ تھے۔

عمدۃ التواریخ نے لاہور دربار کی بڑی صاف اور واضح تصویر کھینچی ہے۔ اس کا غور سے مطالعہ کرنے والے مہاراجہ کو اپنے دربار میں، اپنی کونسل میں اور بات چیت کرتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں۔ نوعمری کے زمانے میں مہاراجہ کو درباری قواعد کی شاید کسی قسم کی تربیت نہیں دی گئی تھی۔ اس کا حوالہ دیتے ہوئے مٹکاف نے ۱۸۰۹ء میں لکھا ہے کہ درباری اپنے آقا کے سامنے بہادری کے جوہر اور ہوشیاری کا کمال دکھانے کے لیے اس قدر جوش میں آجاتے تھے کہ دربار میں گڑبڑ پیدا ہو جاتی تھی۔ لیکن 1827ء میں ویڈ نے دربار کا مختلف نقشہ کھینچا ہے۔ سارا دربار نظم و نسق کا نمونہ تھا۔ سب سردار مہاراجہ کا احترام کرتے تھے اور ایک دوسرے کو بھی حیثیت رتبہ و درجہ عزت دیتے تھے کسی قسم کی افراتفری نہ تھی۔ ہر شخص اپنی پوزیشن اور مقام سے بخوبی واقف تھا۔ ۱۸۰۹ء یا 1827ء میں کوئی بھی ذی ہوش شخص جسے دربار میں جانے کا موقعہ ملا یہ بات آسانی سے سمجھ سکتا تھا کہ مہاراجہ اپنے منصوبوں کو عموماً اس وقت ہی زبان پر لاتا تھا جب ان کی تعمیل و تکمیل ممکن ہوتی تھی۔ عمر کے آخری دور اور جسمانی کمزوری کے

دوران ان کے بارے میں یہ بیان درست اور صحیح ہے۔

اشارات

۱۔ پنجاب چیفس مصنفہ لیپل گرفن جلد اوّل صفحہ 202
2۔ (Sec. Cons) 13 مارچ 1809ء نمبر 45
3۔ پنجاب اور اس کے ملحقہ صوبے، مصنفہ ویڈ (At the Punjab and Adjacent provinces)
۴۔ رنجیت سنگھ کی فوج (خالصہ دربار ریکارڈ کی فہرست، مصنفہ کوہلی جلد اوّل
5۔ عمدۃ التواریخ۔ صفحہ 264
6۔ رنجیت سنگھ کے دربار کی تحریر۔ 1845ء
۷۔ سکھ اور افغان، مصنفہ شہامت علی، صفحہ 53
8۔ ٹریولز مصنفہ ہیوجل "اس کی بات چیت سے
۹۔ عمدۃ التواریخ جلد سوم صفحہ ۱۴۰
۱۰۔ ٹریولز مصنفہ موہن لال۔ سوانح (Calcutta Observer) کلکتہ آبزرور میں شائع ہو چکے ہیں۔
۱۱۔ عمدۃ التواریخ جلد دوم صفحہ 397
12۔ ایضاً جلد سوم صفحہ 395
13۔ ویڈ بنام میکناٹن 13 مئی 1837ء لاہور دربار، مصنفہ سیتھی نے صفحہ ۲۹۹ میں اس کا حوالہ دیا ہے۔
۱۴۔ ٹریولز مصنفہ ہیوجل صفحہ 287 "سکھ اور افغان" مصنفہ شہامت علی
15۔ نمبر 15، صفحات 29-28
16۔ ایضاً
۱۷۔ عمدۃ التواریخ جلد سوم صفحہ ۱۷۹
۱8۔ ایضاً صفحہ 313
۱۹۔ ایضاً صفحہ 340

20. کیٹلاگ اور خالصہ دربار ریکارڈ کی فہرست جلد دوم صفحہ 50
21. کارمائیکل اسمتھ صفحہ 256
22. شہامت علی صفحہ 26
23. ٹریولز مصنفہ جیک مونٹ
24. کلکتہ ریویو 1844ء
25. ٹریولز مصنفہ میزن
26. برنز جلد اوّل صفحات 88-287
27. عمدۃ التواریخ جلد سوم صفحات 254-991-313
28. ایضاً صفحات 254-436
29. پنجاب چیفس مصنفہ لیپل گرفن جلد اوّل صفحہ 97
30. عمدۃ التواریخ جلد دوم صفحہ 254
31. کننگھم صفحہ 178
32. ایضاً

گیارھواں باب

شخصیت اور تاریخ میں مقام

دربار میں ہو یا کیمپ میں، رنجیت سنگھ کا مطالعہ ہمیشہ پُرکشش موضوع رہا ہے۔ دماغی اور جسمانی سرگرمی اس کے کیریکٹر کا اہم حصہ تھی۔ اَن پڑھ ہوتے ہوئے بھی وہ عملی سوجھ بوجھ کا مجسمہ تھا۔ یہ بلند حوصلہ اور مطلق العنان شخص بڑا مضبوط اور ٹھوس آدمی تھا حالانکہ اس کے بارے میں بہت سے واقعات مشہور ہیں تاہم کوئی واقعہ افسانہ نہیں بن سکا۔

رنجیت سنگھ میں بظاہر بہت سی خامیاں تھیں لیکن اس کی ذہنی ساخت سے تجسس، غیر معمولی ذہانت اور دانشمندی کا اظہار ہوتا تھا۔ پکی عمر میں اس کے برتاؤ میں اعتدال اور پختگی نہ ہوتے ہوئے بھی قابلِ تعریف تحمّل اور ضبط کا مادّہ پایا جاتا تھا باوجودیکہ وہ اَن پڑھ تھا لیکن اپنے باکمال سکریٹری کی زبان اور طرزِ تحریر کو سدھارنے کے لیے ان پر باریک بینی سے تنقید کرتا تھا۔ اپنے سکریٹری فقیر عزیزالدین کی مرصّع فارسی زبان میں تحریر کیے گئے خطوط کی وہ کھلے دربار میں اصلاح کر دیتا تھا۔ بذاتِ خود اَن پڑھ ہوتے ہوئے بھی وہ علما کی قدر کیا کرتا تھا۔ پشاور کی مہم کے وقت مورّخ میزن کے قول کے مطابق اس نے سخت احکامات جاری کیے تھے کہ چکنی کے مسلمان فقیر کی ضخیم لائبریری کی پوری حفاظت کی جائے۔ کاروباری معاملات میں عموماً سنجیدہ ہوتے ہوئے بھی بھرے دربار میں ناچنے والی لڑکیوں سے مذاق کیا کرتا تھا۔ یہ بات کسی بھی حکمران کے شایانِ شان نہیں۔ سکھ مذہب کا پیروکار ہونے کے ناطے عبادت کے لیے امرتسر جاتا تھا۔ برہمنوں کا احترام کرتا تھا۔ کئی مسلمان بزرگوں کے مزاروں کا

زیارت کرتا تھا۔ اہم معاملات کو بذاتِ خود عملی طور پر نمٹانا اس کی عادت تھی لیکن کبھی کبھی نمائشی طور پر اپنے درباریوں سے صلاح ومشورہ کرنے کا ڈھونگ بھی رچایا کرتا تھا۔

جیک مونٹ بتاتا ہے کہ اس عظیم حکمران کو اپنی سلطنت کے دس بارہ ہزار گاؤں کے نام محل وقوع اور اس کی کیفیت سب زبانی یاد تھیں۔ ستلج میں جہاز رانی کی شروعات کے بارے میں ویڈ سے بات چیت کے دوران رنجیت سنگھ نے بذاتِ خود ستلج کے دائیں کنارے پر واقع ہری کے پتن سے لے کر مٹھن کوٹ تک مختلف اضلاع مقامی افسران کے نام اور ان اضلاع میں مامور فوج کی تعداد کی تفصیل زبانی بتادی۔ جس کمال کا اس نے یہ مظاہرہ کیا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بندوبست کرنے کے لیے اپنی ذات پر وہ بہت انحصار رکھتا تھا۔ وہ ہر معاملہ کی تفصیل سے واقف تھا اور باریک سے باریک نکتوں پر وہ رائے زنی کرتا تھا۔ تجسس کا مادّہ اس میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا اور جیک مونٹ جیسے عالمانہ صلاحیت رکھنے والے کے لیے بھی اس سے بات چیت کرنا خوفناک تھا۔ جیک مونٹ سے بات چیت کرنے کے دوران رنجیت سنگھ نے ہندوستان، انگریز، یورپ، بوناپارٹ، یہ دنیا، دوسری دنیا، بہشت، دوزخ، خدا، روح، شیطان وغیرہ بے شمار مسئلوں پر ہزاروں سوالوں کی بوچھار کردی۔ آک لینڈ کے چیف سکریٹری ولیم میکناٹن نے مئی 1838ء میں لکھا کہ مہاراجہ بہت تیزی سے بات کا رخ پلٹ دیتا ہے۔ ایک دم جنگ سے شراب اور تعلیم وتدریس سے شکار پر پہنچ جاتا ہے۔ حالانکہ عمر کے آخری حصہ میں اس کی یہ دماغی خوبیاں قایم نہ رہ سکیں پھر بھی یہ ماننا پڑے گا کہ برٹش تاریخ ہند میں رنجیت سنگھ اہم ترین شخصیتوں میں سے ایک تھا۔

رنجیت سنگھ کی عادت تھی کہ فوجی مہموں کے دوران وہ بذاتِ خود بالتفصیل احکام اور ہدایات جاری کرتا تھا جس سے افسروں کے لیے سوائے تعمیل کے اور کوئی چارہ نہ تھا۔ ۱۴ نومبر 1833ء تک جاری کردہ فوجی پروانہ جات کی ایک کتاب سے پتہ چلتا ہے کہ رنجیت سنگھ کس قدر انتھک کام کرنے والا تھا اور تفصیلات کو سمجھ لینے میں اسے کتنا کمال حاصل تھا۔ اور اپنے جوانوں کے لیے اس کے دل میں کس قدر ہمدردی تھی۔ وہ ایک اچھا جرنل بھی تھا جس نے نوشہرہ کی لڑائی میں ذاتی بہادری اور تنکیرہ میں قابلِ داد ہوشیاری کا مظاہرہ کیا تھا۔ میدانِ جنگ میں بذات

خود جنگ لڑنے کی بہ نسبت فوجی مہموں کو تنظیم دینے میں وہ زیادہ ماہر تھا۔ اس کے ایک فرانسیسی افسر کا کہنا ہے کہ وہ جذبات سے قطعی مبرا تھا۔ جہاں تک سیاست کا تعلق ہے یہ تنقید درست ہے لیکن بطور سپاہی یہ رائے اس پر صادق نہیں آتی کیونکہ جب کبھی کوئی بوڑھا سپاہی اپنے زخم دکھا کر کوئی عرضداشت پیش کرتا تو مہاراجہ کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ اپنے سپاہیوں میں ذاتی عقیدت اور ذاتی وفاداری کا جذبہ ابھار کر ان کو اپنے فرض کی طرف مائل کرتا تھا اس کے باوجود بہت ہی کم ایسے حکمران تھے جو رنجیت سنگھ کی مانند اپنی فوج پر اتنا سخت قابو رکھتے تھے۔

رنجیت سنگھ کوئی عارضی سیاستدان، شاطر جنگ جو یا مہم جو نہ تھا بلکہ حضرت محمدؐ کے بعد حضرت عمرؓ کو اور کارل مارکس کے بعد لینن کو جو درجہ حاصل ہے وہی درجہ گرو گوبند سنگھ کے بعد رنجیت سنگھ کو حاصل ہے۔ گرو گوبند سنگھ نے سکھوں کی انسانی قوتوں کو سب سمتوں سے ہٹا کر ایک خاص مقصد کے حصول پر لگا دیا اور اسی مقصد کے سانچے میں ڈھال کر انہوں نے سکھ قوم کو ٹھوس اور مستحکم بنایا۔ انہوں نے سکھوں کے مذہبی اتحاد اور یگانگت کو دنیاوی فروغ حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا۔ عارضی ضرورت کے جذبہ اور جوشیلے ناپائیدار دھماکے سے متاثر ہو کر گرو گوبند سنگھ نے بنیاد کو مضبوط بنایا اور اس طرح سکھوں کو یکجا کرنے کا ان کا مقصد تو پورا ہو گیا مگر ان کی ترقیاتی قوت مفقود ہو گئی۔ تاریخ کی منطق بھی کوئی چیز ہوا کرتی ہے۔ سکھ کیریکٹر کو اس قدر فوجی موڑ دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ سکھوں کی جنگ آزادی کے بعد اور مذہبی جاگیرداری کے قائم ہوتے ہی ایک ایسی طاقت ور ہستی وجود میں آئی جس نے سارے نظام کو اپنے محور کے گرد گھومنے پر مجبور کر دیا اور اس طرح سکھوں کی بہادری کو چار چاند لگا دیے۔

ذاتیات پر تاریخ لکھنے والوں اور مجموعی طور پر سارے سماج کی تاریخ لکھنے والوں کے درمیان مدت مدید سے اختلاف چلا آ رہا ہے۔ اول الذکر کا کہنا ہے کہ مختلف اداروں اور تصورات کو پروان چڑھانے کی طاقت اجتماعی ہوتی ہے یعنی کوئی اکیلا شخص یہ کام نہیں کر سکتا جب کہ مؤخر الذکر اس کو ایک عبقری طاقت مانتے ہیں۔ دونوں کے دلائل اپنی اپنی جگہ درست ہیں مگر جن باتوں کو انہوں نے ترک کر دیا ہے وہاں دونوں غلطی پر ہیں۔ یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ کسی قوم کی ترقی اور عروج اس قوم کی صلاحیت کی

بہ لنسبت مناسب موقع کی محتاج ہوتی ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا کہ جاٹ جو سکھ فرقے کی ریڑھ کی ہڈی تھے فطری طور پر عموماً جنگ جو تھے۔ گرو گوبند سنگھ کی تعلیم نے سونے پر سہاگہ کا کام دیا اور ان کی بہادری میں نکھار آگیا۔ لہٰذا عظیم صلاحیتوں کے مالک سکھوں کے آخری پیشوا گورو گوبند سنگھ نے اخلاق ہی نہیں بلکہ فوجی قوت کو بھی طاقت سمجھا لیکن ایسا ہندوستانی سردار جو ہندو، سکھ اور مسلمان سبھی فرقوں سے حمایت حاصل کر سکتا تھا اور جو شمال مغربی سرحد کو افغانستان کی مضبوط حکومت سے محفوظ رکھ سکتا تھا۔ جو سرحدی قبائل کو زیر نگیں رکھ کر کامیابی سے ان پر حکومت چلا سکتا تھا، جو ایک ایسی فوج کی تنظیم کر سکتا تھا جس کی جنگی خوبیوں کو دیکھ کر دشمن بھی انگشت بدنداں رہ جاتے تھے اور جس نے کافی حد تک ہندوستانی قوم کو مضبوطی اور طاقت کی دولت سے مالامال کر دیا۔ یقیناً ایسے شخص کا شمار ہندوستان کی عظیم شخصیتوں میں ہونا چاہیے۔

اپنی سلطنت کو افغانوں سے محفوظ رکھنا رنجیت سنگھ کی بڑی بھاری کامیابی تھی۔ ہم جانتے ہیں کہ کسی وقت افغانستان ہندوستان کا حصہ تھا لیکن ہندوستانی ہمیشہ کے لیے اس سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ اگر سکھوں کا عروج نہ ہوتا اور رنجیت سنگھ شمال مغربی سرحد کشمیر اور پنجاب میں اپنی حکومت کی جڑیں مضبوط نہ کرتا تو یقیناً یہ علاقے بھی ہاتھوں سے نکل جاتے۔ یہ بات بھی وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ پنجاب میں منتشر شدہ مسلیں تو جیسے تیسے اپنا قبضہ جمائے رکھتیں مگر پنجاب اور کشمیر بارک زئیوں کے زیر تحت افغانستان کا حصہ بن جاتا۔

رنجیت سنگھ خداداد صلاحیت کی ایک ایسی مثال ہے جو ضمیر سے خالی ہے۔ وہ بھول گیا کہ طاقت، دھوکہ دہی اور شاطرانہ چالوں سے کسی منضبط ادارے کا نظم و نسق تو چلایا جاسکتا ہے مگر پائیداری ممکن نہیں۔ اس نے عوام کے دلوں میں خلوص اور نیک جذبات بھرے جو ان کو اس کی موت کے بعد یکجا رکھ سکتے تھے لیکن شیواجی کی طرح رنجیت سنگھ کے ورثا بھی نااہل تھے لیکن شیواجی کی موت کے بعد مہاراشٹر کی تاریخ رنجیت سنگھ کے بعد کی پنجاب کی تاریخ کے بالکل برعکس ہے۔

رنجیت سنگھ نے ایک سلطنت بنائی لیکن معمار سلطنت کی حیثیت سے اس کی خامیوں

کو واضح طور پر ہم دیکھ سکتے ہیں بہت سی دیگر عظیم ہستیوں کی طرح اس نے بھی اپنی حکومت کو اپنی ہی ذات کے ساتھ محفوظ کر رکھا تھا۔ اس لیے اس کی موت کے بعد ایک ایسا بھاری خلا پیدا ہو گیا جس میں اس کی حکومت کا سارا ڈھانچہ ڈوب گیا۔ جاگیردار بہت کمزور تھے اور فوج اس قدر طاقت ور تھی کہ اس کے کمزور وارث اس پر قابو نہ رکھ سکے۔ ہتھیار بند فوج کی امداد سے ہی روپے خزانہ میں جمع ہوتے تھے اور دور دراز صوبوں پر قبضہ رکھا جاتا تھا۔ سلطنت کے حکمران کے ذاتی اثر و رسوخ ہی پر فوجوں کے ضبط اور عقیدت کا انحصار تھا اور یہی بعد کے حالات سے ثابت بھی ہوا۔ سپاہیوں میں فوجی جذبہ کی شدت اس قدر تھی کہ اسے ٹریڈ یونین سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ فوج اپنے آپ کو بظاہر خالصہ یا کامن ویلتھ کا مجسمہ سمجھتی تھی۔ لیکن فوجی سپاہی جبر اور غلامی کے عادی ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ کسی قانونی یا دیوانی آئین کے محافظ نہیں ہو سکتے۔ شجاعت ان کو گرویدہ کر سکتی ہے اور کوئی بھی ان کو فراخ دلی دکھا کر ان کی حمایت حاصل کر سکتا ہے۔ پہلی قسم کی صفت تو صرف جابر ترین اشخاص میں پائی جاتی ہے جب کہ دوسری صفت کے حامی عوام کو زیر و زبر کر سکتے ہیں اور کوئی بھی جرأت مند مخالف ان دونوں صفات کے پیش نظر فوج کو حاکم وقت کے خلاف آلۂ کار بنا سکتا ہے۔ (گبن)

ایک لحاظ سے رنجیت سنگھ بڑا بدقسمت تھا۔ اس کے چیدہ قابل ترین جرنل محکم چند، دیوان چند، ہری سنگھ نلوہ، رام دیال سب کے سب اس کے جیتے جی ہی آنجہانی ہو گئے۔ صرف ساز باز کرنے والے، سازشی، کمزور اور ابن الوقت جرنل ہی اب اس کی افواج کے سپہ سالار تھے۔ لہٰذا فوج کا بے قابو ہو جانا قدرتی عمل تھا۔ نونہال سنگھ کی موت کے بعد کوئی ایسا تخت کا وارث نہ رہا جس کے حق تخت نشینی کو چیلنج نہ کیا گیا ہو۔ اس لیے پنجاب سازشوں اور انتشار کا گڑھ بن گیا۔

انگریزی حکومت کے ساتھ اس کے تعلقات بھی رنجیت سنگھ کی ناکامی کی ایک بڑی وجہ تھے۔ اپنے دور حکومت کے شروع میں اس نے انگریزی حکومت سے معاہدہ کر لیا لیکن جیسا کہ بسمارک نے بتایا ہے "کسی بھی سیاسی معاہدہ کا مطلب یوں سمجھنا چاہیے کہ ایک سوار ہوتا ہے اور ایک گھوڑا۔" اس اینگلو سکھ معاہدہ کے مطابق انگریزی حکومت تو سوار تھی اور رنجیت سنگھ گھوڑا تھا۔ انگریزوں نے اس کے اقتدار کو مشرق

اور جنوب میں آگے نہ بڑھنے دیا اور اگر ممکن ہوتا تو مغرب میں بھی اس کے حصولِ اقتدار میں حائل ہو جاتے۔ بظاہر اس کی فوجی حکومت اور انگریزی فوج میں مڈبھیڑ ہونا لازمی تھا۔ انگریزی تاریخ ہند میں رنجیت سنگھ میسی لنسا (Massinissa) تھا۔ انگریزوں کے خلاف کارروائی کرنے میں ہمیشہ ہی ہچکچاتا رہا۔ اور یہ بھول گیا کہ جنگ کی طرح سیاست میں بھی وقت ہمیشہ کسی کا ساتھ نہیں دیتا وہ صرف حفاظتی پیش بندیاں ہی کرتا رہا۔ اس کے انتقال کے بعد حالات بے طرح دگرگوں ہو گئے اس کے جیتے جی بھی کم تر قابل آدمیوں کے ہاتھوں میں باگ ڈور ہونے کے باعث لاقانونیت کا دور دورہ ہو گیا پھر بھی اس کی زندگی کے ساتھ جو تھوڑی بہت امیدیں وابستہ تھیں اس کی موت کے ساتھ ان کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ انگریزی حکومت کے ساتھ تعلقات میں رنجیت سنگھ نے سب سے بڑی کمزوری دکھائی۔ اس نے کبھی کوئی جرأت مندانہ اقدام نہ کیا۔ ہمیشہ ہچکچاتا اور ان کے خلاف ہتھیار اٹھانے میں تامل کرتا رہا۔

لیکن اس کے ساتھ ہمیں یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ رنجیت سنگھ کی ناکامی بہت حد تک اس وقت کے حالات پر مبنی تھی۔ رومن شہنشاہیت کے عروج کے بارے میں جو مندرجہ ذیل الفاظ کہے گئے ہیں ہندوستان میں انگریزی حکومت پر بھی بعینہٖ لاگو ہو سکتے ہیں کہ رومن حکومت کے خلاف جو بھی سامنے آیا وہ ٹک نہ سکا۔ یعنی مرکزی طاقت کو جب اقتدار حاصل ہو گیا تو بیرونی مخالف طاقتیں روم سے ٹکرا کر چکنا چور ہو گئیں یا روم کی طاقت کو فروغ دینے کے لیے اس کی اطاعت قبول کر لی۔ رومن شہنشاہیت کے بارے میں یہ بیان ہندوستان میں برٹش سامراج پر بھی منطبق ہوتا ہے۔

ضمیمہ

لاہور میں شاہ شجاع (1813ء سے 1815ء تک)

درّانی شہنشاہ شاہ شجاع ۱۸۰۹ء میں اپنا تخت و تاج کھو بیٹھا۔ اس کے سرداروں اور عوام نے اس کا ساتھ نہیں دیا تھا اس لیے وہ فوجی نقل و حرکت سے باز رہا۔ شاہ شجاع کو قیدی بنا کر کشمیر میں لایا گیا۔ گورنر کشمیر عطا محمد خان نے اس کو اس شرط پر رہا کرنے کی پیش کش کی کہ وہ کوہِ نور اس کے حوالہ کر دے مگر شاہ نے یہ ہیرا دینے سے انکار کر دیا۔ بالآخر رنجیت سنگھ کے سپہ سالار محکم چند نے اسے قید سے آزاد کرایا۔ وہ لاہور لایا گیا۔ اس طرح شاہ شجاع 1813ء سے 1815ء تک لاہور میں مقیم رہا۔ لاہور پہنچنے پر شاہ شجاع کو سدا سنگھ (سلا سنگھ) کی حویلی رہائش کے لیے دی گئی۔ علاوہ ازیں حرم سرا کے لیے ایک اور حویلی مقرر کی گئی لیکن حسب ضرورت ان دونوں حویلیوں کے درمیان سلسلہ آمد و رفت منقطع کیا جا سکتا تھا۔ اس کے لاہور پہنچنے کے دوسرے ہی دن رام سنگھ شاہ شجاع کے پاس آیا اور کوہ نور ہیرا طلب کیا۔ شاہ نے اسے جواب دیا کہ ہیرا اس کے پاس نہیں ہے اور یہ بھی کہا کہ جب سچی دوستی قایم ہو جائے گی تو کوہ نور حوالہ کر دیا جائے گا۔ رام سنگھ دوسرے دن پھر تقاضا کرنے آ گیا اور شاہ نے اسے پھر دہی جواب دیا۔ دونوں میں کچھ حجت بھی ہوئی اس کی وجہ سے شاہ شجاع کے آدمیوں کی آزادانہ نقل و حرکت پر پابندی عائد کر دی گئی۔ کبھی تو رنجیت سنگھ کے آدمی اس کے ملازموں کو باہر جانے کی اجازت نہ دیتے اور کبھی دے دیتے تھے۔ وہ حسب مرضی ان کی خوراک مہیا کرتے یا بند کر دیتے تھے۔ اس طرح ایک مہینہ گزر گیا ہر روز وہ لوگ کوہ نور کا مطالبہ کرتے اور شاہ کا یہی جواب ہوتا کہ جب سچی دوستی قایم ہو جائے گی تو کوہ نور حوالے کر دیا جائے گا۔ رنجیت سنگھ کے معتمد ملازمین نے معلوم کر لیا کہ

شاہ شجاع نقدی کے عوض وہ مشہورِ عالم ہیرا اُن کے حوالے کردے گا۔ لہٰذا کچھ ہی دنوں میں پچاس ہزار روپے کی رقم کئی قسطوں میں اسے دی گئی۔ رنجیت سنگھ کے معتمد ایجنٹوں نے اب پھر کوہِ نور کا مطالبہ کیا تو شاہ نے ان کو بتایا کہ جب اتحاد کی بنیاد پر کوئی معاہدہ طے ہو جائے گا تو وہ کوہِ نور مہاراجہ کے حوالے کردے گا۔ دو دن بعد مہاراجہ بذاتِ خود آیا، اور اپنی دوستی کا واسطہ دیا۔ مقدس گرنتھ صاحب اور تیغ پر قسم کھائی اور بذریعہ دستاویز کوٹ عالیہ، جھنگ، سیال اور تحصیل نور کے اضلاع بطور جاگیر شاہ کو عطا کیے اور اس کے ساتھ یہ پیش کش کی کہ وہ شاہ کو کابل کی تسخیر میں فوجی اور مالی امداد دے گا۔ علاوہ ازیں مہاراجہ نے یقین دلایا کہ کابل کو سر کرنے کے بعد بھی ان کی دوستی قائم رہے گی۔ اس کے بعد دونوں نے اپنی پگڑیاں بدلیں۔ اس وقت شاہ شجاع نے کوہِ نور اس کے حوالہ کر دیا۔ اگلے دن شاہ مہاراجہ سے ملنے گیا۔ سابق بادشاہ کے جذبات کو معتدل رکھنے کے لیے ناچ گانے کا بندوبست کیا گیا۔

لیکن رنجیت سنگھ نے معاہدہ میں کیئے گئے اقرار کو پورا نہیں کیا۔ جب شاہ شجاع کے آدمی عطا کردہ اضلاع میں گئے تو مہاراجہ کے افسروں نے ان کو بندوبست میں ہاتھ نہ لگانے دیا۔ جب حاکم لاہور سے اس بارے میں شکایت کی گئی تو اس نے متعلقہ اضلاع کا نظم و نسق شاہ شجاع کو اگلے سال دینے کا وعدہ کیا۔ اسی اثنا میں شاہ شجاع کے پیش امام ملا شیر محمدؒ نے کابل کے وزیر کو خط لکھا تھا۔ شاہ شجاع نے شیر محمدؒ کو کسی کام سے رنجیت سنگھ کے پاس بھیجا تو مہاراجہ نے اسے قید کر لیا، اس پر ظلم ڈھائے گئے اور بہت برا سلوک کیا گیا۔ شاہ شجاع نے بارہ ہزار روپے دے کر اسے بری کرایا۔ بالآخر یہ معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ شاہ شجاع کے رفیقوں میں سے شیر محمد کے دشمن دو افراد ملا ظفر اور ابوالحسن کی سازش اور کارستانی کا نتیجہ تھا۔ وہ دونوں شاہ شجاع کے خاندان کے افراد کے ہمراہ لاہور آئے تھے اور شاہ شجاع کی دولت ہڑپ کر کے رنجیت سنگھ کے حمایتی بن گئے تھے۔ کوہِ نور کے معاملہ کی جڑ بھی وہی تھے اور شاہ شجاع کی مصیبتوں کے لیے وہی ذمہ دار تھے۔

رنجیت سنگھ نے شاہ شجاع کو اپنے ساتھ روہتاس چلنے کو کہا۔ شاہ شجاع کو اس کے ہمراہ جانا پڑا۔ رنجیت سنگھ اس سابق بادشاہ کو ساتھ لے کر راولپنڈی گیا۔ وہاں

اسے بتایا گیا کہ فتح خان پشاور میں ہے اور رنجیت سنگھ بھی وہاں جائے گا مگر مہاراجہ نے اس مہم کو ترک کرا دیا اور شاہ شجاع کو کھڑک سنگھ اور اپنے ایجنٹ رام سنگھ کی نگرانی میں چھوڑ کر وہ لاہور واپس آ گیا۔ مؤخر الذکر نے اس کا سامان لوٹنے کے لیے اس کے پیچھے چور لگا دیے مگر وہ پکڑے گئے۔ کھڑک سنگھ نے شاہ شجاع کا بستر اور دوسرا ذاتی سامان اس سے طلب کیا جو اسے دینا پڑا۔ جب رام سنگھ اور کھڑک سنگھ لاہور کی طرف روانہ ہوئے تو اس کو بھی ان کے ہمراہ چلنے کے لیے کہا گیا مگر راستہ میں تین چار سو سکھ سواروں نے اسے گھیر لیا اور اس کا سارا سامان، ہیرے جواہرات، ریشمی کپڑے، مرصع تلواریں، چھوٹی چھوٹی توپیں، سونے اور چاندی کے سکے وغیرہ سب لوٹ لیے۔ جب وہ لاہور پہنچا تو لوٹ کے مال میں سے آدھا حصہ اسے لوٹا دیا گیا اور باقی نصف حصہ سے اسے ہاتھ دھونا پڑا۔ اس طرح سکھ حکمران نے سارے عہد پیمان کی خلاف ورزی کی۔ اس کے بعد بھی جاسوس اس کی نگرانی کرتے رہے اور اس کی رہائش گاہ کو محافظوں نے گھیرے رکھا۔

شاہ نے وہاں سے فرار ہونے کا فیصلہ کیا۔ اس کے حرم میں اکثر ہندوستانی خواتین کا آنا جانا تھا۔ ان کا بھیس بدل کر اس کے خاندان کے افراد لدھیانہ پہنچ گئے مگر اس پر کڑی نگرانی تھی۔ رنجیت سنگھ کو جب اس کے خاندان کے فرار کا علم ہوا تو اسے بڑا تعجب ہوا۔ شاہ شجاع پر حفاظتی انتظامات دوگنے کر دیے گئے۔ رات کو آٹھ آدمی اس کی حویلی پر مامور تھے۔ لیکن اس نے چھت میں ایک بڑا سا سوراخ بنا لیا۔ اور یکے بعد دیگر سات کمرے بدلے۔ اپنے ایک وفادار ملازم کو اپنی جگہ لٹا کر وہ سابق شہنشاہ شاہ شجاع اپنے ذاتی نوکروں کے ساتھ فقیر کا بھیس بدل کر بازار پہنچا اور وہاں سے دریا کی طرف روانہ ہوا۔ شہر کے دروازے بند تھے اس لیے یقیناً وہ کسی نالے کے ذریعہ ہی شہر سے باہر پہنچا ہوگا۔ پہلے ہی سے مقررہ ملاح وہاں موجود تھے۔ اس طرح وہ سابق بادشاہ جان بچا کر پہاڑیوں کی طرف بھاگ نکلا۔ راجہ کشتواڑ کی حمایت سے کشمیر کو فتح کرنے کی ناکام کوشش کے بعد شاہ بالآخر لدھیانہ گیا جہاں اس کا خاندان مقیم تھا۔ اس طرح سابق بادشاہ نے اپنے آپ کو انگریزی حفاظت میں دے دیا۔ یہ سب کچھ ستمبر 1816ء میں ہوا۔

اس کے فرار کے بعد رنجیت سنگھ نے اس کی سب رقم ضبط کر لی جو اس نے لاہور کے ساہوکاروں کے پاس جمع کر رکھی تھی۔ طیش میں آ کر شاہ شجاع نے اپنی سوانح عمری میں لکھا کہ "سکھ ایسے لوگ ہیں جن کی بنیاد ہی بدی پر ہے۔"

سابق بادشاہ کا اپنا بیان ہے کہ کسی طرح اس نے سکھوں کی حفاظت میں اپنی زندگی کے چند ماہ گذارے تھے (تاریخ شاہ شجاع صفحات 56 سے 69 تک، ہندوستانی تاریخ قدیم باب بارہ وسترہ (XII - XVII) Indian Antiquary) میں بھی تاریخ سلطانی کی تفصیل شاہ کے بیان سے چنداں مختلف نہیں ہے۔ ہمعصر خبر نامہ سے بھی اس بیان کی کافی تائید ہوتی ہے۔ ان خطوط میں سے ایک خط مورخہ ۷ مارچ 1814ء کے مطابق رام سنگھ اندر آیا اور بتایا کہ وہ شاہ شجاع الملک کے ڈیرہ پر گیا تھا اور ہیرے جواہرات طلب کیے تھے۔ پانچ نوکرانیوں کو محل کے اندر حرم میں بھیجا گیا اور اندرونی حصہ میں انہیں ہیرے، فیروزے، موتی، چھوٹے صندوق نما غالیچے ملے۔ ان پر قبضہ کر لیا گیا۔ حضرت شاہ شجاع الملک روتے چلاتے رہے لیکن خدا کی مشیت کے آگے کچھ نہ چلی۔ البتہ خاص طور پر دو باتوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ 8 جون 1813 کے خط میں ہم پڑھتے ہیں کہ جھنگ سیالاں سے غفور خان آیا، وہ آداب بجالایا اور ایک اشرفی دی پھر عرض کی کہ وہ ایک طویل عرصہ سے جھنگ میں ملازم تھا مگر جب سے جھنگ پر شاہ شجاع الملک کی حکومت ہوئی ہے اسے برخواست کر دیا گیا ہے اور اب وہ نہیں جانتا کہ اس سخی سرکار کے دروازے چھوڑ کر کہاں جائے۔

اس خط سے ظاہر ہے کہ جو اضلاع شاہ شجاع کو دینے کا وعدہ کیا گیا تھا وہ یقیناً اس کے سپرد کر دیے گئے ہوں گے اور ان پر شاہ شجاع کا بندوبست رہا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ بعد میں کچھ نامعلوم وجوہ کی بنا پر اضلاع متعلقہ کا بندوبست واپس لے لیا ہو۔ شاہ شجاع کا یہ کہنا ہے کہ شیر محمد کو اس الزام کے لیے غلط طور پر ملزم گردانا گیا تھا کہ اس نے عظیم خان کو خط لکھا لیکن ہمیں 23 جون کے خط سے پتہ چلتا ہے کہ کوتوالی کا اہلکار پیر بخش اندر آیا۔ اور بیان کیا کہ حضرت شاہ شجاع الملک کے دو ہمراہی ملا حسن اور قاضی شیر محمد خان نے اپنے آپ اپنی مہریں لگا کر کچھ خطوط سردار فتح خان وزیر کو ارسال کیے ہیں اور یہ بھی بیان کیا کہ نامہ بر کو قید کر لیا گیا ہے اور متعلقہ خطوط سرکار

معلیٰ کی خدمت میں پیش ہیں۔ ان خطوط میں تحریر تھا کہ "سرکارِ معلیٰ (رنجیت سنگھ) اس وقت لاہور میں بالکل اکیلا ہے اور کوئی فوج نہیں ہے۔ ان حالات میں لاہور پر قبضہ کرنا مشکل نہ ہوگا۔"

مشہور ہے کہ شاہ شجاع کو جب عطا محمد خان نے قید کر لیا تو کوہ نور کو حاصل کرنے کی غرض سے اس کی آنکھوں کے آگے اکثر نیزہ تان کر فوری موت کی دھمکی دی جاتی تھی۔ شاہ شجاع کی اہلیہ وفا بیگم نے ظفر نامہ رنجیت سنگھ ۱۸۱۴ء کے مطابق رنجیت سنگھ کو عرض داشت ارسال کی تھی کہ افغان وزیر کشمیر کو تسخیر کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ان حالات میں اس کے شوہر کو کابل لے جایا جائے گا اور اس کی آنکھیں نکال دی جائیں گی لہٰذا رنجیت سنگھ سے درخواست کی گئی کہ وہ شاہ شجاع کو بچا لے۔ رنجیت سنگھ کو یہ بھی بتایا گیا کہ کوہ نور کشمیر میں شاہ شجاع کے پاس ہے۔ اگر اسے وہ کابل لے گئے تو یہ نایاب ہیرہ بھی اس کے ساتھ کابل پہنچ جائے گا۔ اس طرح یہ بالکل غیر ممکن نہیں کہ وفا بیگم نے اپنے شوہر کی زندگی افغانوں کے ہاتھوں بچانے کے عوض مشہورِ عالم ہیرا کوہ نور مہاراجہ کو دینے کا وعدہ کیا ہو۔ اندریں حالات اپنی خدمات کے عوض رنجیت سنگھ کوہ نور طلب کرنے میں حق بجانب تھا۔ بعد میں اس نے لدھیانہ میں انگریزی ایجنٹ ویڈ کو بتایا کہ شجاع الملک کی جان اس لیے بچائی گئی تھی کہ اس نے اس کے عوض کوہ نور دینے کا وعدہ کیا تھا لیکن شاہ شجاع محمد شاہ تیموری کی طرح سادہ لوح نہ تھا کہ صرف عیارانہ پگڑی بدلنے کے بدلے میں یہ بیش بہا ہیرا وہ سکھ حکمرانوں کے حوالے کر دیتا۔ کوہ نور حاصل کرنے کے لیے رنجیت سنگھ نے جو ذرائع استعمال کئے ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا طرزِ عمل جبر سے زیادہ غیر دیانت دارانہ تھا۔ شاہ کی ضد پر غلبہ پانے کے لیے ضرورت سے زیادہ سختی کا استعمال نہیں کیا گیا۔ مگر حصولِ مقصد کے لیے کسی ضروری کارروائی سے بھی احتراز نہیں کیا گیا (آسبورن) "صرف اس سایہ کے احترام میں جو کبھی عظیم تھا، گرفت میں آئے ہوئے اس مشہورِ عالم ہیرے کو حاصل کرنے کی کوشش نہ کرتا۔ شاید رنجیت سنگھ سے اس ایثار اور قربانی کی توقع نہیں کی جا سکتی کیوں کہ دورِ گذشتہ کا احترام اس کی کمزوری نہ تھی" اس سلسلہ میں کوہ نور کی قیمت کے تاریخی اندازہ کا ذکر کرنا بھی مناسب ہوگا۔ ایک جوہری کے اندازہ کے مطابق اس کی قیمت ساری دنیا

کے ایک دن کے آدھے خرچ کے برابر تھی۔ 1814ء کے بعد جن لوگوں نے سکھ دربار میں اسے دیکھا ان کا کہنا ہے کہ اس کی شکل ایک چھوٹے مرغی کے انڈے جیسی تھی اور اس کے دونوں طرف دوسرے جواہرات جڑ کر بازوبند بنا دیا گیا تھا۔

شاہ ایوب جس نے بعد میں لاہور میں پناہ لی تھی اور جسے ایک ہزار روپے ماہوار کا الاؤنس اور ایک جاگیر عطا کی گئی تھی۔ اس کی طرح سابق بادشاہ شاہ شجاع بے سہارا اور لاچار نہ تھا۔ رنجیت سنگھ کی اس قدر لوٹ کھسوٹ کے باوجود بھی اس بادشاہ کے پاس اس قدر جواہرات تھے جن کو بیچ کر لدھیانہ میں اسے اس قدر سرمایہ ملا کہ اس سے اس نے بھاری مہموں کا خرچہ چلایا۔

کوہ نور حاصل کر لینے کے بعد شاہ شجاع کے ساتھ جو حریفانہ سلوک کیا گیا اس کے لئے شاہ شجاع اور اس کے ساتھیوں کو بھی ذمہ دار ٹھہرایا جا سکتا ہے جو مہاراجہ کے خلاف سازباز کر رہے تھے لیکن اس سے رنجیت سنگھ کے درباری بھی رسوا ہو گئے۔ ۱۰ ستمبر 1813ء کے ایک خط میں ہم دیکھتے ہیں کہ مہاراجہ نے نہال سنگھ، مٹھ سنگھ بھرانیہ اور بھائی گوربخش سنگھ کو فرداً فرداً رازدارانہ انداز میں بتایا کہ شجاع الملک کے پاس ایک ایسی زین ہے کہ جس میں 28 لاکھ کی قیمت کے جواہرات جڑے ہوئے ہیں اور اس کا پلنگ فیروزہ کا ہے۔ جس کے چاروں پایوں پر ایک ایک بڑا ہیرا لگا ہوا ہے اس نے اپنے لیے یہ سب کچھ شاہ سے طلب کرنے کی تجویز رکھی۔ انہوں نے مہاراجہ سے کہا کہ "سرکارِ معلیٰ جو چاہے کر سکتی ہے۔ لیکن شاہ شجاع سے کوہ نور زبردستی حاصل کرنے کے باعث اس کی پہلے ہی کافی بدنامی ہو چکی ہے اور مزید کچھ اور حاصل کرنے کے لیے اس کے ساتھ زبردستی اور سختی کرنی پڑے گی کیونکہ یہ چیزیں بغیر سختی، ناخوشگواری اور بے عزتی کیے بغیر شاہ ہرگز دینے والا نہیں ہے" انہوں نے تجویز رکھی کہ سرکارِ معلیٰ کو برعکس اس کے شاہ کے ساتھ مہربانی سے پیش آنا چاہیے اور اس کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔ شاہ شجاع کو نظر بند قیدی بنانے اور اپنی مطلب براری کے لیے اس کے نام کا استعمال کرنے کی چال کو سمجھنا مشکل نہیں۔ اس سے رنجیت سنگھ کے پنجوں سے بچ کر بھاگ نکلنے کی شاہ شجاع کی فکرمندی کی بھی تشریح ہوتی ہے۔ رنجیت سنگھ اس کے جواہرات اور دیگر قیمتی اشیاء کو حاصل کرنے کا متمنی تھا۔ وہ

شاہ شجاع کو آزادانہ چڑھائی کرنے کے ذرائع سے محروم تو کرنا چاہتا تھا لیکن واقعی ضرورت کے موقع پر وہ اسے زرِ نقد بھی مہیا کرنا چاہتا تھا۔ ۱۹ نومبر 1813ء کو اس نے شاہ شجاع کو ایک ہزار روپے اخراجات کے لیے بھیجے جو شاہ نے وصول کیے۔ 27 اکتوبر 1814ء کو اسے دو ہزار روپے کی رقم دی گئی"۔ رنجیت سنگھ کے دربار کے واقعات" نامی کتاب میں ایسے اور بھی کئی اندراج ہیں۔ بہرحال سابق بادشاہ اپنے روزمرہ کے اخراجات کے لیے حاکم لاہور پر انحصار رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی جاگیر کو واپس لے کر اس کے جواہرات پر غاصبانہ قبضہ کرنے اور شاہ شجاع کی باقاعدہ پنشن مقرر نہ کرنے کے باعث شاہ نے یہ محسوس کیا کہ ان حالات میں وہاں رہنا اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہے اس لیے وہ فرار ہونا چاہتا تھا لیکن یہ امر موجبِ دلچسپی ہے کہ بار بار لوٹے جانے کے باوجود فتح خان سے برسرپیکار ہونے کے لیے شاہ شجاع جب تک لاہور میں رہا رنجیت سنگھ کی امداد حاصل کرنے کی کوشش میں لگا رہا۔ رنجیت سنگھ کی پالیسی تھی کہ اس معاملہ میں زیادہ سے زیادہ تاخیر کی جائے۔ سعدی خان کوتوال کو شاہ شجاع کی نگرانی کے لیے تعینات کیا گیا۔ جب شاہ نے احتجاج کیا تو لاہور کے حکمران نے جواب دیا کہ وہ قیدی نہیں ہے بلکہ یہ لوگ بطور گارڈ آف آنر متعین کئے گئے ہیں۔ (ظفر نامہ 1815ء)

لاہور میں اتنی بدسلوکی کے باوجود سیاسی حالات کے پیشِ نظر اور ذاتی نقصان کو نظر انداز کر کے شاہ نے لدھیانہ سے بھی رنجیت سنگھ سے مدد مانگی اور کبھی کبھی مہاراجہ نے اس کی اپیلوں کا خاطر خواہ جواب بھی دیا۔ 1830ء میں شاہ شجاع نے رنجیت سنگھ کو تحائف دیے۔ 1831ء میں اس نے رنجیت سنگھ کو لکھا کہ جو کچھ بھی اس کے ساتھ ہوا اس کی قسمت کا پھیر تھا، آپ کی جانب سے نہ تھا۔ خالصہ دربار ریکارڈ جلد دوم صفحہ 192 پر مزید خرچ کے زیرِ عنوان ہم دیکھتے ہیں کہ رنجیت سنگھ نے سابق بادشاہ کو ۱۸۹۰ء اور ۱۸۹۱ء کے دوران قندھار کی مہم کے لیے چودہ ہزار پانچ سو روپے دیے لیکن عمدۃ التواریخ میں یہ رقم ایک لاکھ پچیس ہزار روپے دکھائی گئی ہے۔ اگر شاہ اپنی ذاتی اذیتوں کو اتنی جلدی بھول کر رنجیت سنگھ سے امداد کا طلب گار ہوا اور بعد میں اسے اپنا ہمدم بنایا تو اس مصیبت زدہ پناہ گزین بادشاہ کے ساتھ رنجیت

سنگھ کے ذلّت آمیز سلوک کے باوجود بھی مورخ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اس کے ساتھ کی گئی بدسلوکی کا بیان کرے۔